



میں ایک جاسوس تھا

طارق اسماعیل ساگر

میں ایک جاسوس تھا

طارق اسماعیل ساگر

7th Sky
PUBLISCTIONS

Al-Hamd Market, Ghazani Street,
40-Urdu Bazar Lahore. Ph: 042-8405100

جملہ حقوق بحق ناشر دائمی محفوظ ہیں

اس کہانی کے تمام کردار، مقامات، واقعات فرضی اور مصنف کی ذہنی اختراع ہیں
کوئی بھی مسابقت محض اتفاقیہ ہوگی جس کے لیے مصنف، ادارہ بری الذمہ ہیں۔

| | | |
|----------|-------|--------------------------|
| ہم کتاب | | میں ایک جاسوس تھا |
| مصنف | | طارق اسٹیل سارگر |
| ہائر | | مسعود ملتی - یاسر |
| مطبع | | زابدہ نوید پرنٹرز، لاہور |
| سہ اشاعت | | ستمبر 2005ء |

یہی صورت میں استمال کی
اجازت ضروری ہے۔
چارہ جری کا حق محفوظ ہے۔

☆.....لے کے پتے.....☆

سیونٹھ سکاٹی پبلی کیشنز

غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور، موبائل: 0300-4125230

مشتاق بک کارنر

خزینہ رطل و ادب

الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور فون: 7314169 | الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور فون: 7230350

اشرف بک ایجنسی

کتاب گھر

سکینی چوک راولپنڈی فون: 5531610

سکینی چوک راولپنڈی فون: 5552929

رحمن بک ہاؤس

ویلم بک پورٹ

اردو بازار، کراچی فون: 7766751

اردو بازار، کراچی فون: 2633151

انتساب

ملو وطن
کے ان گناہ سرفروشن کی نذر
جنہوں نے اپنا آج ہمارے
کل پر قربان کیا۔

عنوانات

| | |
|-----|-------------------|
| | پیش لفظ |
| 13 | ان دیکھی رہیں |
| 45 | پونم |
| 59 | دھوپ لور چھاؤں |
| 87 | سوامی جی |
| 113 | دیشنویا ترا |
| 129 | آشرم کے اسرار |
| 147 | تکوار کی دھار |
| 171 | ٹھنڈی چھلیا |
| 187 | بہوئی |
| 225 | سجاتا |
| 271 | ٹوٹی کہل کند |
| 313 | ساز شکستہ کی آواز |

آن دیکھی راہیں

سرشام ہی ہم سرحدی علاقے میں پہنچ گئے تھے اور اب ایک جیب گھوں کے کپے کپے
نیزے میزے راستوں پر اچھلتی کودتی مجھے اس سرحدی چوکی کی طرف لے جا رہی تھی جہاں
سے میں نے سرحد عبور کرنی تھی۔

جاسوسی تربیت کے سخت ترین مراحل سے گزرنے کے بعد عملی میدان میں یہ میرا پہلا قدم
تھا۔

جب ہم لوگ اسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر جیب میں سوار ہو رہے تھے تو میرے انسپریکٹر
میرے ساتھ ہی موجود تھے۔ زمین میں سارے راستے انہوں نے بولے خوبصورت طریقے کے
ساتھ مجھے ٹریننگ میں "سرحد پار کرنے سے متعلق" بتائے ہوئے تمام اصول دہرا دیئے تھے لیکن
جیسے ہی ہم لوگ اسٹیشن پر پہنچ کر پہلے سے منتظر جیب میں سوار ہوئے وہ خاموش ہو گئے۔ مجھے
بھی تو اپنی ٹریننگ کے مطابق اب بالکل خاموش رہنا تھا کیونکہ "حفاظتی اقدار" میں پہلا اقدام
یہی تھا کہ "جہاں تک ممکن ہو خود کو چھپائے رکھو۔" مجھے انسپریکٹر کے وہ الفاظ اچھی طرح یاد
تھے: "عملی میدان میں بسا اوقات حالات تربیت میں بتلائی گئی باتوں سے بالکل مختلف پیش آتے
ہیں اور وہی اصل میں ایک جاسوس کے امتحان کا بہترین وقت ہوتا ہے۔"

جیب ہمیں لے کر سیدھی کپہی ہینڈ کوارٹر میں پہنچی تھی جو سرحد سے قریباً ڈھائی تین میل
کے فاصلے پر بنا ہوا تھا۔ اسٹیشن سے یہاں تک کا فاصلہ ہم نے آدھے گھنٹے میں طے کیا تھا لیکن
اس آدھے گھنٹے میں ہی سرحدی علاقے میں فوج کی نقل و حرکت نے مجھے معاملے کی سنگین
نومیت کا احساس دلایا تھا۔ اپنے جیلوں کو حالت جنگ میں دیکھ کر میرے جذبے کو گویا ہمیز لگ
گئی تھی۔ سورج ابھی مکمل غروب نہیں ہوا تھا جب ہم ایک مرتبہ پھر سرحدی چوکی کی طرف سفر
کر رہے تھے لیکن اس مرتبہ ہمارے ساتھ ایک لور ہستی بھی شامل ہو گئی تھی۔

"اس سے طویہ ہے ڈلا۔۔۔ تمہارا گھینڈ۔" میرے انسپریکٹر نے کپہی ہینڈ کوارٹر میں
ایک چمڑے سے جسم کے نوجوان سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ جواب میں میں نے کچھ

نہ کہا اور دُٹے کو امید بھی یہی تھی کیونکہ وہ اس "پزلز" میں کئی پرانا تھا اور جانتا تھا کہ اپنے "ساحتی" کے متعلق کوئی بھی اطلاع جتنا کاٹنا "جرم" ہے اور خود اس کا ساحتی اپنے حلق میں جی نہیں بولے گا۔ میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ میں نے اس سے ہاتھ بھی نہ ملایا تھا۔ مہلادہ میری انگلیاں ہی نہ گن لے۔ اصل میں انسٹرکٹرز صاحب کے سامنے میں کم از کم ایک ہونہار شاگرد کا کردار ادا کرنا چاہتا تھا۔۔۔ ایسا ہونہار اور لائق شاگرد جو اپنے استاد کی معمولی معمولی باتوں کا احترام کرتا ہو۔ "اپنے گھیز پر شک" کہہ سکتا ہے وہ ذلیل لیکن ہو۔ "ہر جاسوسی کی تربیت حاصل کرنے والے کو سب سے پہلے گھیز سے متعلق یہی بات کہی جاتی تھی۔

○○○

دُلا ہمارے آگے آگے جا رہا تھا۔ میں اور انسٹرکٹرز صاحب پیچھے پیچھے تھے۔ میں نے بھارتی رہائشیوں والے کپڑے پہن رکھے تھے اور اپنا طیلہ پہنل "سکوں" جیسا بنا رکھا تھا۔ میرے انسٹرکٹرز کے اس وقت کیا جذبات تھے جب وہ اپنے شاگرد کو پہلے مشن پر روانہ کر رہا تھا؟ اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا تھا۔ پوسٹ تک پیول چلتے ہوئے وہ مجھے اس علاقے کی تفصیلات بتاتے رہے۔ جہاں سے میں نے سرحد عبور کرنی تھی۔ سرحد عبور کرنے کے بعد آنے والے پہلے گھاٹ کا نام "بکی سڑک" کہل ہے؟ "من کی سرحدی چوکی کس طرف ہے؟" "موہا" B.S.F. (بھارتی سیکورٹی فورس) والے کس علاقے پر زیادہ نظر رکھتے ہیں؟ محفوظ راستہ راستے میں آنے والے دُلی بلے، "من کا محل وقوع" آبادی سے متعلق معلومات، گردوارے اور مندر کی نشاندہی، قلعے کا آنا چا، "سکوں کے راستے اور دیگر باتیں۔ میرے ذہن میں علاقے سے متعلق تمام جزئیات نقش ہوتی جا رہی تھیں۔ پوسٹ سے کچھ فاصلے پر ہم رک گئے "غلا" "من لوگوں کو بھاری آمد سے پہلے ہی باختر کر دیا گیا تھا اور اب ایک اسپیکر دو سپاہیوں کے ساتھ میرا منتظر تھا۔

اس سرحدی پوسٹ پر ایک کچے مٹی سے بنے ہوئے کمرے میں لائین کی ہلکی ہلکی روشنی میں ایک مرتبہ بھر میں اور میرے انسٹرکٹرز صاحب ایک بڑے سارے ٹیلے سے رنگ کے تختے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اپنا مارگٹ سرخ پٹیل سے ایک گول دائرے کی شکل میں دکھائی دے رہا تھا۔ جب ایک حوالدار چائے لے کر وہاں آیا تو ہم خوش سمیٹ بیٹھے تھے۔ کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ چائے کے ساتھ ہی دُلا بھی اندر آ گیا تھا۔ ہم تینوں نے اکٹھے ہی چائے پی لی تھی۔ اس لمحہ میں پوسٹ پر مغرب کی لڑھکی اور ہم وہیں ایک خالی قطعہ زمین پر بیٹھ کر ہوائی سہر میں نماز پڑھنے لگے۔ چونکہ رنجیز کے لئے یہ امر باعث سہولت ہوتا ہے کہ وہ اپنی زیر

نگرانی ایک پاکستانی جہاد کو سرحد پار کر رہے ہیں، اس لئے شاید مقامی پوسٹ کے حوالدار صاحب جو ان کے نام تھے، نے خاص طور پر ان پاک کی وہ آیات تلاوت کیں جن میں اللہ کے نیک بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ "وہ ہر وقت اللہ کے دشمنوں سے لڑنے کے لئے کمر بستہ رہتے ہیں۔" آیات کی تلاوت اور ان کے جذباتی اور رقت انگیز لہجے کا انداز چار حلق قیامت ڈھا گیا اور جب میں نے سلام پھیرا تو میرے ارد گرد تمام مقتدیوں کی آنکھوں میں بھی آنسو جھللا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہم رخصت ہو رہے تھے۔

پوسٹ ہی پر میرے انسٹرکٹرز صاحب مجھ سے بتائیں کہ "میں نے آگے بڑھنے سے باز رہا۔ اللہ کا فضلہ" انہوں نے مجھ سے صرف یہی کچھ کہا۔ جب وہ دُٹے سے ملے مل رہے تھے، ان کا صرف ایک فقرہ مجھے سنائی دیا۔ "دُٹے میرے شیرے کا خیال رکھنا، خدا حافظ۔" "میری طرف دوبارہ دیکھو، وہاں کی لڑائی کے لئے گھوم گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ میری طرف نہیں دیکھیں گے۔ ہر مل ہم دونوں میں ایک جذباتی وابستگی ہو چکی تھی۔ ہم نے چھ مہینے ایک دوسرے کے ساتھ بہترین دوستوں کی طرح گزارے تھے۔ وہ میرے استاد سے زیادہ میرے والد اور اس سے زیادہ دوست تھے۔

○○○

"پکٹ" سے باہر آتے ہوئے ہمیں پکٹ پر موجود جوانوں نے "گن سیلوٹ" کے ساتھ اعلان کیا۔ پھر ہر ایک سب تو وہیں رہ گئے۔ دُلا اور دو مسلح جوان آگے آگے چل دیے اور میں ان کے پیچھے پیچھے میرے کندھے سے ایک کپڑے کا تھیلہ لٹکا ہوا تھا۔ اب میں محل بھارتی رہائشی نظر آ رہا تھا۔۔۔

"سرحدی کثیر" پر ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر دونوں محافظ رک گئے۔ انہوں نے میری سے پوزیشن لے لی تھی، اس وقت وہ مکمل "رانجیز" نظر آ رہے تھے۔ مسجد "ہنری وچینڈ" تیار ہے تیار، دونوں نے ایک مرتبہ پھر مجھے "گن سیلوٹ" دیا اور وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور دُٹے کی معیت میں سرزمین پاک سے سرزمین ہندو پر پہلا قدم رکھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے پانچ گز کے فاصلے پر چل رہے تھے۔ میرے منہ میں چو گم تھی جسے میں مسلسل چار رہا تھا۔ چاروں طرف سنا تھا یا خدا کی ذات۔ اس وقت تک تو میں وہی کچھ کرنا آیا تھا جو ہمیں سکھایا جاتا ہے لیکن اب وقت اس سے بڑھ کر کچھ کرنے کا آگیا تھا۔ مجھے

اپنے متعلق بیٹھ سے یہ خوشی حسی تھی کہ میں پھر کے اصاب رکھتا ہوں لیکن بھارتی علاقے میں پہلا قدم رکھتے ہی میرے جسم میں سستی کی ایک جزیرہ دوڑ گئی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ پہلی مرتبہ سرحد پار کرتے ہوئے ایک جاسوس کو اس کیفیت سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن وہ وقتی چیز تھی۔ ایسے ہی تھا جیسے کوئی لمحہ آئے اور گزر جائے۔ اب میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں آیت الکرسی اور آیت کریمہ کا ورد شروع کر دیا تھا۔ کسی انجینی ملکت نے میرے جسم میں جلیں دوڑا دی تھیں۔ مجھے اپنے عقیم مشن کے سامنے خوف 'ڈر' گھبراہٹ سب بچ نظر آنے لگے تھے۔ ایک جذبہ تھا جس نے بت سارے جذبات کا گھونٹ کر اپنی حقیقت منوالی تھی۔۔۔ میں مسلمان ہوں اور ہندو کو پتہ کرنے جا رہا ہوں۔ اس ہندو کو جو میری ملاں 'بسنوں' میرے ملک 'میری قوم کو لوٹ لینا چاہتا تھا' مار ڈالنا چاہتا تھا۔ میں ہتھ کی جگہ لڑنے جا رہا تھا۔ ایک گھنیا دشمن کے خلاف۔

○○○

دلا ہوا امین کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا میرے آگے چل رہا تھا۔ دو تین منٹ تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ پلٹ کر دیکھ لیتا کیونکہ اس کا لڑکپن اور جوانی انہی راستوں کو پھلانگتے گزری تھی لیکن میرا سر مل یہ پہلا تجربہ تھا اور مجھے ہر قدم پھونک پھونک کر احتیاط کے ساتھ اٹھانا پڑتا۔۔۔۔۔ رات کے سنانے میں بیروں کی ہلکی سی چپ بھی فضا میں دھمکے کی طرح گونجتی ہے اور پھر سیسے کی ایک گولی۔۔۔۔۔ اور پھٹی۔ کیونکہ ایسے حالات جو ان دونوں سرحدوں کے دونوں طرف رونما ہو رہے تھے 'ان حالات میں کوئی بھی سرحدی علاقہ 'ہاٹ' پھارنے کی صلت دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھ میں اور دُلتے میں فاصلہ بڑھ جاتا تھا۔ قریباً ایک گھنٹہ تک ہم دونوں اسی طرح خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر وہ ایک کھیت کے قریب رک گیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے مجھے وہیں بیٹھنے کو کہا اور خود سن گن لینے آگے چلا گیا۔ اب ہم کسی حد تک محفوظ علاقے میں آ گئے تھے لیکن سب سے خطرناک مرحلہ اب آنے والا تھا۔ ہمیں ایک نہر کو عبور کرنا تھا جس پر اکثر انڈین سیکورٹی والے 'نارک' لگیا کرتے تھے۔ میں کھیت کے کنارے پر کلو کی فصل میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ شاید دُلتا پہلے یہ امین کرنے گیا تھا کہ جمو پڑی غلطی ہے یا اس میں کوئی موجود ہے۔ کوئی تین چار منٹ کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ ہم دونوں قریب ہی ایک گھاس پھوس کی بنی ہوئی جمو پڑی میں آ گئے تھے۔ ایسی جمو پڑیاں عموماً 'سکن' اپنے کھیتوں کے قریب بنالیا کرتے ہیں۔

جمو پڑی میں بیٹھ کر ہم نے وہیں موجود ایک گھرے میں سے پانی پیا۔ میں نیچے پاؤں چلتے

ہوئے آیا تھا' جبکہ دُلتے نے فلیٹ بوٹ پہن رکھے تھے۔ اسے ریو کے جوتوں کے ساتھ چلنے کا خلاصہ تجربہ تھا لیکن میں نے دو تین فرلانگ چلنے کے بعد ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اونچے اونچے اور ہموار راستوں پر جوتوں کے ساتھ اچھی طرح نہیں چل سکتا اس علاقے میں ایک خاص قسم کے چھوٹے چھوٹے کانٹوں والی جھاڑیاں جابجا کھیتوں میں اور خاص طور سے کھیتوں کے کناروں پر لگی ہوئی ہیں۔ چونکہ مجھے ابھی ان کا خاص اندازہ نہیں تھا اس لئے میرے پاؤں میں بے شمار کانٹے چبھ گئے تھے اور اب ہلکی ہلکی جگہیں بھی ہونے لگی تھیں۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے پاؤں دھوئے تو خلاصا سکون محسوس ہونے لگا۔

"بیس ٹھہرو" میں ذرا جائزہ لے آؤں۔" دُلتے نے سرگوشی میں کہا اور مجھے کچھ ہدایتیں دے کر باہر چلا گیا۔ اس کے باہر جاتے ہی میں اپنا لائحہ عمل طے کرنے لگا۔ ہم لوگ راجستھان کے ایک علاقے گنگا نگر سے سرحد عبور کر رہے تھے۔ گنگا نگر پہلا سرحدی شہر تھا جو میرے مارگٹ کے راستے میں آتا تھا۔ دُلتے نے مجھے یہاں چھوڑ کر واپس چلے آنا تھا جب کہ بعد میں اپنے مارگٹ تک مجھے اکیلے ہی سفر کرنا تھا۔ ایک مرتبہ پھر دل ہی دل میں میں نے اپنے مارگٹ کے متعلق اطلاعات اور سفر کے متعلق ضروری احتیاطی دہرائیں اور وہیں جمو پڑی میں کپڑا بچھا کر خشو و خضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور کھمبائی کی دعا مانگی۔ میں اب بالکل پر سکون تھا۔ مسکین اور آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار۔ چند ہی منٹ بعد دُلتا آگیا۔

"چلو۔۔۔۔۔!" اس نے تیز سرگوشی کی اور ہم چل دیئے۔ میں نے اپنے پاس موجود انڈین کرنسی نوٹ پلاٹنک کی تھیلیوں میں بیک کر کے اپنے کپڑوں میں مختلف جگہ چھپا کر رکھے تھے۔ چلتے چلتے ہم نہر کے کنارے پہنچے۔ وہاں اپنے کپڑے اتارے اور انہیں پلاٹنک کے تھیلوں میں اچھی طرح بیک کر کے ایک ڈوری کے ساتھ اپنے اپنے جسم سے باندھ لیا۔ اب ہم دونوں صرف انڈونیز اور بنیان کے ساتھ نہر عبور کر رہے تھے۔

نہر عبور کرنا پہلی مرحلہ عبور کرنے سے مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ رات کو پانی میں پیدا ہونے والی معمولی سی آواز بھی دھماکہ پیدا کر دیتی ہے اور دوسرے ہی لمحے سیسے کی گولی ہمارا عقدہ بن جاتی، کیونکہ نہر کے مختلف حصوں میں عموماً 'انڈین سیکورٹی' والے شکار کے خنجر رہتے ہیں۔ ہم دونوں نے قریباً "مرہ تیراکی" یعنی سیدھے لیٹ کر تیرتے ہوئے نہر عبور کی تھی۔ اب ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی، یہ نہر کناروں سے کچی تھی اور کنارے بھی خامسے لوٹے چھتے تھے۔ جہاں کہیں کنارہ بچا ہوا تھا وہاں سے نہر میں داخلے کا راستہ بند ہوتا وہاں میاں جل لگائے بیٹھا تھا۔

قریباً چار مرتبہ ہم نے مختلف جگہ سے نہر کو عبور کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ خدا

خدا کر کے ایک جگہ سر کے کنارے بڑی بڑی جنگلی گھاس کے سرکڑے جھکے دکھائی دیے۔ مجھ سے پہلے دُٹنے نے انہیں پکڑ کر جسم کو زور سے لوہے کی طرف جھٹکادیا۔ میں اس کی جسنی بھرتی پر حیران رہ گیا۔ اس کے بدن میں تو بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ ایک سی جھلکے میں وہ لوہے کی پٹی چکا تھا۔

وہاں جا کر اس نے اپنا تھیلا کھولا اور اپنی پگڑی کو نیچے نکالیا۔ جس کی مدد سے میں بھی باہر آ گیا۔ باہر آ کر مجھے علم ہوا کہ اس نے کیوں پہل کی تھی۔ تیز اور ٹوکیل گھاس نے اس کے ہاتھ لوٹ لیں کر دیئے تھے۔ اسے علم تھا کہ میں نے ابھی تک کے لئے بہت سے کام کرنا ہے۔ شاید اسی لئے اس نے مجھے تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ اس کی عظمت کا احساس ہوا۔ پگڑی کا پلہ پانی میں بھگو کر میں نے اس کے ہاتھ ابھی طرح صاف کئے اور ایک ہاتھ پر کس کر پٹی باندھ دی۔ جس نے خون کا بہو قلم کر دیا۔ دو پٹی دُٹنے نے تھوڑی دیر کے بعد ہی اُتار دی۔

”خود کو نہ کسی کا میری طرف جتو جو ہونا ٹھیک نہیں۔“ اس نے میری ہات کا مختصر سا جواب دیا۔

ہم کھیتوں کے پھول چلے جا رہے تھے۔ فصلیں اپنے جون پر تھیں۔ کسی کسی سے بڑا روڑا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ یہ وہ جگہیں تھیں جہاں سے انہیں کھائے گزرتے تھے اور اپنی لائی ہوئی چٹی اور برہادی کے نشاں پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔

○○○

کھیتوں کے پھول چلے چلے ہمارے ہم اس سڑک کے آخری کونے تک جا پہنچے جہاں سے ہمیں گنگا نگر شہر میں داخل ہونا تھا۔ شہر میں داخلے کے لئے بھی ایک بڑی سرنگی ہوئی ہے اور داخلے کے لئے جہاں بھی سرنگی پہنچتا ہوا تھا وہاں پر ایک ٹھری پوسٹ بھی موجود تھی۔

یہ سڑک جنگ کا دور تھا۔

شرقی پاکستان میں بھارتی مداخلت کارروائی کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ آٹے روز کوئی نہ کوئی خبر سننے کو مل جاتی تھی اور اب بھارتی جنگی جہازیں ملٹی سرحدوں کا رخ کر رہا تھا۔ راستے میں جہاں جہاں سے ہم گزرے، ہر طرف آری کھائے آتے جاتے دکھائی پڑے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان سے واسن بچا کر اپنا سفر کرتے رہے لیکن اپنے کام کی کوئی بات میں نے نظر انداز نہیں کی تھی۔۔۔ میری بے چین نظروں سے کچھ نہ بچ سکا تھا۔

اس جگہ کا نام ”تین پل“ تھا جہاں سے ہم شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ یہاں سے تین

راستے اس مقام پر آکر ملتے ہیں جو مختلف راستوں سے اس طرف آتے ہیں۔ ”تین پل“ سے تھوڑا پیچھے ہی ہمیں ایک سائیکل رکشہ نظر آیا۔ وہ شخص کسی کا دودھ لے کر شہر کی طرف جا رہا تھا۔ دُٹنے نے سوچا غیبت جانا اور اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ ہمارا علیہ چونکہ پہلے راستوں جیسا تھا اس لئے ہماری حالت پر کوئی شک نہ کر سکتا، لیکن اب ایک اور مشکل آڑے آ رہی تھی۔ یہاں کی مخصوص زبان پر مجھے عبور حاصل نہیں تھا۔ دُٹنے کی اہستہ اور بات تھی۔ ”تم نے اپنی اپنے آپ کو گونگا ہی سمجھو۔۔۔“ اس نے رکشہ سائیکل کی طرف پوچھتے ہوئے سرگوشی کی۔

میں نے جواب میں گردن ہلا دی۔ اب ہم دونوں رکشہ سائیکل میں بیٹھ چکے تھے۔ بھارتی راستوں میں بہت سے دیگر غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاموں کے علاوہ ایک کام کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اور وہ ہے ”شراب پینا“ ہر صحت میں غیر قانونی طور پر شراب نکالی جاتی ہے جو شہروں میں سستے داسوں فروخت ہوتی ہے کیونکہ حکومت کے منظور شدہ ٹھیکوں سے ان کے رجسٹرڈ خانے کم ہوتے ہیں۔ اس لئے چھوٹا طبقہ ”موہا“ اس ”سٹارٹر“ کو ترجیح دیتا ہے۔ بھارت کا ہر دور شہری شراب کا دیرپا ہے۔ نشہ بازی کا رجحان اتنا عام ہے کہ سڑک کے کنارے جیسے ہمارے ہاں چائے کے سٹال بنے ہوتے ہیں۔ اس طرح وہاں شراب کے ٹھیکے بنے ہوتے ہیں۔ یہاں سرکاری طور پر جاری شدہ شراب فروخت ہوتی ہے اور ایک مخصوص عملے کے اندر چن کر شراب نوشی کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ بنگالی و بھارتی معاشرے میں ایسے غیر قانونی دھندے کرنے والوں کی مدد کرنا باعث فخر سمجھا جاتا ہے۔ دُٹنے نے شاید اسی پس منظر میں بیان دیا تھا۔ وہ تین منٹ تک گفتگو کرنے کے بعد ہی وہ رکشہ والے کو اپنے ڈھب پر لے آیا تھا۔ ایک قریبی گھوٹ سے اس نے اپنا رشتہ جوڑتے ہوئے وہاں کے پانچ چھ ستر قسم کے بد معاشوں کا حوالہ دے کر اس پر اچھا خاصا دھب ڈال دیا تھا۔

”سہارا جی ہم تو اس ہیں“ آپ کے ہتھالی بھی ہو شرابی جیسے کہ۔“

”موہا“ سائیکل رکشہ کو ہی اس غیر قانونی شراب کی منتقلی کے لئے استعمال کیا جاتا اور ایسے لوگ اچھے خاصے پیسے کما لیتے۔ دُٹنے نے اسے یہی لالچ دیا تھا کہ وہ اس کے ذریعے کام کرائے گا۔

○○○

”تین پل“ پر ہم بھی پہلے سے کئی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ سائیکل رکشہ والے نے ہمیں دودھ کا مالک بتایا تھا اور وہاں موجود گوردھاریوں نے سوائے دُٹنے کے ہم اور گھوٹوں کے ہم کے

لور کچھ نہیں پوچھا تھا۔ یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے ہونے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب ہم لوگ گنگا نگر شہر میں داخل ہو رہے تھے۔

بھارتی شہری زندگی کا پہلا نمونہ ہی انکا کرہت انگیز تھا کہ میں نے پاکستان بننے پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ بھارتی مخلوق معاشرہ بڑی تیزی کے ساتھ پستی کی طرف گھسٹنے لگا رہا تھا۔ علم و ہمت جو کبھی عزت و غیرت کا سہل ہوتے تھے وہاں بے حیائی پوری طرح رونما ہو چکی ہے۔ عورت لور مرد کے غیر اخلاقی تعلقات لور اس کے بدترین متکبر اپنے علاج پر ہیں۔ شہروں میں بھی جگہ جگہ ایسے ہی منظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مسلمانوں کے جلتے ہی ہندو سکھ معاشرہ اپنی اصلیت پر آگیا ہے۔ جب ایک سرحدی لور معمولی شہر کا یہ محل ہے تو آگے بڑے شہروں کا کیا محل ہو گا؟ اس کا اندازہ مجھے بھلی ہو گیا تھا۔ راکش والے نے ہمیں شہر کے صحن درمیان لاری لڑے کے نزدیک اتارا تھا۔ ہمارے لاکھ ضد کرنے کے باوجود اس نے ہم سے کرایہ نہیں لیا تھا۔ وہ تو ہمیں چائے پلانے پر بھی غلام بنا تھا لیکن یہ زیادتی تھی۔ میں نے لور دُٹے لے اسے زبردستی اپنے ساتھ ڈاکٹر کر لیا اور اگلی صبح ملاقات کا وعدہ کر کے اس سے الگ ہو گئے۔

بٹھتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے گنگا نگر کے لاری لڑے کا رخ کیا۔ اس ایشیہ میں 'میں' نے گولا گولہ رہنے میں ہی غیرت جلتی تھی۔ ان لوگوں کے منہ پر گنگا نگر کے لاری لڑے کا مخصوص لہجہ دیکھ کر ہر طرف جب تک مجھے اس بات کا یقین نہ ہو گیا کہ میں یہاں اپنی لور الگ الگ نظر نہیں آؤں گا میں نے ذہن بند کر لی۔

مجھے لہجہ مانے جانا تھا۔ فطرت میں سفر کرنا ہی مخلوق ترین تھا۔ ہم ایک بس میں بیٹھے لور ابوہر کی طرف چل دیے۔

گنگا نگر سے لہجہ مانے تک کا سفر ایسے ہی تھا جیسے کسی نے لاہور سے فیصل آباد جانا ہو تو ملتان جائے لور وہاں سے فیصل آباد پہنچے۔ ابوہر کے بسوں کے اڈے پر جیسے ہی بس رکی 'میں' نے دروازے پر نظر پڑا تو ڈانسیں۔ وہاں دو سفید کپڑوں میں ملبوس انگریز اٹلی جس کے آدی ہر اترنے والے کو اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہے تھے جیسے انہیں یقین ہو کہ یہی پاکستان کا جہانوس ہے۔

"ہم الگ الگ اتریں گے؟" میں نے دُٹے کے کنارے میں سرکوشی کی۔

وہ میری بات کا کوئی جواب دینے بغیر اگلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بس میں خاموشی تھا جس کی وجہ سے ہر کسی کو اترنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ میں نے دُٹے کے اترنے کا انتظار کیا۔ جب وہ اتر گیا تو میں بھی دھکم پیل کرنا چاہتے دروازے سے نیچے اتر گیا۔ نیچے اترنے

جگہ میں نے جان بوجھ کر ایک لوجھڑی کے کنارے کو کھینچ لی تھی۔
"اگرچہ کیا؟" — میں نے میرے پیچھے اترنے ہی مجھے پھاڑ کھلنے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"شکر کرنا سارا جی۔" میں نے بھارتی رسم و رواج کے مطابق بڑی عاجزی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میرے اس محل سے کم از کم میں ان دونوں شکاری کتوں کی نظروں کا سامنا کرنے سے محفوظ ہو گیا جو چاروں طرف جلی پھیلائے شاید میرے ہی بکھرے تھے۔

دُٹے کے لئے یہ معمول کی بات تھی۔ وہ حالات سے لاپرواہ لاری سے کچھ فاصلے پر اپنے ایک کھوکھے سے بیڑیاں خرید رہا تھا۔ میں بھی اس کے نزدیک پہنچا۔ اس نے مجھ سے بات کرنا تو ایک طرف 'میری طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا اور اپنے آپ میں گمن رہا۔ میں بھی اس کے رویے کا مطلب بھلی جان چکا تھا۔ اس لئے میں نے بھی اس سے پہلے ہی سگرت کی ایک ڈبیا خرید کر وہاں سے رات جانا ہی مناسب سمجھا۔ وہ آہستہ آہستہ لڑے سے باہر کی طرف چل رہا۔

میں بھی کچھ فاصلے سے اس کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ اس امر پر ہم دونوں ہی غور رکھے ہوئے تھے کہ کوئی ہم دونوں میں سے کسی کا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد جب دُٹے کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہم محفوظ ہیں تو وہ ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔

اس طرف لوگوں کی آمد و رفت کم ہی تھی مگر بھی میں نے غلطی نہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔
"ست سری اہل جی۔" میں نے اس کے قریب پہنچ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اس نے بھی جواب میں اس خوبی سے وہی عمل دہرایا کہ میں اس کی شاندار ایکٹنگ پر حیران رہ گیا۔ لور لوگوں کی بات تو پھر بڑے 'خود مجھے بھی اس کا یقین ہونے لگا کہ ہم کلن عمر بعد پہلی مرحلہ طے ہیں۔ ایک دوسرے کی قیمت دریافت کرتے ہوئے ہم پٹا خریف ہوئے۔ اس کے قریب پہنچ گئے بھارت میں 'موما' دو قسم کے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو ہی لوگوں کے لئے جو دبیرین یعنی بیڑیاں کھانے والے ہیں لور دوسرے ان کے جو "سیت" کھانے والے ہیں۔ مسلمانوں کی گوشت خوری چونکہ مشہور ہے اس لئے ہم لوگ ایسے ہوٹلوں میں جانے کا "رہنما" کم ہی لیا کرتے ہیں خواہ وہاں حلال گوشت ہی کیوں نہ فروخت ہو رہا ہو۔

میں نے سرسری نظروں سے جائزہ لیا 'ہوٹل' کے باہر کھانا تھا "پریم دیشو دھابہ" دیشو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اچھا گوشت وغیرہ نہیں کھاتے لور ایسے 'معمولی' درجے کے ہوٹل 'موما' "دھابہ" کھاتے ہیں۔ دُٹے نے جان بوجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا کیونکہ یہاں 'موما' قریب لوگ ہی کھانا کھاتے ہیں لور ایسے دھابے زیادہ مشہور بھی نہیں ہوتے۔

پر کم دیشو دھلبے کے ایک کونے میں رکھی میں چند کریم نے اکو سڑکا آرڈر دیا اور جیسے ہی ایک میلے کپڑے پہنوں دھا ہوئی کا ملازم دھک اکو نم چٹنی کی پلیٹوں میں کھانا وہیں رکھ کر گیا۔ ہم دونوں ہی کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ رات بھر کے پیدل سفر اور تھکوت نے برا حال کر دیا تھا ایک اجنبی ملک 'اجنبی ماحول' قدم قدم پر گرفتاری اور موت کا خطرہ۔ میں اپنی حد تک تو یہی کہوں کہ میں اپنے ذہن اور جسم کی تمام تر صلاحیتوں کو بے حدے کار لا رہا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی ہمیں ذرا محفوظ ہونے کا احساس ہوا 'شدید تھکوت' عموماً ہونے لگی۔

"میں آپ سے الگ ہو رہا ہوں" فائدہ تعالیٰ آپ کا مشن کامیاب کرے۔ "دُتے نے مہنگو کا آغاز کیا۔

"آمین" ہم دونوں کے منہ سے اُکھنے ہی لگا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے راستوں کی کوچ بچ سے اٹھ کر لاریوں اور ٹریلوں وغیرہ میں سفر کے آداب کے متعلق اگلی دی اور پنجاب کے مختلف علاقے کے لوگوں کی عادات سے اٹھ کر دیکھا کہ کو کون باتوں کا مجھے پہلے سے علم تھا پھر بھی میں ہدی توجہ کے ساتھ اس کی باتیں ذہن نشین کر رہا تھا۔

"اچھا دوست فی لندن فائدہ۔۔۔" اس نے مہنگو سمیٹے ہوئے کہا۔

○○○

دُتہ وہیں رہ گیا میں باہر نکل آیا۔

ہمارے الگ ہونے کا یہی طریقہ سب سے بہتر تھا نہ اسے میری خطی کاظم تھا نہ مجھے اس کے لٹکانے کی خبر۔ اب میں خدا نور خدا کی ذات۔ میرا عزم تھا اور اس کی نظر کر رہا۔ پھر دھلبے سے باہر قدم رکھنے سے پہلے ہی میں ذہنی طور پر تمام حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہاتھ تیار ہو چکا تھا۔ ساری تھکوت بھانے میں مقرب ہو گئی تھی اور میں اپنے آپ کو ہاتھل پست اور ہشیار عموماً کر رہا تھا۔

بسوں کا لڑھ بیل سے زیادہ دور بھی نہیں تھا لیکن میں نے سائیکل رکشہ ہی چلنے کو ترجیح دی۔

سائیکل رکشہ سے میں لڑے کے باہر ہی اتر گیا مجھے لدھیانہ چلا تھا۔ بیل سے برہ راستہ لدھیانہ کو نہیں جاتی تھی لیکن میں نے ان کے ذریعے بھانے کیوں سفر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں سوگا جانتے دلی بس پر سوار ہو گیا۔ جوہر سے موگا جانے والی بسوں کی کوئی چیکنگ نہیں ہوتی تھی۔ میں دو سواریوں والی سیٹ پر چڑھ گیا۔ جن بوجھ کر میں نے کڑی دلی سیٹ خالی

چھوڑ دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح وہیں بیٹھے دلی سواری زیادہ توجہ باہر کے متاثر دیکھنے پر صرف کرے گی اور مجھ سے مہنگو کا موقع اسے کم ہی ملے گا۔ ابھی میں اس مرحلے پر نہیں پہنچا تھا کہ بھارتی شہریوں سے غری ہو کر مہنگو کرنے لگوں 'کیونکہ لاکھ تربیت یافتہ ہشیار ہلاک ہونے کے بلحاظ میں ایک اجنبی تھا۔

ایک پاکستانی جاسوس جس نے ایک بھارتی شہری کا بیس بدل رکھا تھا۔ اہل دی دلی میں دعا کر رہا تھا کہ خدایا بیل کوئی میرے مطلب کی سواری ہی بیٹھے۔ میری دعا قبول ہوئی اور میں نے ایک سکھ نوجوان کو دیکھا جس کی عمر ہشکل سترہ اشادہ سال تھی اور محل سے ہی محل سے گورا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کڑی کے قریب خالی جگہ دیکھ کر وہیں آ بیٹھا اس کے بیٹھے کے چند منٹ بعد ہی لاری چل دی۔

"کہیں جڑ گئے بھائی۔۔۔" میں نے خودی مہنگو کا آغاز کیا۔

"سوگے" اس نے میری بجائے دائیں ہاتھ والی سیٹ پر بیٹھی لڑکی پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

"یار جاتا مجھے بھی وہیں ہے پر میں پہلی مرتبہ جا رہا ہوں 'کیا تم وہیں کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں۔۔۔" اس نے ابھی تک میری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ پھر بھانے کیسے لڑے اس بات کا احساس ہو گیا کہ عورت کا ظہور اس کے ساتھ نہ صرف سمجھوتہ ہے بلکہ گفتگو بھی اس کی طرف کھانے والی نظروں سے دیکھ بھی رہا ہے۔

اب وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

"کہیں جاتیں گے آپ؟"

"ریگل سینٹر۔"

"میں تالوں گا آپ کو۔۔۔ میرے گھر کے نزدیک ہی ہے۔"

"دور اصل میرا کچا زو وہیں مشین آپ گھر ہے" اسی سے لٹے جا رہا ہوں۔" میں نے اپنی دہشت میں اس کی کمزور رگ پر ہاتھ رکھا کیونکہ بیل کی "کلیئر" سے بھرپور غصہ دیکھ کر میں نے بیل کے نوجوانوں کے جذبات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔

"کہیں رستہ ہیں آپ؟" سینا کے حوالے سے مہنگو کے جواب میں اس کی دلچسپی نے مجھے حیرن دلا دیا تھا کہ خیر نکلنے پر لگا ہے۔

"میں تو کچا گھر رہتا ہوں" وہ لدھیانہ رہتا ہے۔"

"میں آپ کو ان کے پاس لے جاؤں گا۔"

”دھنول“ (شکر) میں نے کھد

موگا پہنچے تک ہم دونوں بڑے اچھے دوست بن چکے تھے۔ اس اثنا میں راستے میں جہاں کہیں بھی بس ٹھہرتی وہ حسب توفیق کچھ نہ کچھ چھائی فروشن سے خریدتا اور مجھے بھی ساتھ شامل کر لیتا۔ شام کو ہم موگے پہنچ گئے۔ اب اس سے جہاں چھڑوانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ راستے میں میں نے اس کی مدد سے موگے کا سارا نقشہ حفظ کر لیا تھا۔

”اچھا سردار جی مجھے ایک ضروری کام کرنا ہے۔ کل آپ بارہ بجے والے شہر پر مجھے ریگس سینما کے دروازے پر اپنا ٹھکانا بنائیں گے۔ گوئیل یاروں کا بار ہے ایک دفعہ تمہارا تعارف کرا دوں گا ساری زندگی جس میں موگے میں سینما کی ٹکٹ نہیں خریدنی پڑے گی۔“ ”اتنا کہہ کر میں نے اسے سوچنے کا موقع ہی نہ دیا اور ”ست سری اکل“ کہہ کر پھرتی سے لاری لڑے کی بجائے میں غائب ہو گیا۔ اب میرا جسم شدت سے آرام کا تقاضا کر رہا تھا مسلسل سفر نے تھکاؤ تھا اور آنکھوں میں جلن کے ساتھ ساتھ سردرد نے بھی برا حال کر دیا تھا۔ اس صورت میں سفر جاری رکھنا خواہ مخواہ بخار کی مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ میں نے جیسے تیسے لڑے سے باہر بنی ریلوے لائن عبور کی۔ اب میں موگا کے مین بازار میں داخل ہو رہا تھا۔ یہیں ایک معمولی سے ہوٹل کو میں نے اپنی شب بستی کے لئے منتخب کیا۔

○○○

شام کے قریب چھ سلت بجے میں کرناہ ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس ہوٹل کا مالک ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی تھا اور مجھے بعد میں علم ہوا کہ وہ پولیس کا خاص لڑا بھی تھا۔ موگا ایک قصبہ نما چھوٹا سا شہر ہے اس کے علاوہ یہاں ایک دو ہوٹل ہی تھے لیکن یہ بھی عجیب بات تھی کہ میں سب سے پہلے پہنچا ہی اس ہوٹل میں تھا۔ ہوٹل کے نیچے ایک کمرہ تھا جس کے اوپر تین چار کمرے بنے ہوئے تھے جن کی چھتیں ساتھ کے دوسرے مکانات سے ملی ہوئی تھیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے اندرون شہر مکانات ہوتے ہیں۔

”مکمل سے آئے ہیں مبارک؟“ ہل کرے کے ایک کونے میں شوکیس کے پیچھے کرسی پر بیٹھے ایک عشق بازی داڑھی والے شخص نے مجھ سے پوچھا جس کا چہرہ شوکیس پر رکھے مصلیٰ کے قتلوار کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ شوکیس جس سے وہ ککوتر کا کام بھی لے رہا تھا اس کے ایک کونے میں اردو اخبار ”ہندوستان“ رکھا ہوا تھا۔

مشرقی پنجاب میں لوہڑا عمر کے زیادہ تر سکھ اردو اخبارات ہی پڑھتے ہیں اس لئے اس وقت میرے ذہن میں کوئی شک پیدا نہ ہوا اور یہی میری غلطی تھی جس کا خیال مجھے بعد میں بھگتا پڑا۔

”جہاندھر سے آلی عذہ مکمل نمبر ۳۳“ میں نے رٹار ٹیلا پڑھیں دھنول لکھوا دیا۔ ”یہاں اپنے دھنول کر دیں۔“ اس نے دو چار سوالات پوچھنے کے بعد ہاتھ آخر رجسٹر میرے سامنے رکھ دیا۔

”میں تو ان پڑھ ہوں سردار جی۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ انگوٹھا لگا دو۔ بھی کیا کریں گا دوبار ہی ایسا ہے کارروائی مکمل نہ ہو تو پولیس تک کٹی ہے۔“ اس نے سیسہ پین کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے انگوٹھا لگا کر ضابطے کی کارروائی مکمل کی۔

”لوئے منو لے جا سردار جی کو لوہڑا۔“ اس نے ایک عجیب و غریب وضع قطع کے ملازم کو آواز دیتے ہوئے حکم دیا۔

کمرہ کیا تھا کچھ نہ پوچھئے اسے تو کمرہ کتنا ہی کمرے کی توہین تھی اور تو ساری باتیں ایک طرف ’دروازہ ہارڈ بورڈ کا تھا جس میں کم از کم دس سولخ کئے گئے تھے۔ یہ ہوٹل زیادہ تر ملاقاتیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور دروازوں میں سولخ کر کے ملازمین کو سولت بہم پہنچانی گئی تھی۔

میں ہوٹل کے واحد غسل خانے میں جا کھلنا کر فارغ ہوا تو چائے کے ساتھ کچھ بسکٹ وغیرہ کھائے۔ دو اسپرن کی گولیاں زہر مار کیں اور گرمی نیند سو گیا۔ صبح میری آنکھ فجر کے وقت قریبی گردوارے سے آنے والی آوازوں سے کھلی تھی۔ حواج ضروریہ سے فراغت کے بعد میں نے دل ہی دل میں خدا کو یاد کیا۔ صبح ہے ایسی غیر یقینی حالات میں خدا کی ذات ہی میرا واحد سارا تھی۔

میرے کمرے کے ساتھ ہلتی تین چار کمرے ایک قطار کی صورت میں بنے ہوئے تھے اور ان کے سامنے ایک طرف لوہڑا چھت پر جلنے کا راستہ تھا جب کہ دوسرے کونے پر ایک کمرے میں ہوٹل کے ملازمین زمین پر لیٹے رہتے تھے۔ نیچے ہل میں جا کر میں ٹہشتے کا آؤر دے کر لوہڑا آگیا اور جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا اچانک ٹھسک کر رہ گیا۔ میرے بستر پر تازہ اخبار اردو زبان کا ”ہندوستان“ رکھا ہوا تھا۔

ارد گرد کوئی موجود نہ تھا مجھے یہ تو کچھ آگئی کہ یہ چال ہے اور جہاں میں مجھے پھانسا جا رہا ہے لیکن اپنے پچھلے رویے پر غور کیا تو مجھے شک دلی ہوئی بات نظر نہ آئی۔ میں کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی غلطی سے اخبار یہاں رکھ گیا ہے ’دہلی کسی کو موجود نہ پا کر لوہڑا جنس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اخبار اٹھا لیا اور سرسری نظروں سے اس کا جائزہ

میں نے لیا۔۔۔ جس وقت ہوئی کا لازم اچانک وہیں پہنچا تو میں چارپائی پر اظہار پکڑے بیٹھا تھا۔

”یار یہ کس کا اخبار یہاں پھینک گئے ہو؟“ میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع دینے بغیر کہہ دیا۔
”صحافت کے ادارے جی دراصل یہ ساتھ والے کمرے میں جو لالہ جی ہیں ان کا اخبار تھا۔
لو کا غلطی سے پھینک گیا میں یہی لینے آیا تھا۔“

اپنی دانست میں تو میں نے اسے خود پر شک کرنے کا موقع نہیں دیا تھا، لیکن اس کی کمری اور
کئی اندر تک جھانکنے والی نظروں کو میں کیسے نظر انداز کر سکتا تھا؟

چھٹی حس نے جیسے ہی خطرے کی گھنٹی بجائی کہ میں نے اس کے رونا ہوتے ہی اپنے مختصر
سے سلفن کا جائزہ لیا۔ میری کل کائنات ایک پلاسٹک کا نور ایک کپڑے کا تھیلا تھا۔ بھرتو جیسے
میں تھا کہ وہ کیا کسی نے واقعی میرے دونوں تھیلوں کی تلاش کی تھی لیکن اتنی جھلکی کے ساتھ
کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکے۔

دوسرے ہی لمحے میں آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ میرے پاس موجود
تمام کرنسی تو پہلے ہی میری بیویوں میں موجود تھی۔ میں نے بیوی بھرتی کے ساتھ جو تے بدلے اور
تیار ہو کر بیٹھ رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے سلفن میں کوئی ایسی دھکی چیز نہیں تھی جس سے کسی کو
شک ہو، لیکن ممکنیت پر نظر رکھنا ہر جاسوس کا اولین فرض ہے۔ ممکن تھا کہ انہوں نے وہیں
کوئی مشجب چیز دیکھ لی ہو یا مجھے اور اخبار پڑھنے کسی نے دیکھ لیا ہو۔ پورا ہانپنے لے اندر داخل
ہوا، میں نے بڑے اطمینان سے اس کے ہاتھ سے ”تھیلی“ تھامی۔

”یار ذرا یہ سگریٹ تو لالہ“ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ روپے کا ایک
نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ جیسے ہی وہ نوٹ لینے آگے کو جھکا، ایک ہی وقت میں میرے
دائیں ہاتھ کی زوردار ضرب اس کی کینچی پر نور گھٹنا اس کے جسم کے باؤک ترین حصے پر لگ۔ میں
نے کچھ زیادہ ہی سخت ہاتھ لگا دیا تھا کہ وہ کسی ”مسلموٹن“ ٹیم کی طرح بغیر منہ سے آواز
نکلے میرے بستر پر آن کر۔ میں نے اس کی ٹانگیں بھی اٹھا کر لوہے کر دیں اور وہ بدردار کھل
جس نے ساری رات میرا خون چوسا تھا اس کو لوڑھا دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں بیوی بھرتی سے
لیکن بغیر آواز پیدا کئے ہوئی کی بیڑیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

بیڑیوں کے خانے پر ایک طرف ہل کر وہاں جس کے بیڑیوں سے منسلک مجھے کے باہر
پوریاں تلی جا رہی تھیں اور شاید سارا سوگا وہیں سے پوریاں خریدنے اور کھلنے چلا آیا تھا۔

ایسے رش اور انفراتفری کے عالم میں کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑی اور میں خاموشی سے ایک

طرف کھٹک گیا۔ ہزار کل رہا تھا اور لوگوں کی آمدورفت بھی اچھی خاصی شروع ہو چکی تھی۔
ابھی میں بیکل ہندو گز بھی نہ چل پلا تھا جب میں نے پولیس کی ایک تیز رفتار جیب کو جس کے
ساتھ آٹھ دس مسلح سپاہی اور ایک تھیلہ دار چھپے ہوئے تھے، کرتد ہوئی کی طرف بڑھتے دیکھا۔
ہوئی کے سامنے میں نے اپنی آنکھوں سے جیب کو رکے دیکھا تھا۔ سپاہی بیوی بھرتی کا مظاہرہ
کرتے ہوئے نیچے اترے، آگے کا منظر دیکھنے کی بجائے میں ایک ٹہلی کی دکان میں جا کھلا۔

”تم کرتد ہاں مسیت کوہ“ میں نے اپنے چہرے پر اگی ہوئی بھونٹی داڑھی کی طرف
اشارہ کیا۔
”جو تم صدارت؟“

ٹہلی نے ”رام رام“ کہتے ہوئے میری داڑھی اور مونچھیں مناچت کر والیں، تھوڑی ہی دیر
کے بعد ایک کھل براہمن کے روپ میں جیتی پوشاک پہنے اور خاصی جیتی کرم چادر لوڑھے گلے
میں ”ضیو“ والے میں بھی اس بھیر میں شامل ہو چکا تھا، جو کرتد ہوئی کے باہر پولیس کی بے بسی
کا مظاہرہ کرنے کے لئے اکٹھی ہو چکی تھی۔

”کیا ہوا بھائی؟“ میں نے ایک تھیلے سے پوچھا۔

”لالہ جی جوس تھا کوئی۔۔۔ بھاگ گیا سلا۔۔۔ اتنی پولیس کو جل دے کر بھاگ گیا۔
سب تجھے گدھے پولیس میں بھرتی ہو گئے ہیں۔“ اس نے عقیدت مندی سے دونوں ہاتھ
جوڑتے ہوئے کہہ دیا۔

”ہرے لوم ہرے لوم۔۔۔“ کہتا ہوا میں ایک طرف ہٹ گیا۔

پولیس والوں کو جب وہ ”جاسوس“ نہ مل سکا تو انہوں نے اپنا غصہ ہوئی کی پوریوں اور
چائے پر نکالا۔ جب میں وہیں پہنچا تو وہ لوگ ہشتے سے فارغ ہو کر اس میرے کو دھکے مارتے
ہوئے جیب کی طرف لا رہے تھے جسے میں استراحت فرماتے کے لئے اپنے بستر پر چھوڑ آیا تھا۔
میرے لاری لٹاے پر پکڑنے سے پہلے ہی میرے فرار کے اعلانے اور کاروائی وہیں ذہن زد خاص و
عام تھے۔

”پاکستانی ٹیمس“ بیٹھے ”لور“ ”ککڑو“ کی سوگا میں موجودگی نے کئی بھارتیوں کے چہروں سے
لو پھوڑا لیا تھا۔ ہر شخص سا سالور خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

لاے پر بھارتی پولیس کے مسلح سپاہی گشت کر رہے تھے، جیسے انہیں اس بات کا یقین تھا کہ
ابھی وہ جاسوس دہلی آن کر ان کی خدمت میں اپنے آپ کو پیش کر دے گا یا پھر وہ اسے گرفتار کر
کے رہیں گے۔ جس کا نکت خریدنے سے بس میں سوار ہونے تک ہر جگہ اس موضوع پر گفتگو

میں تو خود ہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ طلب کریں۔ اس طرح ایک طرح سے خطہ کا احساس رہتا تھا اور سائن کے علاوہ اس شخص کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ ایک دہائی میں بنی ہوئی مختلف اداروں میں سے ایک میں سائن رکھ کر جو ایک کپڑے کے قبیلے کو اس میں ضروریات زندگی کی کچھ چیزوں پر مشتمل تھا میں نے تباہ لگا دیا اور باہر نکل آیا۔

رات تک میں نے جی بھر کے آوارہ گردی کی۔ میں چاہتا تھا کہ جس شہر میں قیام کر رہا ہوں، اس کے گلی محلوں سے، اس کے کیتھوں سے، عمارات سے اور وہیں موجود تفریحی مقبالت سے ابھی حاصل کر لوں۔ مومے سے ایک ”پاکستانی جاسوس“ کا قرار کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ رائے کوٹ، ملاں پور، جگراؤں اور لدھیانہ تک کے تمام ہوٹلوں پر سی۔ آئی۔ ڈی نے کڑی نظریں رکھی ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ رات ہوٹل میں بسر کرنے سے پرہیز کیا۔

رات کو ایک مقامی سینما میں فلم دیکھنے ہوئے پھر ایک مصیبت نے آن گھیرا۔ جس قطار میں کھڑا ہو کر میں ٹکٹ خرید رہا تھا، وہیں شراب کے نشے میں دمت ایک سگھ نوجوان آدمی کا اور خواہ مخواہ سب سے الجھنے لگا۔ یہاں ایسے واقعات چونکہ روزِ مرد کا معمول تھے اس لئے ہن لوگوں کے لئے تو وہ کوئی پریشانی پیدا نہ کر سکا، البتہ میری بات اور تھی۔ پہلے تو اس نے مجھے حکم دیا کہ اس کے لئے جگہ خالی کر دوں۔ میں نے شرافت سے جگہ چھوڑ دی۔ پھر حکم ہوا دوبارہ قطار میں کھڑے ہو جاؤ، میں پھر کھڑا ہو گیا۔ جب اسے یقین ہو چلا کہ واسطہ کاٹھ کے الو سے ہے تو اس نے دست درازی بھی شروع کر دی۔ میں خاموش اس لئے تھا کہ لوٹ پولیس تک نہ پہنچ جائے، دوسری طرف حالت یہ تھی کہ وہ شرابی اپنے کلام میں مصروف تھا اور میں لوگوں کے لئے مذاق بنا ہوا تھا۔ وہ سب زوردار قسموں سے اسے ولوے رہے تھے۔ جب یہ معاملہ دیکھ کر دو پولیس والے بھی اس طرف آنے لگے تو میرا ہاتھ خشکا، میں قطار سے باہر نکل گیا تاکہ چپ چاپ کھسک جاؤں، لیکن اس نے مجھے گرہن پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ پولیس کے سپاہی قریب آ گئے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں نے ہلن غواہ اس کو دو ہاتھ بجا دیے۔ وہ لڑکھڑانا ہوا قریبی دیوار سے کھرایا اور لوگوں کے قسموں کی آواز اور بلند ہو گئی۔

”اولاد لالہ جی سماراج مکمل کر دیا۔“ مجھے ولوٹنے لگی کیونکہ کسی ہندو کے ہاتھوں کسی سکھ کالہ میاںہ میں پٹ جانا یقیناً معجزہ ہی تھا۔

”کیا بت ہے، کیا بت ہے؟“ سپاہی وہلی آ دھمکے۔ وہ پانچ دس روپے کا چانس کیوں
 پھوڑے۔

”چلو تھلے۔۔۔“ من میں سے ایک نے تو اس شرابی سکھ کو بازو سے پکڑ لیا جب کہ

سے واسطہ پرانے میں طبعی دل میں امن کی خوفزدگی سے لطف اندوز ہوتا رہا لیکن امکانات کو میں نے نظر انداز نہ کیا۔



موسے سے میں لدھیانہ جانے والی بس پر سوار ہو گیا۔ لدھیانہ تک اسی ایک بت کا تذکرہ ہوتا رہا۔ میں نے بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔ شام کے وقت بس لدھیانہ پہنچی، میں لاری لڑے جانے کے بجائے جو کہ ٹال جھون کے نزدیک بنا ہوا ہے، کچھ پیچے ہی ٹیلی گراف آفس کے نزدیک بس سے اتر گیا۔

یہی ٹی ٹی گریف آفس کے نزدیک بس سے اتر گیا۔ یہاں سے لہجہ شہر تک کا فاصلہ میں نے جان بوجھ کر پیدل ہی طے کیا تھا۔ ریلوے کے پل سے گزرتے ہوئے میں نے ارد گرد شہر کا نظارہ کر لیا اور راستے میں مختلف لوگوں سے ارد گرد کے علاقوں کے نام بھی پوچھتا جا رہا تھا جو بعد میں میرے کام آ سکتے تھے اور جن کے متعلق معلومات حاصل کرنا ضروری تھا۔ وہ رات میں نے ہونٹل کے بجائے کسی اور جگہ بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ جگہ تھی ایک آشرم۔

فیصلہ کیا اور وہ جگہ بھی ایک آشرم
آشرم میں معمول پیسے دے کر آپ کو رات بھر کے قیام کے لئے ایک چارپائی مل جاتی
ہے۔ اگر مختلفہ پنڈت کو جو یہی کاناچارج ہے آپ نے رام کر لیا تو پہلے دم آخریں تک یہی
قیام کیجئے۔ لدھیانہ شہر کے اس آشرم میں داخل ہوتے ہی میرا واسطہ سب سے پہلے پہاڑی جی
کے ایک گھر سے ہوا۔

"رام رام جی" — "میں نے ہاتھ جوڑے ہوئے کہا۔"

”رام رام کی ————— میں ہے آوازِ بزرگ —————“
 ”رام رام ————— کہیں جائیں گے —————“ اس نے جوابِ لور سواہی ایک ساتھ دیا۔

”کمرہ چاہیے۔۔۔۔۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اس نے ایک نظر بھر پور سے میرا جائزہ لیا، گو اس وقت تک میرا حلیہ کُلنی تبدیل ہو چکا تھا، یعنی جیتی کرم چادر کی جگہ ایک عام جرسی نے لی تھی اور معمولی سا مفلکڑوں کے گرد لپٹا تھا لیکن اب بھی میں اچھا بھلا "براہمن" نظر آ رہا تھا۔

لیکن اب بھی میں اچھا بھلا "برائمن" تھا اور اب حد
 "ہمارا جی جگہ تو نہیں ہے۔ دراصل مانا دشو کا میلہ شروع ہونے والا ہے اس لئے
 لدھیانہ میں ارد گرد کے رہتوں سے کافی لوگ آ رہے ہیں، البتہ کوشش کر کے ایک کمرہ خالی
 کر دیا جاسکتا ہے اگر آپ۔۔۔۔۔۔"

کودیا جاسکتا ہے اگر آپ۔۔۔۔۔

"میں نے اس کا دور افسردہ مکمل کر لیا۔"

دوسرے نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے وہی مزاحمت کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس نے بھرے صبح سے بھاگنے کے مواقع کم ہی ملتے ہیں اور چپ چاپ من کے ساتھ سینا سے اپری کی طرف چل رہا۔ ہم لوگ سینا سے اب کوئی چندہ میں گزردہ ایک سڑک پر آ گئے تھے جس سے لھٹھ آہدی نظر آ رہی تھی۔ اس لٹھ میں دوسرے سپاہی نے اس سٹک سے اپنی ”ہوازی“ کھری کر لی تھی جب کہ میرے دھاکچہ زیادہ ہی ٹیک دکھائی دے رہا تھا۔

”چھوڑیے مدارج جی ہم کوئی ٹوٹے جھگڑنے والے لوگ ہیں“ یہ تو خلوہ خلوہ مجھ سے لڑائی مسل لے رہا تھا۔ میں نے دس کا ایک ٹوٹ اسے چھلٹے ہوئے کہا۔

”لوئے رشتہ دیتا ہے برائمن کی لولادو۔۔۔“ اس نے مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔
تھوڑی دیر بعد ہم قلعے میں ہوں گے، پتھری ہے کہ یہاں ہی محلہ صاف کر لیا جائے۔
میں سوچنے لگا، یہاں آمدورفت نہ ہونے کے برابر ہے اور اس کے علاوہ قریب کلی غلوں میں بھی بچا ہوا جاسکتا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر اپنی رفتار خاصی کم کر دی تھی۔۔۔ دوسرا سپاہی اب ہم سے آٹھ دس گز آگے بڑھ گیا تھا۔

”تمہاری مرضی۔۔۔۔۔“

کہتے ہوئے میں نے تیزی سے پٹا کھلایا اور میرے بائیں ہاتھ کی کہنی اس تیزی کے ساتھ اس کی پٹیلوں میں لگی کہ اس نے تڑپ کر میرا دایاں ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکے، میرے دوسرے ہاتھ نے بھی یہی عمل دہرایا۔ اس کے ساتھ ہی میری اس کی کہنی پر کھٹے والی زوردار لٹ نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اذیت کے مارے اس کے حلق سے ٹوٹی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی، جب تک اس کا ساتھی اس کی طرف متوجہ ہوتا، میں من کی نظروں سے گوجھل ہو کر قریبی کھلے میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔

شام کے قریب، سات بجنے کو تھے اور اچھا خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ قریبی کھلے میں چھپتے ہی میں نے اپنی رفتار کم کر دی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا دوسری طرف کی سڑک پر پہنچ گیا جہاں سے ایک سائیکل رکشہ میں بیٹھ کر ”چوڑا بازار“ آ گیا۔ یہ بازار ہماری لاہور کی انارکلی اور کراچی کی نصیب النساء سٹریٹ جیسا تھا۔

ریڈی سینہ کپڑوں کی ایک دو ٹکن سے جب میں تھوڑی دیر کے بعد نکلا تو ایک معززہ اور پڑے کھسے ہندو کی طرح میں نے سوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں بریف کیس پکڑا ہوا تھا۔ آشرم میں سوائے ایک کپڑے کے قبیلے کے جس میں ایک میلے کپڑوں کا جوڑا رکھا تھا اور تھالی

کیا؟ اپنی چادر تو میں ساتھ ہی لے آیا تھا۔ تھوڑی دیر تک بازار میں سرگشت کرنے کے بعد جبکہ اور جنس بھی میرے بریف کیس میں ختم ہو چکی تھی اور اب میرے قدم ایک ایسے ہوٹل کی طرف اٹھ رہے تھے جہاں ”مونا“ شرفا کا قیام ہوتا ہے اور ایسے ہوٹلوں پر پولیس ٹیک کرنے کی جرئت کم ہی کرتی ہے۔

○○○

”بی بی ہوم“ کے کلوٹر پر میرا استقبال ایک خوبصورت لڑکی نے کیا۔ اس نے پہلے سے چپا ہوا ایک کارڈ میری طرف بڑھا دیا، جس میں قلم اندراج انگریزی میں کئے جاتے تھے۔ میں نے اپنے قیمتی قلم سے چلی غوث کے ساتھ اس پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچیں اور کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے بغیر پڑھے اسے رکھ لیا اور ایک صوبہ جیڑا میرا بریف کیس اٹھا کر میری رہنمائی کرنے لگا۔

لڑکی کے چمکتے ہوئے تواب کہنے کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے پے سے قدموں کے ساتھ سرے کے پیچھے چھپے چل دیا۔ ایک شاندار اور بے سہارے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ صوبہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ”Any More Service Sir“ اس نے مڑنے سے پہلے پوچھا اور اس ”معزز خدمت“ کا مطلب مجھے پہلی معلوم تھا۔ بھارت میں کسی فوجی اور پھر ایسے فوجیوں سے امید رکھنا جو اس قسم کے اعلیٰ ہوٹلوں میں قیام کرے کہ وہ رات کسی ”ساتھی“ کے بغیر بسر کرے گا، یقیناً مجھ ہی تھا۔ اس لئے جواب میں جب اسے دس روپے کا نوٹ ٹپ کرتے ہوئے میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”No Thank You“ میں دیشو ہوں۔“ کہا۔

تو اس نے حیرانگی کے ساتھ میری طرف دیکھا، پھر واپس مڑ گیا۔ رات کا کھانا میں نے اپنے کمرے میں ہی کھوایا تھا۔ چونکہ میں ”دیشو“ تھا اس لئے میرے لئے کھانے کا میو بھی بغیر میٹ والے کھانوں کا پیش کیا گیا تھا۔ رات دس بجے تک لاؤت میں نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں گزارا۔ میں زیادہ شرافت کا مظاہرہ کر کے اپنے حلق کسی کو سوچنے کا موقع دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ہر قدم پر احتیاط درکار تھی۔ ابھی مشن شروع نہیں ہوا تھا اور پے در پے میسجیں آنے لگی تھیں۔ میں چو کنا اور بیدار تھا۔ قریب ساڑھے گیارہ بجے تک میں اپنے کمرے میں لیٹا مطالعہ کرتا رہا، پھر صبح کو چش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچنا سوچنا سو گیا۔

صبح میں نے قلم دروازوں کے پردے دوبارہ چیک کرنے کے بعد وہیں کمرے میں نماز لڑائی اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے مشن کی کامیابی کے لئے دعا مانگا رہا۔

صبح کا بشتہ میں نے ڈانٹنگ ہل ہی میں کیا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے ٹارگٹ کی طرف جا رہا تھا۔ بلواڑہ ہوائی لڑے کی طرف ہوٹل سے میں عام شہری کے لباس میں ہی باہر نکلا تھا، لیکن ایک دیران سی جگہ اپنے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد میں اب ایک دیہاتی کا روپ دھار چکا تھا۔ اپنے اصلی کپڑے میں نے اسٹیشن کے لاکر میں محفوظ کر دیئے تھے اور خود میں ایک سائیکل رکشہ میں بیٹھ کر لاری لڑے پہنچ گیا تھا۔ لدھیانہ سے ایک بس کے ذریعے میں رائے کوٹ گیڈ میں راستے میں میرا ٹارگٹ تھا۔ بس کی کھڑکی سے میں نے دیکھا، سڑک کے کنارے ہوائی لڑے کے صرف متعلقہ دفاتر تھے۔ اس کا ٹیکنیکل ایریا میں سے بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ دشمن نے اتنے بہترین اور منظم طریقے کے ساتھ لڑے کو کیوں فلانج کیا تھا کہ بے اختیار اسے دلو دینے کوئی چاہا۔ ہر حال ایک سرسری نظر سے میں نے حالات کا اندازہ لگا لیا۔

○○○

بس آگے نکل گئی۔ میں نے رائے کوٹ ٹھہرائی مناسب نہ سمجھا اور جگہ لڑوں اور ملاں پر ہوتا ہوا واپس لدھیانہ آگیا۔ مجھے ہوائی لڑے کے اندر داخل ہونا تھا اور اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے، یہی سب سے اہم اور ضروری مسئلہ تھا۔ لدھیانہ میں قریباً چار پانچ جگہ پنچال۔۔۔ ایک معمولی سے ہوٹل میں کچھ کھانا کھایا اور چھ بجے ایک سینا ہل میں جا کھنسا۔ یہاں ایک خاصی مزاحیہ فلم چل رہی تھی، لیکن میرا خیال پردہ سکرین کی طرف تھا، میں تو لوری خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

رٹوے اسٹیشن سے میں نے اپنے کپڑے حاصل کر لئے تھے اور اپنی معزز شکل اختیار کر لی تھی جب کہ دوسرے کپڑے میں نے دوبارہ لاکر میں رکھ دیئے تھے۔ کپڑوں کی تبدیلی کے لئے ایک مقامی تفریح گھر کے ایک کونے میں مجھے بڑی شاندار جگہ میسر آ گئی تھی۔

سینا میں میری ساتھ دلی سیٹ پر بیٹھے نوجوان نے میری ظاہری وضع قطع سے متاثر ہو کر مجھ سے رلو ورم بولنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے غیر ضروری جان کر کوئی خاص لطف نہ کرائی۔۔۔۔ ہاں ٹائم کے وقت جب اس نے ایک ہیرے کو آواز دے کر بوقت لانے کے لئے کہا تو مجھے اس کی زبان سے رائے کوٹ اور ملاں پور کے لوگوں کا مخصوص انداز جھلکتا دکھائی پڑا اور امید کی ایک کرن پیدا ہو گئی۔ "ممکن ہے یہ نوجوان میرے بیلے ہوئے منصوبے میں کہیں فٹ بیٹھ جائے۔" جیسے ہی ہیرے نے اسے بوقت کھول کر دیا چلتی، میں نے ہیرے کے ہاتھ سے پکڑ لی۔

"ایک نہیں دو۔" میں نے ہیرے سے کہا۔ نوجوان نے حیرانگی کے ساتھ میری طرف دیکھا

تو میں اس سے بات کرنے کا رد و کار نہیں تھا یا اب اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ "شمار کیا بار اصل میں ایک الجھن آن پڑی ہے ورنہ میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہوں۔" اسے دوسری بوقت سمجھتے ہوئے میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں سر! الجھنیں بھی انسانوں کے لئے بنی ہیں اور اس کا حل بھی انسانوں ہی کے پاس ہے۔ شاید میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔" اس نے میری ظاہری حیثیت سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"کہاں رہتے ہو؟ کیا شہر نام ہے؟" میں نے اس سے دونوں سوئل اسٹھے کر دیئے۔

"رائے کوٹ میں رہتا ہوں اور پرکاش نام ہے میرا۔"

"ویل ڈن" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "میرا نام بھی پرکاش ہی ہے۔ پرکاش بھائیہ، بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر۔" میں نے واقعی خوشی کا مظاہرہ کر ڈالا۔ قدرت نے اسے میرے لئے نہیں مدد بنا کر جو نازل کیا تھا۔

فلم کے خاتمے تک ہم دونوں بڑے بہترین دوست بن چکے تھے۔ پرکاش رائے کوٹ کی ایک کمزری فیملی کا لڑکا تھا، لدھیانہ میں ملازمت کرتا تھا اور یہاں ایک کرائے کے کمرے میں رہائش رکھتا تھا۔ ابھی تک میں نے ہی اس سے سب کچھ پوچھا تھا، اپنے متعلق سوائے اپنے نام کے اور کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں اسے زبردستی اپنے ساتھ ہوٹل میں لے آیا۔

"اسی ہوم" کے ڈرنے اسے میرا اور بھی گردیدہ کر دیا۔ اپنے کمرے میں اس کے لئے میں نے دلائی شراب کے دو بہترین، بیک منگوا لئے تھے۔ "تین سال تک اگر میں نے اسے چھوا بھی تو میں مر جاؤں گا" شاید تم یقین نہ کرو میں کینسر کی پہلی سٹیج سے زندہ واپس پلٹا ہوں۔" میں نے اپنے سطلے میں معذرت کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"سہارا جی میرے لئے ایسی خاص ضرورت بھلا کیا تھی؟" اس نے متحیرانہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

"تم میرے صہیل نہیں پرکاش میرے دوست بھی ہو۔ مجھے بیشہ اچھے دوستوں کی تلاش رہتی ہے، میں ایک الجھن میں گرفتار ہوں اسی لئے وہاں سے یہاں آیا ہوں۔"

"آپ کچھ کیسے تو شاید۔۔۔۔۔" اس نے فخر و اوجورائی چھوڑ دیا۔

دراصل میں ایک خاص مشن پر یہاں آیا ہوں، ہمارے گھر ایک رشتہ آیا ہے۔ لڑکا ایئر فورس میں ملازم ہے، میں نے اس کی شکل ابھی نہیں دیکھی کیونکہ رشتہ گھروالوں نے میری غیر موجودگی میں کیا ہے۔ لڑکے کا نام اور ریک میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ آج کل

”بلو اڑو“ ہوائی اڑے پر کام کر رہا ہے۔ میں نے دہلی میں اس کے متعلق ایک پریشان کن خبر سنی ہے جس کی تحقیقات کرنے آیا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس کی لاعلمی میں ہو جائے۔ اگر اسے پتہ چل گیا اور لڑکا بھی ٹھیک ہی نکلا تو خواہ مخواہ ایک اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ میں نے بلاآخر اپنے منصوبے کے مطابق ایک کہانی گھڑ لی تھی۔

”ارے بس اتنی سی بات، میرا کزن وہاں کام کرتا ہے۔ رائے کوٹ کے کئی لڑکے وہاں ملازم ہیں ان کے ذریعے.....“

”یہی تو سارا مسئلہ ہے میں صرف ایک قتل احمد آدمی چاہتا ہوں جو مجھے لڑے پر لے جائے اور اسے دور ہی سے دکھا دے، بقی میں جانوں اور میرا کام۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ اس فکر کو بالکل ذہن سے نکل دیں، کل آپ کا کام ہو جائے گا۔“ اس نے بڑی محبت اور جوش سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

”بہت شکریہ پرکاش میں تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔“

میں نے ہوٹل انتظامیہ کو اپنے کمرے میں ایک فالتو بیڈ لگانے کا آرڈر دے دیا تھا اور وہ رات پرکاش نے ”نہ نہ“ کرنے کے بلو جو میری ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے وہیں بسر کی۔ اب ہم دونوں کے دوست بن چکے تھے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ دنیا میں اتنے عظیم اور نیک انسان بھی پائے جاتے ہیں!

صبح پرکاش ہاتھ کرتے ہی چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی واپسی ہوئی، وہ کام سے چھٹی لے کر آیا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے ہی رائے کوٹ روانہ ہو گئے۔ پرکاش کے گھر والوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نجانے اس نے میرے متعلق کیا کیا انہیں بتایا تھا کہ وہ لوگ میرے آگے بچھے جا رہے تھے۔ ہر دوسرا پہلے سے بڑھ چڑھ کر میری خدمت کر رہا تھا۔ ہندو معاشرے میں پردہ نام کی کسی چیز کا تصور نہیں پایا جاتا۔ جلد ہی ہم سب آپس میں گھل مل گئے۔

شام تک میں اور پرکاش رائے کوٹ میں گھومتے رہے۔ اس اثناء میں، میں نے ارد گرد کے علاقے میں قائم شدہ تنصیبات کا بخوبی جائزہ لے لیا تھا۔ پرکاش کے والد کی ایک کٹارہ سی موٹر سائیکل تھی جس پر ہم رائے کوٹ کے ارد گرد دھماقی علاقے میں گھومتے رہے۔ موٹر سائیکل میں خود چلا رہا تھا اور جن بوجھ کر ایسے راستوں پر سبز کر رہا تھا جہاں موٹائیل ریڈار سسٹم یا اینٹی کرافٹ گنز کی موجودگی کے امکانات زیادہ تھے۔ پہلے ہی مرحلے پر قدرت نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کے اس انعام پر جو پرکاش کی صورت میں مجھ تک پہنچا تھا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور پچھلے دو تین روز کی کلفت کلی طور پر ختم ہو گئی۔

دشمن کی اس علاقے میں نقل و حرکت میری نظروں کے راستے میرے ذہن میں محفوظ ہو چکی تھی اور اب کسی بھی وقت کانڈ پر نخل ہو کر میرے ملک تک پہنچ سکتی تھی۔ دن بھر ہم نے جی بھر کر آوارہ گردی کی، شام کو اس کا کزن سالگ رام ڈیوٹی ختم کر کے گھر آگیا۔ وہ ہوائی لڑے کی ایک درکشپ میں کام کرتا تھا۔ پرکاش نے بڑی گرجوشی کے ساتھ میرا تعارف اس سے کروایا۔ اس کا عتابانہ تعارف مجھے پہلے ہی اچھی طرح حاصل تھا اور اس کی ہی نہیں بلکہ بھارتی لوگوں کی سب سے بڑی کمزوری میرے بریف کیس میں موجود تھی۔ دلائی شراب کی بوتل کی ایک جھلک نے اسے میرا تاجدار بنا دیا اور یہ جھلک میں نے ایک خاص طریقے سے اہانک بریف کیس کھولتے ہوئے اسے دکھائی تھی۔

”مہاراج جی شیش درنام کے دو تین آفسریں، آپ کچھ ان کے متعلق بتائیے۔“ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”یار تمہارا دماغ خراب ہے کیا اگر یہ اس سے واقف ہوتے تو خود ہی نہ چلے جاتے۔“ پرکاش نے جو اس سے خاصا بے تکلف تھا، اسے کہا۔

”ٹھیک ہے مہاراج جی میں باری باری سب سے کسی بہانے آپ کو ملا دوں گا، اپنے سبھی یار ہیں۔“ اس نے ایک مخصوص انداز سے آگے دہاتے ہوئے کہا۔

”شکریہ بھیا، تم نے تو میرے سر سے اچھا بھلا بوجھ اتار دیا ہے۔“

رات کو دونوں جی بھر کر شراب نوشی کرتے رہے، میرے متعلق گھڑا گھڑایا بلانہ پہلے ہی موجود تھا، اس لئے کسی نے مجھ سے اصرار نہیں کیا۔

رات میں نے رائے کوٹ میں پرکاش کے گھر پر بسر کی۔ اگلے روز سالگ رام تو صبح صبح اٹھ کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا، ہمیں بعد میں آنے کے لئے کہہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ بھی اس کے پیچھے جا رہے تھے۔ گاڑی روم میں ہماری ملاقات سالگ رام سے کرائی گئی۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ درکشپ میں لے گیا۔ سالگ رام کی اپنے آفسرانچارج سے گاڑی چھٹی تھی، اس لئے کسی نے اس کی بات کانٹوس نہ لیا۔ ہر جگہ اس نے میرا تعارف اپنے کزن کی حیثیت سے کروایا جو دہلی سے آیا تھا جسے ہوائی لڑو اور جنگی جہاز دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔

ہر کوئی اپنی اپنی بسلا کے مطابق مجھے اور پرکاش کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ ”قرباً“ دو گھنٹے تک ہم ہوائی لڑے پر موجود رہے۔ اس اثناء میں، میں نے وہاں کی تمام جزئیات اچھی طرح ذہن نشین کر لی تھیں۔ سارا ہوائی اڈہ میرے سامنے تھا۔ وہاں موجود ایک ایک چیز میری نظر میں تھی۔ ان کو دیکھنے کے لئے دونوں شیش درما سے متعلق میں نے تحقیق میں خاصی سرگرمی دکھائی تھی

نور من لوگوں کو اپنے سچے ہونے کا یقین دلایا تھا۔
 ”اچھا یاد دہی مہیٹی تھادی“ تیسرے شیش دروازے پر کبھی مل لیں گے۔“ میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔
 ”لو کے پرسوں تک کے لئے رام رام۔“ اس نے مجھ سے بھی زیادہ گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

پرکاش کے ساتھ میں واپس آگیا۔ راستے کوٹ سے میں نے لدھیانہ اپنے ہوٹل کو فون کر دیا تھا کہ میں رات کو نہیں آؤں گا۔ ایڈوائس جمع ہونے کی وجہ سے وہ لوگ بھی مطمئن تھے۔ وہ دن بعد اتوار تھا۔ اس روز سالک رام کی بھی چھٹی تھی۔ میں اور پرکاش تو دہلیس لدھیانہ چلے آئے۔ سالک رام کو میں نے اتوار کی بڑی زبردست دعوت دی تھی۔ وہ میرا ”شکار“ تھا جس پر مجھے ابھی صحت کرنا تھی اور جس سے بہت سارے کام نکلنے کی توقع تھی۔ قدرت کے اس انعام کو میں کسی بھی صورت ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

لدھیانہ ہم شام کو پہنچے۔ دونوں سیدھے ہوٹل ہی گئے تھے جہاں چائے پی کر تازہ دم ہو کر ہم شہر میں گھومنے چلے گئے۔ میں نے پرکاش کو چوک اپنے لیے چھ ڈسے بزنس کے حلقے ایک کٹنی سارنگھی تھی اور اسے یہی بتایا تھا کہ اب میری مصروفیات صرف بزنس تک ہی محدود رہیں گی اور تین چار روز تک میں لدھیانہ سے اپنے بزنس کے معاملات طے کرنے کے بعد دہلی چلا جاؤں گا۔ اسی لئے اس نے مجھ سے اگلے روز یعنی ہفتے کے پروگرام کا نہیں پوچھا تھا۔
 رات گئے میں ہوٹل پہنچا تو ایک ”خوبصورت انجمن“ میری منتظر تھی۔ اپنے کمرے میں داخل ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے پر ایک شریفانہ دھک سنائی دی۔

”بس کم فن“ میں نے ہشیار ہوتے ہوئے کہا کیونکہ ایسے ہوٹلوں میں اجازت کے بغیر کوئی دروازہ بھی نہیں کھٹکتا کرتا۔ دروازہ کھلا اور ایک حوا زلوی اپنی تمام تر مشرسلاتوں کے ساتھ اپنے جلو میں خوشبوؤں اور دعوت کا ایک طوفان لئے اندر داخل ہوئی۔

”ٹھیکے دوم نمبر ایک سو تیس۔“ اس نے فخر و حور اچھوڑ کر بگڑپاش نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں اب سنبھل چکا تھا۔ وہی صورتیں تھیں یا تو وہ کوئی نکل گرل تھی یا بھری۔ آئی۔ ڈی کی خبر کیونکہ ایسے ہوٹلوں میں پولیس یا اٹھل جنس والے برادر است مداخلت کم ہی کیا کرتے ہیں۔ زیادہ تر کام انہی لڑکیوں ہی سے لئے جاتے ہیں۔ کچھ بھی تھا مجھے بہر حال اپنے دوسرے سے کسی شک کا افسار نہیں کرتا تھا۔

”کمرے کا نمبر اس کے باہر لکھا ہے۔“ میں نے بظاہر لاپرواہی کے انداز میں آرام کری پیٹے ہوئے کہا۔

”کوہ۔۔۔ مجھے کیا بیٹھنے کو بھی نہیں کہیں گے؟“ اس نے لواتے خاص سے میری طرف جھٹکتے ہوئے کہا اور میرا جواب نے بغیر میرے ہنک پر چبھ گئی۔

”ابھی اس بات کا فیصلہ تو ہوا نہیں کہ آپ میری مہمان ہیں یا کسی لوری۔“ میں نے کہا۔
 ”مہمانجی ہی آپ میں آگئی ہوں تو ماننا مہمان ہی سمجھئے۔“ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا پرس بھی قریبی میز پر پھینک دیا۔

”آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے کے قریب کھڑے ہوئے ہوئے کہا۔

”خواتین سے ایسے تو بات نہیں کی جاتی۔“ اس نے اٹھ کر میرے قریب آنا چاہا۔
 جاں پہلی خاصی مشکل تھی۔ میرا حتی رویہ بھی انجمن کا باعث بن سکتا تھا۔ میں بھارتی معاشرے کے لئے درکار ہونے والی تھی۔ مجھے بہر حال اپنے آپ کو اس ماحول میں رکتا تھا۔ وہ کچھ بھی ممکن تھا لیکن میرے مقصد اور مشن کی عظمت میرے راستے میں مائل تھی۔

”بہی بی کیج کے لئے تو مجھے ٹھیکے“ میں نے ایک دوست کو وقت دے رکھا ہے۔
 آپ سے پہلے۔۔۔“ میں نے خود آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھیک ہے مہمانجی میں کسی کے دھندے کو خراب کیوں کروں لیکن۔۔۔“

”ہاں ہاں تھادی شپ تو بہر حال ہے۔“ میں نے دس دس کے دلوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

”ٹھیک ہو قاریور وڈن۔“ (آپ کے آنے کا شکریہ) میں نے بڑے احرام سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا اس کے جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔



صبح اٹھ کر میں نے دیوار ہوٹل لائے کا رخ کیا۔ میرا مشن ابھی نامکمل تھا اور جس نوعیت کی اطلاعات مجھے درکار تھیں ان کے لئے مجھے اکیسے ہی جانا تھا۔ بند کی صبح ایک مرتبہ پھر میں ایک دہائی کھیارے کے لباس میں ہوٹل لائے کی طرف جا رہا تھا۔ بس سے میں لڑے سے قریب۔ وہ میل پیچھے ہی اتر گیا تھا۔ یہ فاصلہ میں نے پیدل ہی طے کیا تھا۔ اس وقت میرا طبع اور شکل ایسی تھی کہ پرکاش بھی غور سے دیکھنے پر ہی پہچان سکتا تھا۔ میرے سر پر لگی ہاتھوں کی دھگ نور بدھی ہوئی شیوہ ہاتھ میں پکڑی چار لائے کی درانی نور کمرے کے ساتھ کدھرے پر رکھی ہوئی

کچیل سی چلور نور تن پر میلے کپڑوں کی وجہ سے دیکھنے والا پہلی نظری میں مجھے کوئی گھسیارا سمجھ کر نظر انداز کر سکتا تھا۔ بس کے سر کے دورن میں آخری سیٹ پر ایک کونے میں جہاں اکثر کوئی بد قسمت سواری ہی بیٹھا کرتی ہے، سٹ گیا۔ اس کے بلو جود سارے راستے مجھے بس میں سوار ہونے اور اترنے والوں کی فضیلی نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک تو میری شکل ہی اچھوتوں والی تھی، پھر اچھوت بھی نچلے درجے کا بھلا کوئی برہمن میرا بس میں سوار ہونا کیسے گوارا کر سکتا تھا۔

بس کا کنڈیکٹر مجھے تمام راستہ گلیوں سے نوازتا آیا تھا۔ یہ بات اپنے بزرگوں سے سنی تھی کہ ہندو بچ جاتی کے لوگوں کو انسانیت کے زمرے میں شمار نہیں کرتے لیکن انسانوں سے انسانوں کا اتنا کرب ناک سلوک کہاں دیکھنے میں آتا ہے؟ ہندو معاشرے کے اس مکروہ ترین روپ کو دیکھنے کے بعد ان کے خلاف میری دلی نفرت دوچند ہو گئی۔

پنجاب کے اکثر علاقوں میں کچھ لوگ کیتوں کے کنارے لگی گھاس کاٹ کر اسے قریبی منزلوں میں یا پھرتا کٹے والوں کے ہاتھ فروخت کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ میں اس وقت ایسے ہی لوگوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔

ہوائی لٹے کے گاڑ دوام کے سامنے سے جو سڑک کے کنارے کچھ خاصلے پر بٹا ہوا تھا، گزر کر میں کچھ آگے نکل آیا۔ میری بے چمن نظریں گاڑ دوام کے ارد گرد پھیلے ”انڈین اریا“ کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ ہوائی لٹے کے ارد گرد دیسے تو چاروں طرف اپنی کرافٹ تھیں نصب تھیں لیکن ایک جگہ خصوصی طور پر کچھ نئے قسم کا اسلحہ دیکھ کر میں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے اور ایک یونٹ کے نزدیک کچھ فاصلے پر بنے کیتوں کے کنارے لگی گھاس کاٹنا شروع کر دی۔ گھاس کاٹنے کا عمل صرف میرے ہاتھ انجام دے رہے تھے، میرا ذہن اور آنکھیں کھل یکسوئی کے ساتھ اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔

وہ سرد جنگ کا دور تھا۔ آکاش والی اپنے پروگراموں میں اکثر شور مچاتی رہتی تھی کہ پاکستانی جاسوس بھارت میں خاص طور پر مشرقی پنجاب، راجستھان اور جوں کشمیر کے علاقے میں گھس آئے۔ ”ان کی لٹاں لٹاں پھپھن ہوتی ہے، کسی پر بھی شک گزرے تو قریبی پولیس اسٹیشن پر اطلاع کیجئے وغیرہ وغیرہ۔ اب صورت حال کچھ ایسی بنی تھی کہ ان تمام علاقوں میں خاص طور پر سرحدی اضلاع اور ”ذلع“ سے متعلق علاقوں میں لوگ خلو خلو چکے ہو گئے تھے۔ آئے روز کسی نہ کسی فقیر یا ملک کی بستی آئی رہتی۔ پہلے تو انہیں پکارتے ہی دھماکی مارنا شروع کر دیتے اور پولیس اسٹیشن جانے کی نوبت عموماً اس وقت آیا کرتی جب وہ اس بے گنہ کار مار کر

بھر کس نکل دیتے تھے۔

ہوائی لٹے کے ارد گرد واقع دھاتوں میں یہ دبا کچھ زیادہ سی پھیل چکی تھی، گاڑی میں کسی اجنبی چہرے کو دیکھ کر اس پر جرح شروع کر دی جاتی۔ جب تک اس کا کوئی شیشا نہ نکل آئے اس کی جان نہ چھٹی تھی۔ میرے ساتھ بھی یہی ملوث گزرا۔

میں ارد گرد کے ماحول سے لاتعلقی اپنے کلام میں گمن تھا۔ وہاں موجود کسی فنی جون کو تو مجھ پر شک نہ گزرا۔ قریبی گھاس کے دو سکے جو سیکورٹی کے آدمی تھے، اس طرف آنکے اور مجھے ان کی آمد کا احساس اس وقت ہوا جب وہ میرے سر پر موجود تھے۔

فرار کی تمام راہیں پہلے ہی مسدود تھیں۔ چاروں طرف فوج ہی فوج۔ سڑک پر ہوائی لٹے کے ملازمین کی آمد رفت جاری تھی اور میرے سر پر سیکورٹی کے دو افراد مسلح تھے۔

”کون ہو تم۔“

”کیا کر رہے ہو۔“

دونوں نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”مدراج جی مسکین آدمی ہوں، گھاس کاٹ رہا تھا۔“ میں نے اپنی دانست میں انہیں کھل جواب دے دیا۔

اس اثناء میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ تھیلہ میرے ہاتھ میں پکڑا تھا، جبکہ درانی وہیں کئی ہوئی گھاس کے پاس رکھی تھی۔

میرے ہاتھ میں تھیلے میں سوائے ایک کھپنی اور چلور کے اور کچھ نہیں تھا، لیکن ان دونوں جہاں آکاش والی بھارتی عوام کو دارنگ دے رہی تھی وہاں بھارتی اخبارات نے بھی پاکستانی جاسوسوں کے متعلق عجیب عجیب افواہیں لوگوں میں پھیلا رکھی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم بات یہ بتائی جاتی تھی کہ جاسوسوں کے پاس تھیلیوں یا ان کے کپڑوں میں خطرناک بم ضرور چھپے ہوئے ہوتے ہیں، ان سے ہوشیار رہیے۔

دونوں شاید مقامی سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی تھے جن کی ڈیوٹی ہوائی لٹے کے ارد گرد دھاتوں میں لگی تھی کہ مشجبہ لوگوں پر نظر رکھیں۔ مجھے مشجبہ سمجھ کر وہ چلے آئے تھے لیکن برہ راست ہاتھ ڈالنے کو تیار نظر نہیں آتے تھے۔ بھارتی ریڈیو اور اخبارات کا پریکٹکٹہ میرے کلام آگیا۔

”کھل رہے ہو؟“ ایک نے پولیس کے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

”کوئی مدراج جی۔“

١٣١٩

”پرکش میری زندگی کا ایک حصہ سفر کی نذر ہو چکا ہے۔“ سینکڑوں لوگ ملے اچھے بھی برے بھی لیکن نجانے تم میں کیا بات نظر آئی ہے کس..... میں نے کافی پہلے سے ہوئے گھٹو کے لئے تمہیں دیکھا تھا۔

"ملنے کا مطلب سلاخی ہونا ہے اور کیا ہو گا؟ کبھت میں وقت پر آن مرے۔"

"سب چلے گئے" اس نے توبہ شکن انگلیاں لپیٹے ہوئے کہا۔

"نہلغ خراب ہے کیا؟" فن کے طفیل تو اپنا دل دلیا چل رہا ہے۔ اس سے بھی چھٹی کروٹ کی کیا؟" اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہے میں فوراً بولا۔

"نکل تک کے لئے آخری مرتبہ سٹاپ۔" میں نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔

"نکل کوئی بھلا نہیں چلے گا ہاں۔۔۔ میرا دم نمبر ۱۹ ہے" وہاں پہلے آؤنگ "اس نے جلتے جلتے مجھے ہانڈ سے پکڑ کر بھٹکا دیا۔

"اچھا اچھا اب رام رام۔" میں نے خوفزدہ ہونے کی ایکٹنگ کی اور اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے چل دیا۔

میرے کمرے کے قریب ایک بے ہودہ اشارہ کر کے وہ آگے بڑھ گئی اور میں اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"کیا بات تھی بھیا؟ کون تھا؟" پرکاش نے پریشانی سے پوچھا۔

"تھی یا ایک بلا" بچی مشکل سے جان چھڑائی کبھت جان کو آگئی تھی۔"

"لو" وہ بات سمجھتے ہوئے مسکرا دیا۔

"بچی ہوم" میں وہ میری آخری رات تھی۔

صبح اٹھ کر میں اپنے "والدہ" سے صاب بے باقی کرنے اور اپنا چہرہ نکھرانے کے لئے اپنے شہر کو چل دیا اور پرکاش اپنے کام پر چلا گیا۔ میں نے تین روز کے بعد واپس آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔

لوٹنم

تین دن میں نے بھارت کے تین مختلف شہروں میں گزارے اور فن تین دنوں میں 'میں نے محکمہ پھر کر انڈین ہوائی کی نقل و حرکت کا بھرپور جائزہ لیا اور پونم چوتھے روز میں ایک نئے موسم کے ساتھ رائے کوٹ کی طرف عازم سفر تھا۔

وہ پہلے کا روز تھا جب میں رائے کوٹ کے ایک محلے میں پرکاش کے بھونے سے گھر کے باہر گئی تھی کاشن دیا کر کسی کی آمد کا خطرہ تھا مجھے علم تھا کہ پرکاش اس وقت گھر پر نہیں ہو گا اور رات گئے وہ لدھیانہ سے آئے گا اسے میری آمد کی خبر تو تھی لیکن اتنی جلدی میرے آنے کا علم نہیں تھا۔ میں دانستہ ایسے وقت آیا تھا تاکہ پرکاش کی غیر موجودگی میں اس کے گہروالوں کے اپنے ہارے قائم کروں تاثرات کا میں خود اندازہ کر سکوں۔ اس سے پہلے اس کے گہروالوں سے ملاقات ہو تو بچی تھی لیکن سرسری سی۔

ہندو معاشرے میں چونکہ یہ وہ نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی اور مشرق کی روایتی شرم و حیا کا کم از کم حصوں کی حد تک جوازہ نکل چکا ہے اس لئے کسی بھی گھر میں کسی اجنبی کی آمد پر کوئی نہیں چونکا۔

دروازے کے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی 'میں سنبھل کر کھڑا ہو گیا لیکن دروازہ کھلے پر جس صورت سے سامنا ہوا اسے دیکھ کر اپنا آپ تو کیا ایمان تک ڈگکاتا محسوس ہونے لگا۔

"ہی۔۔۔؟" اس نے ایک خاص انداز سے اپنا ایک ہاتھ دروازے پر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"پرکاش سے ملا تھا۔" میرے منہ سے بمشکل ہی نکل پایا۔

"وہ تو نہیں ہیں۔" اس کی جھکی جھکی آنکھیں مختصر سے جواب کے ساتھ انھیں اور قیامت دعا کیں۔

"مانا ہی۔۔۔؟"

"ہاں؟" وہ تو ہیں آپ کا شیوہ نام؟" گردن کو قدرے خم دیتے ہوئے اس نے پوچھا۔
"پر کلاش! میرا نام بھی پر کلاش ہے۔"

"مٹا کچھ میں ابھی آئی۔" وہ اندر جانے کو مڑی اور قیامت کی چال چلتی سنانے لگے پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ بالکل ایک منٹ کے بعد ہی اس کی دوبارہ آمد ہوئی۔

"آئیے!" اس کا ایک لوائے خاص سے جھک کر اشارہ کرنا مجھے پھر تڑپا گیا۔ میں مسرور سا اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ گھر میں پر کلاش کی بیاں آگئی ہی موجود تھی۔

"پوسٹ لاکوں ماما جی۔" میں ہندوانہ طریقے کے مطابق جھکتے ہوئے انہیں پرکھ گیا۔

"جگ جگ جیو" ماما جی نے مجھے ایسے پیار سے دیکھا جیسے وہ پہلے سے میری شہرہ ہوں۔

"پونم! مل پانی کروا دو میرے بچے کو۔" انہوں نے اسی دشمن اعلان سے کہا جو ابھی تک مجھے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ پونم ہے بیٹا میری بھانجی۔" سالگ رام کو تو تم جانتے ہی ہو اس کی بہن۔ اور یہ میرا بیٹا ہے پر کلاش بھائی۔" دونوں کے تعارف کا مرحلہ بھی ماما جی نے طے کر دیا۔

"جست آند ملا۔" آپ سے جانکاری ہوئی۔" میں نے اس کے نسلک کے جواب میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی۔" چاند چمرے کی چراغ آنکھوں نے لبوں پھونکا۔

پر کلاش کے بتاؤ پر منٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ اپنی سروس کی مکملی فن کے پاس پر کلاش ایک کھانا سی سوز سائیکل، چھوٹا سا مکان اور شہدار جیون ساتھی کی شکل میں موجود تھی۔ یہ تو علم نہیں کہ سیاست میں حصہ لینا انہوں نے کب سے شروع کیا تھا لیکن فن کی پیشکش میں رکھی فائدہ لو سرخ جلدوں والی کتابیں فن کے سوشلسٹ ہونے کی چٹلی کھا رہی تھیں۔ وہ رائے کوٹ کی مقامی کیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بھی تھے اور اپنا زیادہ وقت وہیں دفتر میں ہی گزارا کرتے تھے۔

ساتھ والے مکان میں فن کی سلی رات تھی۔ سالگ رام کی بیاں جو بیوہ تھی، سالگ رام کا ایک چھوٹا بھائی اور ایک بہن تھی۔ پونم نے مل ہی میں ایک ایس۔ سی میں داخلہ لیا تھا اور کلچر پڑھنے کے لئے اسے مددگار لکچرار بنانا تھا۔ رائے کوٹ میں ایک ڈگری کالج ضرور تھا لیکن وہاں سائنس کی کلاس نہیں تھی۔ یہ دونوں کتبے آپس میں اس قدر مل جل کر رچے بٹھے کہ فن کے ایک ہونے کا لگن گزارنا تھا۔ سالگ رام کی محنت اور اس کے سوردکشاں والد کی بخشش سے فن کی بھی جیسی گزر رہی تھی۔ پونم زیادہ وقت اپنی آنٹی کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔

مجھے علم نہیں کہ میری آمدت کے قہے جو اس کے بھائی اور کزن نے دونوں گھروں کو بوجھا چاکا کر خانے ہوں گے۔ انہوں نے انہیں متاثر کیا یا پھر میری "درد بھری داستان" نے۔ ایک بات ہر حال میں تھی کہ جب اسے میری اصلیت کا علم ہوا تو میں نے اس کی گہری گہری ہڈی آنکھوں میں اپنے لئے وہ جذبات سوجزن دیکھے تھے جس کی توقع ایک معمول فوٹو فن لڑکی سے کی جاسکتی ہے۔

مجھے "مل پانی" پونم نے کر دیا۔ یہ دھب حسن تھا یا میرا احساس کثرتی کہ ابھی تک میں اس سے کل کر بات نہ کر پاتا تھا۔ اسے رکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چیز مجھ سے چھین گئی۔

وہ روایتی ہندو لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس کی گفتگو کا مخصوص انداز، نپا علاقہ اپنے واسن میں وہ مخصوص جیواری اور رک رکھتا سیٹھ ہوئے تھا جو پنجاب کی روایتی خیاںوں کے پاس ملتا ہے۔

محبت میرے سلیس حیات کا کوئی اختیاری حصہ نہ تھا نہیں جسے میں اپنی مرضی سے رکھتا یا چھوڑ دیتا۔ میرے دل و دماغ میں ایک زبردست جنگ شروع ہو گئی، جس کا انجام ہر حال دل کی فتح کی صورت میں نکلا۔ مجھے اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ سب سے پہلے رنگ کی اس گہری آنکھوں والی لڑکی نے میرے دل و دماغ پر پہلی نظر میں بڑے گہرے اثرات مرتب کئے تھے اور رات کو پر کلاش کی آمد تک ایک آگ سی دل میں برابر لگی رہی تو میں نے اپنے شعور کی تمام زمکروائی کے ساتھ اس بات کو قبول کر لیا کہ میں پونم کی محبت کا سیر ہو چکا ہوں۔

اس انعام میں ہمارے درمیان باتوں کے ایک دہار ہو چکے تھے لیکن میرے مختصر سوالات اور اس کے مختصر جوابات نے شاید اسے بھی اس بات کا احساس دلایا تھا کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں۔



شام کو پر کلاش آیا تو آتے ہی مجھ سے پلٹ گیا۔ اس کی خوشیوں میں مزید اضافہ فن خوبصورت قیصوں نے بھی کیا تھا جو میں اس کے لئے لایا تھا۔ چوٹی کے لئے بیاری دھرتی اور کرتے کے علاوہ ماما جی کے لئے ایک قیمتی قدرے سلو ساڑھی نے میرا فن غما بوجھا دیا۔ پونم سب کی خوشیوں کی اس طرح شرکت کر رہی تھی جیسے وہ بھی ہمیں میں سے ہو۔ میں نے پر کلاش کے لئے خرید کیا ہوا لیڈر سالگ رام کے لئے کہہ کر اسے سوپ دیا، لیکن میری چوری اس نے ہی نہیں پر کلاش نے بھی چھ لیں۔

رات کو پوری آسے تو مجھ سے ہوں ملے جیسے کوئی اپنے نگے بیٹے سے ملتا ہے۔ میں نے بلواڑے والے معاملے کے متعلق تادیباً عقد "وہ میرے ڈیڈی نے زبردستی کی بلا میرے نگے والی تھی کہ میں اپنی سوتیلی بہن کے سنگیت کا حفرافہ معلوم کرتا پھروں۔" میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ میرے بھتیجے سے متعلق مجھ سے کبھی کوئی بات نہ کریں، میں اب وہ سب کچھ بھلا دیتا چاہتا ہوں اور صرف اپنے حل اور مستقبل کے حوالے سے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنے پاس موجود ۲۰ ہزار روپے کیش کی صورت میں، میں نے پوری کی بھولی میں ڈال کر گویا انہیں لوٹ لیا تھا۔

"پوری! اگر آپ نے واقعی مجھے دھرم پڑھانا ہے تو میری ہر چیز پر سب سے پہلے حق آپ کا ہے۔ ہم لہ میلانہ میں پھونسی بی بلاسک ایڈمنسٹری لگا کر حکم شروع کر دیں گے۔ پرکاش کو اس حکم کا خلاصہ تجھے ہے، میں اچھا بیٹا ہوں اور سارا بھارت محکم چکا ہوں۔ آپ کا آئینہ بد حاصل رہا تو جلد ہم کسی قتل ہو جائیں گے۔" میں نے ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "میں میں کیونست ہوں، مذہب پر یقین نہیں رکھتا، لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے پہلے کسی جنم میں ہم سے کوئی اچھا کام ہوا تھا جس کا انعام پر ملتا ہے ہمیں تیسری صورت میں دیا ہے۔ آج سے تم ہمارے نگے بیٹے کے سہن ہو، اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔" ان کی جذباتی حالت کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔

سب نے مل کر میری آرتی ادا دی اور ہم دھرم کے الوٹ بندھن میں بندھ گئے۔ مکان کا ایک کمرہ جو دوسری منزل پر بنا تھا اور پرکاش کے ذریعہ استعمال رہتا تھا مجھے آلات ہو گیا۔ میرا مختصر سامان وہیں رکھ دیا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب واقعی وہ لوگ مجھے اپنا فیملی ممبر بنانے لگے تھے۔

○○○

رات کو سونے کے لئے لیٹا تو پونم اپنی تمام تر حشر ملائیں کے ساتھ میرے تصورات میں آن بڑائی۔ میرے لئے فرار کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ اسے اپنے ذہن سے جھٹکنے کا یا راجھ میں نہیں تھا۔ میں پھر اسی کربک کیفیت سے گزر رہا تھا جس کا شمار صبح بھی کئی گھنٹے رہا تھا۔ میرے سہن ممکن میں یہ بات بھی نہ آئی تھی کہ جلدوں کی زندگی میں کبھی ایسا مرحلہ بھی آ سکتا ہے جب اسے اپنی تمام تر غرضیں اور بھتیجی بلائے طاق رکھ کر ایسے فیصلے قبول کرنے پڑتے ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے ایک کوسٹ منٹ ضرور کر لی کہ "پونم" کو اپنے فرائض کی دلوں میں رکھتے نہ بننے دوں گا اور بس۔۔۔ اس سے زیادہ میرے لئے ممکن نہ تھا اس فیصلے کے بعد

نگہ کی نیند سو گیا۔

صبح میری آنکھ ماتی اور پونم کی کھٹا کرنے کی آوازوں سے کھلی۔ پرکاش مجھے جا چکا تھا وہ ہو ہو اپنے باپ کی کاپی تھا۔ مذہب سے ہزاروں اسی کیفیت کا شمار جس سے ہر بھارتی نوجوان گزر رہا تھا۔ معاشرتی اورچ بچ اور اس کو ملنے والے مذہبی تحفظ نے بھارت کی نوجوان نسل کو مذہب سے باہر کر رکھا ہے۔

مجھے سمجھ تو کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کر رہے ہیں لیکن تواز کے سوز اور زبردستی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ پونم سوز و ساز کا حسین سنگم تھی۔ میرے کمرے میں سب سے پہلے دی داخل ہوئی۔

"اٹھنے کا نہیں کیا؟" اس نے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر نمسکار کرتے ہوئے کہا۔

"اگر بڑی دیر ہو گئی۔" میں نے سہلے رکھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ متد نہیں جانتے؟"

"جب دیر خود چل کر آجائے تو کیوں جتوں۔" مجھ سے رہا نہ گیا۔ میرے کے فکر سے وہ صحت کر رہ گئی۔ کیا ایک سرخ گھیرنے اس کے گلوں کا احاطہ کر لیا۔

"پہلے اکی ٹکس کے آپ یا بیٹھے پر؟" اس نے بھیچے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"آپ کو دیکھنے کے بعد سب بھوک پیاس شتم ہو گئی، فی الحال تو آپ سے باتیں کرنے کے علاوہ اور کسی چیز کو دل نہیں کر رہا۔ آپ کو دیکھ کر تھلے کیا ہو جاتا ہے۔"

"آپ تو۔۔۔۔۔" وہ غور و فکر پر اچھوڑ کر بیٹھی گئی۔

میری یہ گفتگو ازلوٹا تھی یا غیر ازلوٹا، اس کا اندازہ میں نہ کر سکا۔ بس میرا جی چاہتا تھا میں پونم کو کسی نہ کسی طرح اپنے جذبات سے آگاہ کر دوں۔ اس کا رد عمل کیا ہو گا اس بات سے بالکل بے نیاز ہو کر، دھاری ملاکت و پارہ ہشتے کی میز پر ہوئی۔ سب نے اٹھنے ہی بجٹہ گیا۔ پونم نے رسوئی سنبھل رکھی تھی اور زیادہ تر گھٹا پکا اسی کے ذمے تھا۔ بجٹہ کرتے ہوئے اس کی سرگھیں آنکھیں دو تین مرتبہ مجھ سے ٹکرائیں اور ہم دونوں اپنی اپنی نشوونما پر پہلو بدل کر رہ گئے۔

اتوار چھٹی کا دن تھا۔ ساگ رام کو اندر جی ڈیوٹی کی وجہ سے سینے میں بمشکل ایک چھٹی ملتی تھی۔ اس سے تو ملاکت نہ ہو سکی۔ پوری پرکاش اور میں ابھی تھک چکے تھے۔

پرکش نے اپنے دوستوں سے میرا تعارف کروا دیا تھا اور انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں وہیں رہوں گا۔ چوتھی کاچونکر رائے کوٹ کے سیاسی حلقوں میں ایک مقام تھا، اس لئے سب نے بظاہر میرا خیر مقدم کیا۔ ہر ہندو نوجوان کی طرح پرکش بھی شراب کو جڑ لاڈلہ تھا۔ جانا تھا کہ کم از کم چھٹی کے روز نہ پینا تو اس کے لئے دھرم بھڑٹ کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے ابتر سہرت کرتی وہ ایک مقامی ہوٹل کو چل دیا اور میں اٹھ کر مگر آگیا۔

دونوں بوزھیاں بچے میں ہوئی ایک مرتبہ کے انتہا شکار میں شرکت کرنے جا رہی تھیں، پونم ابتر رسی میں موجود تھی۔

”میں باتیں زیادہ کرتا ہوں، آپ برا تو نہیں مانتیں؟“ میں نے سوچ بختی دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ اس نے دوپٹے کا پلو مروڑتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی تو بہت سی باتیں کر چکی ہوں کل سے اب تک۔ پھر آپ تو مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔“

مجھ سے کوئی جواب نہ دین پڑا، چنانچہ خاموش ہو گیا۔

دل کی گھڑی کا دستور بھی زلزلہ ہے، میں داخل ہونے والا پہلا سوار ہی اس کا مالک بن جاتا ہے۔ میری طرح پونم کے ساتھ بھی یہی طبع گزرا۔ میرے غائبانہ تعارف اور دونوں کی ملاقات نے ہی ہم دونوں کو ایک فن دیکھے، فن جانے لیکن دنیا کے مضبوط ترین رشتے میں جکڑ دیا۔ میری طرح وہ بھی نگرین بننے کے کھڑی تھی۔

سڑی دیر تک ہم دونوں کچھ نہ کہہ پائے، شاید ہم اس کیفیت سے گزر رہے تھے جس لحظہ کو جانتے ہیں اور جذبے زبان کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ایسی زبان جسے دل سے روا ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئی۔ میں بھی اپنے کمرے میں جا کر اپنی دھڑکنوں کا شمار کرنے لگا۔

شام کے وقت پرکش آگیا پھر مانا جی اور موسیٰ جی بھی آگئیں۔ سب نے کھانا اچھے ہی کھایا تھا۔ رات کو پرکش، پونم، اس کا چھوٹا بھائی ننڈو اور میں فلم دیکھنے چلے گئے۔ ساری فلم کے دوران ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ رہے، نہ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہوئی نہ مجھے بات کرنے کا حوصلہ پڑا۔ بالکل ہم نے اس دوران میں پانچ چھ قہروں کا چولہہ کیا۔

صبح حسب معمول پونم مجھے جگاتے آئی۔ اسے علم تھا کہ آج ہم لہ حیلانے جائیں گے۔ اس نے میرے لئے کپڑوں کا ایک جوڑا پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ اٹھان کرنے کے بعد ہم سب نے چائے پی کر کھانا کھا کر پونم کے ساتھ تمام بات چیت طے پاگئی تھی۔ اب ہم نے عملی طور پر کام کا آغاز کرنا تھا۔ اسی سلسلے میں آج میں اور پرکش لہ حیلانہ جا رہے تھے۔ پونم چونکہ جلدی

جائی تھی وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں بھی روانہ ہو گئے۔

لہ حیلانہ کے ایک پرانے محلے میں پرکش نے کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ ہم نے سب سے پہلے اس طبعی صحنے کے عجیب کمرے جو غلی تھے، حاصل کر لئے۔ پرکش پلاسٹک کے جوتے بنانے والی ایک فرم میں سپروائزر تھا۔ اس نے میرے کہنے پر اسی روز نوکری پر ”فلٹ“ بھیج دی۔ ہم نے دو تین مہینے خریدیں اور وہیں سے کارکنوں کا بندوبست بھی کر لیا۔ پرکش نے صرف دو چھوٹے چھوٹے لڑکے ملازم رکھے تھے۔ چار روز بعد جب ہم گھر واپس لوٹے تو باقاعدہ اپنا چھوٹا سا کارخانہ قائم کر چکے تھے۔ میں نے ایک کمرے کو سہا کر دفتر کا روپ دے دیا تھا اور باہر ایک خواہورت پروردہ، پرکش اینڈ پرکش پلاسٹک اینڈ سٹری کا لٹکا دیا تھا۔ فیکٹری کا لوگوں (افٹلر) میں نے موسیٰ جی اور مانا جی کے ہاتھوں کر لیا۔ سالگ رام چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے شرکت نہ کر سکا لیکن اس نے میرے لئے خاص طور سے شہہ کھانا میں (نیک تھانیں) بھیجی تھیں اور شدت سے خواہش ظاہر کی تھی کہ اس سے ملوں۔

چوتھی اور دوسرے سب لوگ کارخانہ قائم ہونے پر خوشی سے پھولے نہ ساتے تھے۔ پرکش کی واقعیت نے کام کیا اور ہمیں شروع ہی میں بڑا ٹھکرا آرڈر مل گیا۔ مانا جی اور موسیٰ جی تو ہمارے ہر میری ملازمین کے رہی تھیں۔ میں نے ان کے ”سوئے بھاگ“ جو جگا دیئے تھے، شام کو سب لوگ واپس چلے گئے۔ اس لٹھ میں مجھے پونم کے ساتھ کھنگو کا بہت کم سونہ ملا۔ پرکش اور میں وہیں رہ گئے۔ صبح کام شروع ہو گیا۔ پرکش کام میں جتا رہتا۔ ”دس دن ہم نے خوب محنت کر کے آرڈر کے مطابق مل تیار کیا“ پھر دھول کی چھڑیاں آگئیں اور دھول ملنے رائے کوٹ چلے آئے، جس پونم اپنی آنکھوں میں ہزاروں جلائے میری نظر تھی۔

○○○

رائے کوٹ پہنچنے ہی میں نے سالگ رام سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ہم قریباً شام کے وقت پہنچے تھے۔ رائے میں ہوا زور ہی اتر گئے۔ گاڑی روم میں، میں نے خصوصی بندوبست اور انتظامات خاص طور پر نوٹ کیے تھے۔ ہوٹل لڑے سے جاسوس کے فرار کے بعد وہ لوگ خامے چرکے ہو گئے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ خلاف معمول گاڑی روم پر سیکورٹی دہلیں نے پرکش کے کمرے کے کمرے میں ملیدہ کھانے کیے تھے۔ سالگ رام کو بھی وہیں بلا لیا گیا، آتے ہی وہ مجھ سے بھگت ہو گیا اور ہم دونوں کو ساتھ لئے اس جگہ آگیا جس میں وہ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میری بے تک نظریں اس لٹھ میں چاروں اطراف کا جائزہ لیتی رہیں۔ ایک ایک اہم چیز میرے دامن میں نقش ہوتی جا رہی تھی لیکن اب تک میں اس مخصوص جگہ تک رسائی حاصل نہ کر پیا

”کیوں؟“ اس نے اک لوائے دلہانہ سے مڑتے ہوئے پوچھا۔
 ”تمہیں بھگا کر لے جانا ہے۔“
 ”پھر تو ابھی آئی۔“ کہہ کر وہ چلی گئی۔

جوں جوں شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دیوالی کی تقریب اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی۔ پانچ چھ منٹ تک میں بچوں کی آتش بازی سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر پونم آگئی۔
 ”چلے شریمان جی، ہم بھی دیکھیں آپ کے تہوار۔“ اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کمد
 ”اس مرتبہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ رہنا۔“ میں نے موز سائیکل اشارت کرتے ہوئے کمد
 ”باتیں کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔“ اس نے میری پیٹھ پر ہلکی سی دھول جلاتے ہوئے کمد
 ”لور موضوع بدلنا تم سے۔“ میں نے گردن موڑتے ہوئے کمد
 اپنے خمرے کا خوشگوار ردعمل میں اس کے چہرے پر دیکھ تو نہ سکا لیکن میرے کندھے پر
 رکھے اس کے خوبصورت ہاتھوں کی لرزش سے محسوس ضرور کر لیا۔
 ”کمد کے ارادے ہیں مہاراج؟“ اس نے مجھے ایک دیرین سڑک پر موز کانتے دیکھ کر
 پوچھا۔

”انہو ہونے والے شور نہیں چلایا کرتے۔“ میں نے دور سے نظر آتے آری کے پورے
 پورے ویسکونٹر نظر میں جلاتے ہوئے کمد
 ”دوبلی یہ خوب دھونس ہے یعنی گردن بھی کٹوائیے لور مرحبا بھی کہئے۔“

موز سائیکل میں نے روک دی، سائے ایک خوبصورت سی پہاڑی نظر آ رہی تھی جو چھینا
 سیرگاہ ہی تھی لیکن یہ عجیب بات کہ وہاں کوئی نظر نہ آتا تھا شاید آری کے یہاں ڈیپلے ہونے
 کے بعد یہاں لوگوں کی آمدورفت ممنوع ہو چکی تھی۔ سردی اپنا جین دکھا رہی تھی۔ پونم نے
 کندھے پر رکھی شل کو مضبوطی کے ساتھ اپنے جسم پر لپیٹ لیا تھا۔ ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ
 ڈالے اسی طرف چل دیے، جس تفریق گھ کے نزدیک مجھے آری کے ویسکونٹر نظر آرہے تھے۔
 عاتبا، وہ لوگ بھی دیوالی کی وجہ سے شغل سے نوشی میں مصروف تھے، شاید ہی لئے ہمیں ان کے
 ارد گرد کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑک پر لگی لائٹس کہیں کہیں روشن تھیں، زیادہ تر بلب خراب
 تھے۔

”پونم تمہیں معلوم ہے ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے چلتے چلتے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”کیوں؟ تم نے پوچھا کیوں نہیں؟“ میں نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کمد

”پر کاش پو بسا لوقت مجھے بھی تمہاری کسی حرکت کا مطلب سمجھ نہیں آتا، مجھے تو کبھی کبھی
 تمہارے ہندو ہونے پر بھی شک ہونے لگا ہے۔“ میرا دل اچانک اس کے اس خمرے پر دھڑک
 پونم نے ایک لمبا سانس لیا اور دوبارہ بولی ”تم میں ان لوگوں جیسی بات ہے ہی کیا“ میں شراب
 سے اتنی غفلت کرتی ہوں، جتنی مجھے یم راج (شیطان) سے ہے لیکن مجھے حیرت ہوتی ہے تم ہندو
 نوجوان ہو لور شراب نہیں پیئے۔ تم نے ابھی تک مجھے کسی غلط حرکت کے لئے نہیں کہا، جب
 کہ ہمارے معاشرے میں محبت کا آغاز ہی ایسی گھٹیا حرکتوں سے ہوتا ہے یا تو تم اگلے جنم کے
 کوئی نوتا رہو جو ہمارے روپ میں پرگٹ ہو کر آگیا یا پھر۔۔۔۔۔۔“
 ”مگر حوا ہوں جسے خوبصورت لڑکیوں سے ڈیٹنگ کرنا نہیں آتی۔“ میں نے اس کا ہاتھ دباتے
 ہوئے اس کا خمرہ اچک لیا۔

”بہر حال پر کاش پو جب کوئی بھری کسی سے پیار کرتی ہے تو اسے اپنا شریر ہی نہیں اپنی آتما
 بھی سوچ دیتی ہے۔ مجھے چہلنے پھیلنے کتنے، جنموں سے تمہاری تلاش تھی، میرا آئیڈیل ایسا ہی
 تھا الجھا الجھا، سب سے الگ تھلک، جس روز پہلی بار میں نے تمہاری دھک پر دردناک کھولا تھا تو
 تم ہمارے گھر میں ہی نہیں بلکہ کھلے کواٹوں کے راستے میرے دل میں آن بے تھے، میری تلاش
 کھل ہو گئی۔ میرا حرم ہے پر کاش پو کہ تم کبھی میرا دوشوش گھلت نہیں کر دو گے۔“
 پونم کا لہجہ بڑا براہِ راست تھا، میں نے اس کی باتوں کا جواب نہ دیا۔ وہ واقعی عجیب و غریب قسم کی
 لڑکی تھی۔۔۔۔۔ ہم دونوں اب لن ویسکونٹر کے قریب سے گزر رہے تھے۔

سڑک کے کنارے آری نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ یہ سڑک ایک قصبے کو جاتی تھی لیکن
 آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔۔۔۔۔ ہم دونوں سڑک کے کنارے گئے خوبصورت بلغم میں
 ایک چتر کے بیچ پر بیٹھ گئے۔

چڑھتے چاند کی رات تھی، سائے کا سحر بخوبی نظر آ رہا تھا۔ میری آنکھوں کے راستے ویسکونٹر
 پر لدے سالن لور وہاں پہاڑی کے ایک طرف نصب ریڈار کے اینٹیا کی میڈلٹ دماغ پر نقش ہو
 رہے تھے۔ یہ نئی قسم کا اسلحہ تھا مجھے خوشی تھی، میں نے ایک خفیہ ہتھیار کا جو بھارتی فوج کے
 تصرف میں ہے کھوج لگایا تھا لیکن حیرانگی ہو رہی تھی کہ آخر اتنی اہم چیز کو اتنے غیر حفاظتی اور
 ناقص انتظام کے ساتھ نصب کرنے کی کیا تک ہے؟

پھر میرے دماغ نے اس سلسلے میں راہنمائی کی اور میں انڈین آری اعلیٰ جنس کی چال سمجھ
 گیا۔ ابھر جیسی ہونے کی وجہ سے چونکہ تمام آری کے نشانات وغیرہ تو ملی سے چھپے ہی ہوتے
 ہیں، اس کے علاوہ بھی ان حالات میں گھر کو مت اچھی طرح کیوں فلنگ کیا جاتا تھا اگر ان کے

گرد خاص پہرہ بھی لگا دیا جاتا تو اس علاقے میں موجود دشمن انہی جنس کو شک ہوتا لازمی تھا۔ شاید اسی لئے انہوں نے یہ طریقہ اپنایا تھا۔ اگر میں بھی ہتھیاروں کی خاص قسم کی سائنس پر غور نہ کرتا تو اسے انڈیا کی روایتی فوج کی کوئی مثالیں سمجھ کر نظر انداز کرتا۔

”تمہیں پا کر میں نے بہت کچھ پایا ہے پونم؟“ مجھ سے خوشی چھپائی نہ جاسکی اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

”ہی، اب ظاہر ہے آپ قلمی ڈائناگ ہی بولیں گے۔“ پونم کی ہنسی سے فضلوں میں سرلی تھنیں بچنے لگیں۔

ہم واپس موٹر سائیکل کی طرف آرہے تھے جب اچانک ہمارے پیچھے روشنی کا ایک طوفان سا اٹھل بکھل میں نے پونم کا ہاتھ پکڑ کر کنارے کی طرف کھینچا تو وہ مجھ سے ٹکرائی۔ ہم دونوں پر ہی اس ٹکرائو نے قیامت ڈھادی تھی، ابھی اس حادثے سے سنبھلتے ہی نہ پائے تھے کہ ایک جیپ قریب آ کر ٹھہر گئی۔ جیپ میں ایک سارجنٹ اور دو سپاہی بیٹھے تھے۔ شاید ہمیں مشتبہ جان کر آگئے تھے۔

”سنئے سماراج۔“ سارجنٹ عذابا ہلاری اصلیت جان گیا تھا۔

”سنایئے سماراج۔“ میں نے اسی لہجے میں قدرے شرقی سے جواب دیا۔ میرے دل کی حالت خدا ہی جانتا ہے۔

”اس سے پہلے آپ کی موجودگی اور دیوالی رات کی حسین رات تو ٹھیک ہے، لیکن یہ ماحول پریم کرنے کے لئے سازگار نہیں۔“ اس نے پہلے پونم کی طرف اور پھر سامنے لٹری کنوائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”لوہ مالی ڈیز آفیر! چھوٹا سا تو شہر ہے۔“ جین ماننے کوئی گوشہ بھی تو خالی نہیں ملا۔ محبت کے مارے میں چلے آئے تھے لیکن کیا مظلوم تھا کہ یہاں بھی..... میں نے بڑے سوگوار اور قلمی انداز میں جواب دیا۔

”اس ماحول کے لئے شاید سمجھئے، میرا ٹینٹ حاضر ہے۔“ وہ بھی کوئی محبت کا باراد کھلی دے رہا تھا۔

”دھن دلو آپ کا سماراج اب تو چلتا ہی چاہیے۔“ میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیوالی مبارک“ کہتے ہوئے اس نے جیپ دوبارہ شارٹ کر دی۔

”دیوالی مبارک“ ہم دونوں نے بھی ایک ساتھ ہی کہا۔

”مکدھے کا پتہ“ میں نے اس کے جلتے ہی کہا۔ ”گجنت نے اسی وقت آنا تھا۔“

”شکر کرو کوئی اچھا آدمی تھا ورنہ دیوالی کسی تھلے میں مٹا دیتا۔“ پونم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارا ساتھ ہو تو میں نرک میں بھی جلتے کو تیار ہوں۔“ میری بات پر پونم بے اختیار ہنس دی اور فضلوں کا حسن دھند ہو گیا۔

خاصی دیر تک ہم رائے کوٹ میں مختلف جگہ دیوالی کی رات سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ سارا شہر شراب کے نشے میں دھت تھا۔ سڑک پر دو تین مرتبہ ہمیں نوجوان لڑکوں نے گھیرا اور فحش فقرے کس کر جلتے کی اجازت دی۔ ایک مرتبہ تو میرا خون کھولا لیکن پونم نے مجھ سے دھن لیا تھا کہ میں لڑائی جھگڑا نہیں کروں گا۔ عجب طوفان بدتمیزی چاروں طرف پھا تھا۔ لوگ سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر بدھکیں مار رہے تھے۔ فضا میں چاروں طرف آگ ہی آگ پھیلی نظر آتی تھی۔ بچے بوڑھے جوان سب ہی آگ سے کھیل رہے تھے۔ شہر کے باہر سے ایک لمبا چکر کٹ کر ہم لوگ گھر پہنچے۔

”اگر سارا بھارت پاگل ہو گیا ہے تو کیا میں بھی کنویں میں چھلانگ لگا دوں۔“ انہوں نے ماما جی سے کہا۔

”ہرے رام، ہرے رام آج تو پرانا کو یاد کر لو۔ ایک دفعہ سارے جیون میں مندر کی شکل نہیں دیکھی۔ پنڈت کا بیٹا اور ایسی ایسی باتیں۔“

ماما جی اور پاپو جی کی خوشگوار بحث بڑی پر لطف ہوتی تھی۔ ”دیکھی تھی ایک مرتبہ جب تمہارے ساتھ بھاگ کر شادی کی تھی اور آج تک بچتا رہا ہوں۔“ انہوں نے ہنستے ہنستے کہا۔

”بچوں کے سامنے ہی کوئی شرم کر لیا کرو۔“ ماما جی نے موسیٰ جی کے پیچھے باہر جانے ہوئے کہا۔ ننڈو اور پونم بھی ان کے ساتھ ہی باہر چلے گئے۔ دیوالی کی رات مندروں میں خاصی پوجا پات ہوتی تھی۔ اب آدمی رات سے پہلے ان کی داہی نامکھن تھی۔ پرکاش اور سالگ رام بھی تھوڑی دیر بعد آگئے اور مجھے ساتھ لے کر چلے گئے۔ میں تو تقریباً ”مخند بعد ہی کھک کر گھر آ گیا کیونکہ ایسی لغویات میں اس سے زیادہ حصہ میں نہیں لے سکتا تھا۔

اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور ہولٹی لڑے کے اس خاص حصے کے متعلق سوچنے لگا جو ابھی میری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ وہاں پہنچنے کا خطرہ مول لئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا، میں نے پونم کی محبت کو اپنے فرائض کے درمیان دیوار نہیں بننے دیا تھا۔ کام بڑی اچھی رفتار کے ساتھ محفوظ طریقے سے انجام پا رہا تھا اور میں اپنے وطن کے لئے بھارتی انہی

جنس کے بچائے جاں کو توڑ کر اہم اطلاعات حاصل کر رہا تھا۔ یہ اطلاعات میرے وطن بڑی جانت اور محنت کے ساتھ پہنچ رہی تھیں۔

دوبلی کی رات کسی کو سونا قسمت سے ہی نصیب ہوتا ہے کیونکہ ساری رات پٹاخوں کی آوازیں جاں کو آتی رہتی ہیں لیکن میری آنکھ صبح جلد ہی کھل گئی۔ چاروں طرف شور مچا تھا اور گرد کے وہ مندر اور گردوارے جن میں سوائے پجاری کے اور کوئی گھنٹے کا ہم بھی نہیں لیتا تھا وہاں سے بھی گلوں کے پردے پھاڑ دینے والی۔ مجھوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ شہر کے لوگ ساری رات جاگتے رہے تھے اور آتشی بازی بھی مسلسل ہو رہی تھی۔

”دوبلی مبارک“ صبح پونم نے پرکاش کا نور میرا کیل اٹھا کر ایک کونے میں پھینکتے ہوئے کہہ

○○○

دوبلی آئی بھی نور گزر بھی گئی۔

۔۔۔۔۔ پونم کی کوئی بات میرے لئے اور میری کوئی بات بظاہر اس کے لئے پرانی نہیں تھی ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اس اثنا میں اچھی طرح جاں لیا، پہچان لیا تھا۔۔۔۔۔ اکٹھے جینے مرنے کے بیان ہندہ لئے تھے۔ مجھے اس کے کلچ اور دوروں تعلیم فارغ پیریڈ کا پورا پورا علم ہو چکا تھا۔ پونم نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں لہ میانہ میں اسے روزانہ ملا کر دوں گا۔

دھوپ اور چھاؤں

لہ میانہ پہنچنے کے دوسرے ہی روز ایک پیغام میرا منتظر تھا اور اب میں ایک اہم مشن پر ہندہ جا رہا تھا۔

ہندہ سرحدی علاقہ ہے۔ یہاں سے گرفتار ہونے والے غیر ملکیوں کو گورداسپور جیل میں رکھا جاتا تھا جس سے وہ لوگ تمدن پرستی سمجھنے کے لئے ہندہ آتے تھے۔ ہمیں اپنے ایک اہم ساتھی کو پولیس کی حراست سے آزاد کرنا تھا۔

دشمن ملک کی بھری پری پکھری میں سے اپنے کسی ساتھی کو انوار کے لئے جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ زندگی اور موت کا کھیل تھا جس میں موت کی جیت کے امکانات زیادہ ہی روشن دکھائی دیتے تھے۔ اس سلسلے میں اپنے مقامی دوستوں کی مدد حاصل کرنا ضروری تھا۔ میں نے پرکاش کو یہی ہمانہ کیا تھا کہ مل کا آرڈر وصول کرنے پر۔ پی کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ انتہائی معقول ہمانہ تھا جس کی آڑ میں مجھے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنا تھیں۔

میں اپنے طے کردہ پلان کے مطابق ہندہ آگیا۔ یہاں مجھے اپنے ایک دوست سے جو میرے ملک کی اٹھلی جنس کا خاص آدمی تھا ملاقات کرنا تھی۔

کسی بھی جاسوس کے لئے دوسرے ساتھی جاسوس سے ”ملاقات“ بڑا جاں جو کھوں کا کام ہے، کیونکہ وہ شخص حل ہی میں سرحد پار کر کے آیا ہوتا ہے اور اس بات کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے کہ وہ کہیں دشمن اٹھلی جنس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ اگر دشمن کسی ایسے شخص کو قابو کر لے جو ان کے ملک میں سکونت پذیر اپنے ساتھی کا کوئی پیغام وصول کرنے جا رہا ہے تو وہ ان کے لئے خصوصی تحفہ ہوتا ہے کیونکہ اس شخص کے ذریعے وہ پہلے سے ان کی سوسائٹی کے کافی اندر تک گھس کر محفوظ ہو جانے والے جاسوس تک جا پہنچے ہیں۔ نول تو اٹھلی جنس کا تفتیش کا طریقہ ہی اتنا قوت ناک ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی مرحلے پر گرفتار شدہ شخص ان کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اپنے ساتھی کا پتہ بتا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا خطرہ ڈبل ایجنٹوں کا بھی ہے جو دنیا کی قربان ہر اٹھلی جنس میں پائے جاتے ہیں اور تھوڑے سے ہتھیار کے

لالچ میں اپنے ساتھی کو گرفتار کروا دیتے ہیں۔

میں بجائے اس جگہ جانے کے جہاں مجھے اپنے ساتھی سے ملنا تھا، بیلا کے لاری لٹے پر چلا آیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے، صرف اس خاص نشستوں سے میں نے اسے پہچان کر اس سے پیغام وصول کرنا اور مل کر منصوبہ بندی کرنی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد مجھے بالآخر وہ ایک سرحدی علاقے کی طرف سے آنے والی بس میں سے اترتا نظر آیا۔ کلنی عجلت آدی تھا، خلاصاً چوکتا نظر آ رہا تھا۔ بس سے اتر کر اس نے بجائے لوہر اوہر اجنبیوں کی طرح دیکھنے کے چپ چاپ اپنی راہ لی۔

بس کے ارد گرد فوراً دو تین سیکورٹی والے اکٹھے ہو گئے تھے لیکن کیا مہل جو اس پر کسی کو ذرہ برابر بھی شک گزرا ہو۔ نووارد درمیانی عمر اور مضبوط جسم کا مالک ایک بوٹے سے قد کا آدمی تھا۔ میں نے بس سے اترتے ہی اس کا تعاقب شروع کر دیا لیکن لاکھ چلاک ہشیار اور میرے ہی ملک کا تربیت یافتہ ہونے کے باوجود اسے اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ قریباً دس پندرہ منٹ تک میں اسی چکر میں رہا کہ مہلا کوئی اس پر نظر رکھے ہوئے تو نہیں یا پھر ایڑیں اٹھیلی جنس والے اسے میرے لئے بطور ”چارہ“ استعمال تو نہیں کر رہے۔ ابھی ہماری ملاقات کے وقت میں دس پندرہ منٹ ہلتی تھی۔ نووارد لاری لٹے پر بیٹے ایک چائے کے منل میں جا گھس۔ اس کی دایہی عین وقت پر ہوئی۔۔۔ جیسے ہی وہ منل سے باہر نکلا، میں نے شدہ منصوبے کے مطابق اس سے ٹکرا لیا۔

”ٹھاکر مہراج جی بیلا آکر منل ٹھکانے نہیں رہتی دہلی والوں کی۔“ میں نے معذرت کرتے ہوئے اپنا مخصوص ”کوڈ“ تھرو کر دیا۔

”دہلی کی کیا بات ہے جناب، اچھا آپ کیا دہلی سے آئے ہیں؟“ اس نے بھی میرے ساتھ چلتے چلتے کہا۔

”سگریٹ ہو گا آپ کے پاس؟“ میں نے کہا۔

”ہاں نہیں ہے۔“ وہ بولا۔

”آئیے اور چائے پی لیں۔“ میں نے کہا۔

ہم دونوں نے مخصوص الفاظ بن قہروں میں استعمال کر کے ایک دوسرے کو اپنی شناخت کروا دی تھی۔ میں نے بھی اس کی طرح دہائی کپڑے پہن رکھے تھے اور ایک کپڑے کا تھیلا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا محل احوال دریافت کرتے لاری لٹے کے باہر پکھری کے نزدیک ایک ہوٹل میں بنے چھوٹے سے کیمپ میں جا بیٹھے۔

نووارد نے جس کو ”جسوت“ نام لٹا ہوا تھا، تمام تفصیلات سے مجھے ایک مرتبہ پھر آگاہ کیا۔ ہم نے یہ کام اپنے بھارتی دوستوں کی مدد سے انجام دینا تھا لیکن وہ بھی اس طرح کہ انہیں اس بات کی کٹھن کن خبر نہ ہو کہ جسے ہم پولیس سے چھیننے جا رہے ہیں وہ شخص کون ہے؟ کن کے نزدیک تو وہ خاص شخص ہمارے ملک کا ایک ماہر ہو سکتا تھا جس کے بھارتی پولیس کے قبضے میں رہنے سے تمام کاروبار کا بیڑہ غرق ہونے کا خطرہ تھا اور ہمارے بھارتی دوستوں کو مزید ”مل“ اسی صورت میں مل سکتا تھا جب ہمارا یہ اہم ساتھی رہا ہو کر پاکستان پہنچے گا۔

تمام تفصیلات اچھی طرح طے کرنے کے بعد ہم دونوں اٹھے اور ایک دوسری لاری کے ذریعے کن سبک بھارتی دوستوں کے ڈیرے کی طرف چل دیے۔ ہم لوگ وہیں رات گئے پہنچے تھے۔ ہمارے بھارتی دوست چرن سنگھ نے بڑی فراخ دلی سے میرا استقبال کیا۔ میرے ساتھی کو وہ پاکستان کے ایک ”محزے سبک“ کی حیثیت سے اچھی طرح جانتے تھے اور انہیں یہ بھی علم تھا کہ اسی محزے سبک کی وجہ سے وہ آج لکھ پتی بنے ہوئے تھے ورنہ وہ تو معمولی سے زمیندار تھے۔ جسوت نے میرا تعارف صوبہ سرحد کے بہت بڑے آدمی کے بیٹے کی حیثیت سے کروایا۔ چرن سنگھ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

”کیزمی دے گھر نارائن آگئے مہراج۔“ اس نے مجھ سے گرجوٹی سے بظلم ہوتے ہوئے کہا۔

چرن سنگھ کے ساتھی تین چار مرغ لے آئے، جنہیں میرے پاکستانی ساتھی جسوت نے حلال کیا اور چرن سنگھ نے انہیں پکوانے کے لئے گھر بھیج دیا۔ ہم لوگ تو جھکا نہیں کھاتے تھے لیکن وہ حلال ضرور کھا لیتے تھے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق مطلوبہ ساتھی جسے پولیس کی حراست سے آزاد کروانا تھا وہ اگلے روز تاریخ پیشی پر گورداسپور جیل سے بیلا آ رہا تھا۔ گورداسپور سے بیلا آنے والے ملہن کو پرائیویٹ بسوں پر لایا جاتا تھا۔ چرن سنگھ نے منصوبے کے مطابق دو آدمی فوراً روانہ کر دیے۔ انہیں تمام باتیں تفصیل سے سمجھا کر ان کے حصے کے کام سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ یہ دونوں چرن سنگھ کے اختیاری خاص آدمی تھے۔ ہم دونوں کو بھی چرن سنگھ نے رات گئے ایک پرائیویٹ کار کے ذریعے اس مخصوص علاقے میں پہنچا دیا تھا جہاں سے ہم نے اپنی کارروائی کا آغاز کرنا تھا۔

ہم نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے گورداسپور سے بیلا آنے والی سڑک کے ایسے حصے کو منتخب کیا تھا جہاں چرن سنگھ کا اپنا ایک مخصوص لڑو تھا اور وہ قریباً سارے کا سارا گھنٹوں اس کے ”خاص لوگوں“ پر مشتمل تھا۔ یہ گھنٹوں ”عموماً“ سبکوں کے گھنٹوں کے نام سے مشہور تھا

لور ہیل کے تکیں سفلگ کے علاوہ بھی بست سے غلط کام کرتے رہتے تھے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ہمارے آدمی کو کسی بھی پرائیویٹ لاری میں وہیں سے نو اور دس بیچ کے درمیان گزرتا تھا۔ لاری میں اس کے ہمرلہ گارڈ کے دو سپاہی اور ایک حوالدار موجود تھے جن کے پاس صرف ایک قمری ہٹ قمری کی رائفل تھی۔

قریباً "انھ بیچ اس جگہ کی چرن سنگھ نے اپنے پانچ چہ ساتھیوں کے ہمرلہ تاکہ بندی کر لی۔ اب ہم لوگ شدت سے اس خاص لاری کے منتظر تھے جس میں ملین ہمارے بھارتی دوست کے ہمرلہ آرہے تھے۔ ہمارا وہ ساتھی جسے اغوا ہوا تھا اسے جیل میں اطلاع مل چکی تھی اور وہ بھی اپنی بسلا کے مطابق تیاری کے ساتھ آ رہا تھا۔

قریباً ساڑھے نو بجے ایک حیرت انگیز موٹر سائیکل سوار نے اطلاع دی کہ ہمارے ساتھی پہنچے والے ہیں۔ ابھی بمشکل پانچ چہ منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک ایک بس وہیں پہنچ کر رک گئی۔ بس میں موجود چرن سنگھ کے دونوں ساتھیوں نے منصوبے کے مطابق کام شروع کر دیا۔ ایک نے ڈرائیور کی کینٹی پر ہتھول رکھ کر اسے بس روکنے کا حکم دیا جب کہ دوسرے نے بڑی پھرتی کے ساتھ پولیس کے سپاہی سے رائفل چھین لی۔

بس کے مسافر بھی سمجھے تھے کہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ نے ان کو لوٹنے کے لئے ان پر حملہ کر دیا ہے۔ بس کے رکتے ہی چرن سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے بڑی پھرتی کے ساتھ اس کے گرد گھیراؤ ڈال لیا۔ ہمارے بس میں موجود ساتھی نے انجن بند کر کے چابی اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اب ہمیں جو کچھ بھی کرنا تھا چند منٹ کے اندر کرنا تھا کیونکہ اس سڑک پر لاریوں کی آمد و رفت ہر وقت جاری رہتی تھی۔

ہم نے بس میں موجود پندرہ بیس سواروں کو نیچے اتارنے کا حکم دیا۔ ان میں پولیس کے سپاہی اور ہمارے ساتھی بھی شامل تھے جیسے ہی وہ نیچے اترا اس نے جھٹکا مار کر جھکڑی کو حوالدار کی ٹیٹ سے نکال لیا۔ چرن سنگھ کے ساتھی اس اثناء میں ان کے سروں پر رائفلیں تانے لگے۔ کڑے رہے۔ ہمارے ساتھی کے دونوں پاؤں میں بیڑی تھی۔ جسوت قریب ہی کھڑی جیب کی پچھلی سیٹ پر بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔

اب ہم لوگ دو گروپوں میں بٹ گئے۔ میں 'جسوت' اغوا کنندہ اور چرن سنگھ جیب میں سوار ہو گئے جب کہ باقی ساتھی پہلے سے تیار شدہ گھوڑیوں پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بس کے ٹائروں پر فائرنگ کر کے انہیں ناکارہ بنا دیا۔ ہماری جیب پہلے سے پلان شدہ راستے پر بھاگنے لگی۔ جب تک ہم نظروں سے لوجھل نہیں ہو گئے۔ گز سوار وہیں موجود رہے۔ جب ہم خاص محفوظ

ہو گئے تو انہوں نے بھی اپنی گھوڑیوں کو نگام دی۔

پچھلی سیٹ پر جسوت اپنے کام میں مصروف تھا۔ تین چار منٹ کے اندر اس نے اغوا کنندہ کو بیڑیوں اور جھکڑی سے نجات دلا دی۔ ہمارے اس عظیم دوست کی انجین اتھلی جنس نے بست بری طرح مار پیٹ کی تھی لیکن اتنی زبردست تھقیش کے بعد وہ وہ بزدل اس سے کوئی کام کی بات نہ اگوا سکے تھے۔ بری طرح زخمی اور کمزور ہونے کے باوجود اس کے عزم میں کوئی کمی نہ آئی تھی اور وہ اپنے آپ کو تندرست و توانا ہی ظاہر کر رہا تھا۔

جسوت تانے توڑنے اور انتہائی محنت و مشاقت میں بھی سرحد عبور کرنے میں ماہر تھا۔ اسے شاید اسی لئے یہ اہم فریضہ سونپا گیا۔ ہم نے اپنے دوست کو پہننے کے لئے فوراً "نئے کپڑے" نکال کر دیے۔ اب اس صم کا کلنڈر میں تھا سب کو میرے فیصلے پر عمل کرنا تھا۔ پہلے سے اپنے پاس رکھے کچھ خاص کیپول میں نے اپنے نئے دوست کو جیب میں ہی کھلا دیئے تھے۔ اس کی حالت کافی سنبھل چکی تھی۔

ایک مخصوص مقام پر ہم لوگ جیب سے اتر گئے۔ چرن سنگھ نے یاری بھادی تھی 'باقی کام اب ہمارا تھا۔

"لو بھی سنبھورب راکھ" اس نے پہلے سے تیار شدہ ایک پرائیویٹ کار کے قریب ہمیں اتار کر جیب کو دوسرے راستے پر ڈال دیا۔ کار میں چرن سنگھ کا بھائی ہمارا منتظر تھا۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے ہی جسوت سنگھ نے ہمارے ساتھی کا حلیہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ میں اس کے مشاق ہاتھوں کی دلدوپیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے پانچ منٹ کے اندر ہی اپنے پاس موجود سیٹنی ریزر اور مختلف قسم کے لوشنوں کے ذریعے ہمارے نئے ساتھی کو 'قید اور مسلسل لذیت نے جس کی نہ صرف وازمی خاصی بھادی تھی بلکہ چہرے سے لوبھی نچوڑ لیا تھا' ایک تندرست اور صحت مند خون کی سرخی لئے گھٹوں والے شری بچہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ میرا نیا ساتھی میرا ہم عمر تھا۔ جب اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے اپنے چہرے پر نظر ڈالی تو بے اختیار مسکرایا۔

"ایسی شکل تو میری اپنے ملک میں بھی نہیں ہوگی، مکمل کے فنکار ہو یا کیا سے کیا بنا کر رکھ دیا ہے۔" اس نے جسوت کو دلدو دیتے ہوئے کہا۔

راستے میں پڑنے والی ندی میں ہم نے پولیس کی چیمنی ہوئی رائفل اور جسوت کا ہتھیار جس میں نہ جلنے کیا کیا الم علم اس نے بھر رکھا تھا 'پھینک دیا۔ چرن سنگھ کا بھائی ہمیں شام تک مختلف ذیلی سڑکوں پر گھماتا رہا۔ اس اثناء میں ہم نے جی۔ٹی۔ روڈ کے نزدیک پھنکنے کی کوشش نہیں کی تھی اور کھانا بھی کاری میں کھلیا تھا۔ رات گئے ہمیں کپور تھلہ کے نزدیک ایک محفوظ مقام پر

پنچا کر چرن سنگھ کا بھائی بھی رخصت ہو گیا۔ اس نے یہاں ہمیں اپنا دوست ظاہر کیا تھا اور ہمیں تاکید کر دی تھی کہ اپنی اصلیت سے ان لوگوں کو آگھ نہ کیا جائے۔

○○○

چرن سنگھ کے جاتے ہی میں نے معلومات پر غور کیا اور وہاں سے ہٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم نے صاحب خانہ سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں معذرت کی اور ٹرین کے ذریعے دہلی کی طرف چل دیے۔ ہم تینوں اس وقت خاصے معزز نظر آ رہے تھے۔ ہادی اختر میں یہی دکھائی دیتا تھا کہ ہم تینوں کوئی اعلیٰ افسر تھے۔ جسوت زیادہ پڑھا لکھا نظر نہیں آتا تھا۔ وہ برہمچاری سنٹر تھا۔ اسے سارے بھارت کا چپہ چپہ زبانی یاد تھا۔ گاڑیوں کے نام، ان کے اوقات روانگی، راستے اور مشہور شہروں کے ہوٹل وغیرہ۔ جسوت نے ایک قلی کو نذرانہ دے کر فرسٹ کلاس کی تین کنکٹیں حاصل کر لیں اور تھوڑی دیر بعد ہم تینوں اپنی اپنی سیٹوں پر روانگی کے خیر بیٹھے تھے۔

قرباً ایک گھنٹے کے بعد لیوا انتقال کے بعد گاڑی میں حرکت پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ اس نے رفتار بگڑائی۔ دوران سفر ہم دونوں اپنے ساتھی کو پاکستان پہنچانے کے لئے محفوظ سرحد ڈھونڈتے رہے کیونکہ اس بات کا تو ہمیں بخوبی علم تھا کہ پنجاب سے سرحد عبور کرنا واپس خود کشی کرنے والی بات تھی۔ ایک تو پہلے ہی وہاں فوجوں کی خاصی تعداد موجود تھی پھر اس خبر کے پھیلنے ہی تمام متعلقہ ایجنسیوں نے سرحد کے گرد اپنا جال بن لیا ہو گا اور ان کے پچے پچے پر نظر ہوگی۔ ہمارا ارادہ راجستھان یا سندھ کی طرف سے سرحد عبور کرنے کا تھا، حتیٰ فیصلہ مجھے ہی کرنا تھا۔ اس لئے مجھ پر خاصی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ قرباً تین چار گھنٹے کی مغز ماری کے بعد پٹاکر ہم نے راجستھان کی ایک اپنی دانست میں انتہائی محفوظ جگہ کا انتخاب کر لیا تھا اور اب ہم آنے والے حالات کے خیر تھے۔

دہلی تک ہم میں سے کوئی بھی بمشکل ایک گھنٹے سے زیادہ نہ سونے پایا تھا۔ ہم کپور تلہ سے چند ہی گز اور اقبالہ ہوتے ہوئے کرنل سے گزر کر دہلی پہنچے تھے۔ یہ لمبا اور خاصا الجھا ہوا راستہ بھی جسوت کی ذہنی اختراع تھی۔ اس طرح ہم مین لائن سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے اور خاصے محفوظ تھے۔ جسوت کے پاس اپنا ذاتی ہسپتال موجود تھا جب کہ میں نے اور ہمارے نئے ساتھی نے آؤٹریک ہسپتال اپنے ہسنگر دوست سے حاصل کیا تھا۔ ہم نے اپنی دانست میں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھایا تھا، لیکن ایک بنیادی غلطی ہم سے یہ ہو گئی کہ ہمارے دہلی جانے کی اطلاع ان لوگوں کو ہو چکی تھی جنہاں ہمیں چرن سنگھ کا بھائی چھوڑ کر گیا تھا۔

حلوہ یہ مگر ارا کہ ہمارے فرار ہوتے ہی وہاں سے پولیس کے ایک ڈی۔ ایس۔ پی کا گزر ہوا

جو معمول کی کارروائی کے مطابق گشت پر تھا۔ بس کے مسافروں نے شور مچایا اور تمام واقعہ کی اطلاع کر دی۔ کچھ لوگ چرن سنگھ کو پہچان گئے تھے۔ انہوں نے حملہ آوروں میں اس کی موجودگی کی نشاندہی بھی کر دی۔ دوسری طرف فرار کرنا جانے والا لازم کوئی معمولی لازم نہیں تھا جیسے ہی ڈی۔ ایس۔ پی نے وائرلیس کے ذریعے اس کے مندرجات سے ہیڈ کوارٹر کو آگھ کیا، انڈین پولیس کے ایوانوں میں زلزلہ طاری ہو گیا۔ ایک نکت جیسے وہ نیند سے بیدار ہو گئے۔ چند منٹ کے اندر ہی بھارتی خفیہ پولیس کی تمام ایجنسیاں حرکت میں آ گئیں۔ چرن سنگھ کو گرفتار کرنا یا اس سے کچھ اگوا لینا غلطی کی کابھلی نہیں تھا۔ انڈین سیکورٹی افسران نے اسے دو تین گھنٹے کے اندر ہی گرفتار کر لیا لیکن زیادہ توجہ چرن سنگھ پر نہیں بلکہ اس کے ساتھیوں پر دے رہے تھے۔ چرن سنگھ صرف دلیر سمگلر تھا، سیاست دان تو تھانہیں، پھر سکھوں کی رواجی بے وقوفی بھی آڑے آئی۔ اس نے فرار کے منصوبے میں اپنے پانچ چہ اور ساتھیوں کو بھی شامل کر لیا، جنہیں ہمارے کپور تلہ تک مرحلہ وار پہنچنے کا علم تھا۔ مزید پیش رفت سوتی تو انڈین سنٹرل اعلیٰ جنس بیورو کے افسران کڑی سے کڑی ملائے رات گئے کپور تلہ کے اس گھرانے تک جا پہنچے جنہاں چرن سنگھ کا بھائی ہمیں لے کر پہنچا تھا۔

کیس آر پولیس کے ہاتھوں تک ہوتا تو وہ لوگ گور داسپور کے ارد گرد ہی ٹکریں مار مار کر تھک جاتے لیکن معاملہ چونکہ زیادہ ہی سنجیدہ تھا اور انڈین آئی۔ بی نے "را" (فوجی انٹیلی جنس) کی ہنگامی مدد حاصل کر لی تھی، اسی لئے انہیں اتنی کامیابی ہوئی۔ "را" کے افسران زیادہ تر کے۔ بی کے تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے جدید سائینٹفک جاسوسی نظام اپنائے ہوئے تھے۔

کپور تلہ کے میزبانوں کے تو دم دگمن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان کے مہمان کون تھے؟ ان کے نزدیک تو ہم چرن سنگھ کے مہمان ہونے کی وجہ سے واجب الاحرام تھے۔ اسی لئے ان کا ایک آدمی ہمیں شنیشن تک چھوڑ گیا۔ اس نے شاید ہمیں ٹکٹ خریدتے دیکھ کر ہماری منزل معلوم کر لی تھی یا پھر "را" کے چپاک افسران نے ٹکٹ کلکٹریا بلک ٹکٹ بیچنے والے قلیوں سے ہماری منزل کا پتہ لگا لیا تھا۔ برہمچاری یہ اتنا بڑا کارندہ نہیں تھا، جب وہ کپور تلہ شنیشن تک پہنچے آئے تھے تو ہماری منزل کا پتہ لگانا ان کے لئے کچھ زیادہ درد سر کا باعث نہیں بنا ہو گا۔

○○○

ہم علی الصبح دہلی پہنچے تھے۔ ٹرین دہلی شنیشن سے جب کچھ فاصلے پر ٹھہری تو اچانک ایک طوفان بدتمیزی آگیا۔ فوج کے درجنوں مسلح جوانوں نے فرسٹ کلاس کے دروازوں پر قبضہ کر

لیا۔ شدید سڑی کی وجہ سے مسافروں نے دروازے بند کر رکھے تھے وہ دروازوں کے باہری
تک گئے۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی نے رفتار بکالی۔

ہمارا تھا ٹھکانہ تو قحط کے بالکل برعکس اچانک خوش آنے والی صورت حال نے ہمیں ڈنگ
دیا۔ میری طرح بیچیا میرے دونوں ساتھیوں کے دل بھی دل گئے تھے لیکن یہ ایک جاسوس کے
استحقاق کا وقت ہوتا ہے۔ اب کنٹرول مجھے سنبھالنا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں چار قند جسوت لورڈ
ساتھی بھی سنبھل گئے۔ ہم نے آنکھوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جسوت
نے جھپٹے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ہم نے دلی میں بیچ نکلنے کی صورت میں دوبارہ ملنے
کے لئے ایک "مقام ملاقات" طے کر لیا تھا۔ فوراً ہی ہمارا منصوبہ بھی ترتیب پا گیا۔

"بیرونوں دے پیلے ہم" جسوت ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"نی لکن لٹ" میں نے لورڈ دوسرے ساتھی نے سرگوشی کی۔

وہ ہم سے علیحدہ ہو کر بڑی پھلتی کے ساتھ ڈبے کے اندر ہی اندر چلا ہوا غائب ہو گیا۔ ہم
دونوں نے اپنی جیبوں میں رکھے ہتھول تھپتھپائے لورڈ ایک دوسرے کا ہاتھ گر بجوشی سے دبایا۔
ہتھول ہمارے چپے ہوئے کونوں کی جیبوں میں نکل ہو گئے تھے لورڈ بوقت ضرورت ہم جن سے
کوئی بھی ہم لے سکتے تھے حتیٰ کہ ایک دوسرے کو شہادت سے بھی سرفراز کر سکتے تھے۔ جو ہمارا
آخری حربہ تھا۔

اپنی شیشیں ہم نے چھوڑ دی تھیں لورڈ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لگے ڈبے کے پلیٹ
قلم کی مختلف سمت کھینچنے والے دروازے سے ان گئے شیشیں نزدیک آ جانے کی وجہ سے
ڈبے میں خاصی الجھ پئی تھی۔ ہر کوئی اپنی اپنی ٹھکانے میں قند چھ منٹ کے لئے لوگوں نے سپاہیوں
کے اس طرح اچانک ڈیوں کے دروازے سنبھالنے کا نوٹس ضرور لیا تھا لیکن اب جن کو زیادہ فکر
اپنی لورڈ اپنے سلسلے کی تھی۔

شیشیں کے کھلنے نظر آتے ہی ہمارے دلوں کی دھڑکن مزید تیز ہو گئی۔ اپنے تصور کی آنکھ
سے ہم پلیٹ قلم کو گھیرے میں لینے والی پولیس کو دیکھ سکتے تھے۔ منصوبے کے مطابق گاڑی کی
رفتار آہستہ ہوتے ہی میں نے دروازے میں گئے شیشے کو بچے گرا دیا۔ باہری ویشل کو بکڑے
ایک فوجی نظر آ رہا تھا۔

"حق جملے کا ازلہ ہے کیا صارف؟" میں نے اس کے حوجہ ہوتے ہی کہہ "لورڈ آ
جائے" کہتے ہوئے میں نے دروازہ کھلنے والا بولٹ بھی گرا دیا۔

"نو ٹیک" ہم ٹھیک ہے۔ کوئی جلت نظر آتا تھا اس نے میرے سوٹ بوٹ سے

موجوب ہوتے ہوئے کہہ پلیٹ قلم دوسری سمت ہونے کی وجہ سے اس طرف کوئی حوجہ نہیں
تھا لوگوں نے دوسری سمت کے دروازوں پر ساز و ملان سمیت یلغار کی ہوئی تھی۔

میں نے مڑ کر اپنے ساتھی کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ گاڑی کھٹا بدل کر اپنی لائن پر آرہی تھی
اور چند سیکنڈ کے لئے ایک مرحلہ ایسا آتا تھا جب ایک خاص مقام پر ڈبے سے گرانی جانے والی
چیز کا علم دوسرے ڈبے والوں کو سوائے ان لوگوں کے جو خاص طور سے اس طرف حوجہ ہوں۔
ہو پانک ہم اس لمحے کے نزدیک سے نزدیک تر ہو رہے تھے۔ میرے ساتھی نے مجھے اپنے لوہے
اوڑھے کبل کی لوٹ سے اس طرح چھپایا تھا کہ اندر سے میں کم از کم دیکھنے پر بھی نظر نہ آ
سکتا تھا میرے ہاتھ کی گرفت اپنے گت کی جیب میں رکھے ہتھول پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی
جاری تھی۔ شدید سڑی کے باوجود پیسے میں ٹاسکیا تھا اور میں اپنے دل کی بے جا دھڑکنوں کے
ساتھ اس لمحے کا شکر تھا۔ میرے اصرار تن گئے مگر دن میں شدید جھڑکوس ہو رہا تھا۔

جیسے ہی وہ لمحہ آیا میرے ہاتھ میں بکڑے ہتھول کا دست پوری قوت کے ساتھ باہر نکلے فوجی
کے سر پر چلا۔ ڈبے کے پائیدار سے لیٹرین میں اسے نکل کرتے ہوئے ہمیں ہشکل آدھا صحت
ی لگا تھا۔ تمام سواریاں پلیٹ قلم کی سمت کھینچنے والی کھڑکیوں سے دھڑنکے باہر کو لپک رہی
تھیں۔ کسی کو کلاں کن ٹھرن ہوئی کہ ڈبے میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔

ٹرین پلیٹ قلم کے نزدیک پہنچ رہی تھی لورڈ ہمیں قطار اندر قطار بھارتی فوج کے جوں
جوں مختلف سمت میں نظر آ رہے تھے۔ دروازے سے باہر نکلے ہوئے میں نے دیکھا اس سمت
میں کسی ڈبے کے پائیدار پر کوئی فوجی نظر نہیں آ رہا تھا۔

دوسرے بھی غائب۔ ڈیوں کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا
اور دوسرے ہی لمحے ہم دونوں بڑی پھرتی سے بچے اترے لورڈ پلیٹ قلم کی مختلف سمت کھڑی
ایک بل گاڑی میں چھٹائیں لگاتے داخل ہو گئے۔ پھر اسی ڈبے کے دوسرے دروازے سے باہر
نکل گئے۔ بھارتی سیکورٹی والے شکری کتوں کی طرح ہمارے پیچھے تھے اور ہم دونوں ایک
دوسرے کو نظروں میں رکھے دھڑل دار بھاگ رہے تھے۔ آگے آگے میں تھا اور پیچھے ہمارا نانا
ساتھی۔ اچانک جیسے زمین نے ہمارے پاؤں پکڑ لئے۔ سوت اپنا جھیاک جڑا کھولے سامنے کھڑی
مسکرا رہی تھی۔ زمین پر گھٹنے ٹکائے پوزیشن لئے بھارتی پولیس کا سپاہی ہمارے سامنے تھا۔

"ہلٹ" اس نے چلائے ہوئے کہہ۔

"فرنٹ" میرے ساتھی نے جواب دیا۔

وہ چوٹا لورڈ دوسرے ہی لمحے میری زوردار لالت اس کے ہانڈ پر پڑی۔ رائفل اس کے ہاتھ

سے نکل کر اچھلی اور میرے ہاتھوں نے اسے قہم لیا، اگلا لمحہ اس پر قیامت ڈھا کیل میں نے پوری قوت سے رائفل کا دست اس کے سر پر دے مارا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ رائفل پر سے پھینک کر ہم دوبارہ بھاگنے لگے۔ اس لڑائی میں کچھ لوگوں نے جو چھپ کر یہ تشدد دیکھ رہے تھے، شور مچانا شروع کر دیا۔ ان کی چیخ دھکار نے سیکورٹی حکام کو ہماری طرف متوجہ کر دیا۔ اب ہمیں واضح طور اپنے حلقہ میں آنے والوں کے نعرے اور قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

نشیشن پر رش چونکہ زیادہ تھا، اسی لئے ابھی تک (اس پلیٹ فارم کے لوگ) جس پر ہم بھاگتے بھاگتے آئے پہنچے تھے، صورت حال کو سمجھ نہ پائے تھے۔ پلیٹ فارم کی میزچیاں اترتے ہوئے ہم نے رفتار کم کر لی اور اب بھاگنے کے ہم تیز تیز چل رہے تھے۔ بچنے کی بظاہر کو کوئی صورت ممکن نہیں تھی لیکن اسے معجزہ ہی جانتے کہ اس پلیٹ فارم پر ایک ٹرین آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ ہم نے اسے تائبہ نہیں جانا اور چند سیکنڈ کے بعد ہم دونوں اس ٹرین کے ایک غلط ڈبے میں اپنی بھولی بھولی سانسوں پر چھو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔

کسی حد تک ہم ضرور محفوظ ہو گئے تھے لیکن خطرہ بدستور رہا۔ منڈلا رہا تھا۔ ٹرین آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ میرے ساتھی کی جیسنی حالت ابھی نہیں تھی کہ وہ اس بھاگ دوڑ میں میرا ساتھ دے سکتا، لیکن اسے اکیلا چھوڑنا بڑی ہوتی جس کا کم از کم میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بھاگتے ہوئے جہاں اور بہت سی باتیں میرے ذہن میں آ رہی تھیں وہاں میں اپنے ساتھی کے حلقے بھی سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ کم از کم بھاگنے کی مصیبت سے نجات مل جائے۔ اب تھوڑی دیر لے لے سانسیں درست کرنے کا موقع ملا تو ہم نے اسے قیمت چاند۔

ابھی بمشکل ہم نے اپنی حالت پر چھو پلا ہی تھا کہ ٹرین کے بریک چیتے لگے۔ ایک مرتبہ ہمارے دل اچھل کر حلقے میں اٹک گئے۔ گاڑی ابھی نشیشن کی حدود سے نکل کر بمشکل پہلے سٹاپ کے قریب پہنچے۔ دل ہی دل میں شاید اسے سٹاپ ڈھون نہیں ملا تھا۔ ہم ریلوے نشیشن کی حدود سے باہر نکل آئے تھے، جیسے ہی گاڑی کے بریک تھپتھپانے کا احساس ہوا، میں نے اپنے ساتھی کا ہاتھ مضبوطی سے قہم کر اسے دروازے کے نزدیک کر لیا۔ اس نے صرف ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا، اس کی پراچھ نظریں اس کے غم کی قندار تھیں۔ مجھے یوں دکھائی دیا جیسے ہماری سیکورٹی اپنی طاقت اور انتظامات سمیت ہمارا ہاتھ نہیں بگاڑ سکے گی۔

ٹرین کے رکتے ہی بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہم بھی بیچے اتر گئے۔ ہم نشیشن کی حدود سے باہر تھے، لیکن یہاں لوگوں کا آنا جانا ابھی زیادہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ٹرین کے رکتے پر

لوگوں کے مختلف ٹیبرے سنتے سنتے ہم نشیشن کی مختلف سمت کو آہستہ آہستہ کھٹک رہے تھے۔ ہم معمول کی رفتار سے چل رہے تھے مگر کسی کو ہم پر شہ نہ ہو سکے۔ ریلوے لائن کے قریب واقع سڑک ہماری جائے پناہ تھی۔ یہاں سے مختلف سواریاں گزر رہی تھیں۔ دہلی کی زندگی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی تھی۔

ابھی ہم سڑک سے کچھ فاصلے پر تھے کہ فوج کے دو ٹرک نشیشن کی سمت سے آتے دکھائی دیے۔ دونوں ٹرک اسی طرف آ رہے تھے، ہم قہم کر رہے تھے! افراد کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ ہمارے علاوہ سڑک کے نزدیک اور کوئی نہیں تھا اور ہم ٹرین کی مختلف سمت میں سفر کر رہے تھے۔ کوئی بے وقوف شخص بھی بھولی اندازہ لگا سکتا تھا کہ ہمارا حلقے ٹرین کے مسافروں سے ہے۔ اور تو کچھ نہ سوچا ہم نے پوری تیزی کے ساتھ اپنا رخ بدلا اور آہستہ آہستہ جو جھل قدموں کے ساتھ ٹرین کی طرف چل دیے۔

ٹرک جوں جوں نزدیک آتے جا رہے تھے، ہمارے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ اچانک میرے ساتھی کو ایک تھوڑا سا جھجکا۔ وہ ریلوے لائن کے نزدیک آئی قدرتی گھاس کے قریب پیٹھ کے ہالے بیٹھ گیا اور یہی عمل میں نے بھی دہرایا۔ آتے والوں نے بھاگے شارٹ کٹ استعمال کرنے کے ریلوے لائن کے حوازی اپنا سفر جاری رکھا اور گاڑی کے انجن کے قریب پہنچے ہی دونوں ٹرک دک گئے۔ درجنوں جوان چلا گئے باہر کو لپکے۔ وہ اس طرح گاڑی کی طرف رائفلیں اٹھانے بیٹھ رہے تھے جیسے اس پر حملہ کرنے جا رہے ہوں۔

ہم انہیں نظر نہیں آئے تھے یا انہوں نے جان بوجھ کر ہمیں نظر انداز کر دیا تھا؟ اس کا اندازہ تو ہم نہ کر سکے لیکن اپنی طرف سے ان کی غفلت کو میں نے تائبہ نہیں جانتا۔ میں نے اپنے ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا اور سڑک کی سمت چلنا شروع کر دیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جب میں قریب دس بارہ گز دور چلا گیا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آئے لگ۔ میں دل ہی دل میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ ٹرین کے مسافروں میں سے یا آتے والے فوجیوں میں سے کوئی ہماری حرکت کا نوٹس نہ لے۔

دھڑکتے دل اور ڈگمگاتے قدموں سے ہم کسی نہ کسی طرح سڑک پر پہنچ ہی گئے۔ میں نے وہاں کسی سواری کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک نزدیکی راستے کا رخ کیا۔ قریب ہی ایک مندر سے ہمیں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ فوجیوں نے بڑے منظم طریقے سے ٹرین کو کھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان کے کچھ آفیسر مختلف ڈبوں میں ہمیں ڈھونڈنے پر مامور رہے تھے اور ہم ان کی چیخ سے دور مندر کے نزدیک اپنی خستہ حالی کا جائزہ لے کر یہ اندازہ لگا رہے تھے کہ

چند منٹ کے بعد میں نور میرا ساتھی مندر میں داخل ہو چکے تھے۔

ہم نے اپنے جوتے باہر اندر سے نور "گھٹا" کرنے والوں کی منڈی کے نزدیک فن لوگوں میں شامل ہو گئے جو بڑے زور و شور سے پوجا پاتھ میں مصروف تھے۔ دونوں جان بوجھ کر ایک دوسرے سے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ اس طرح کم از کم ہم میں سے ایک تو محفوظ رہ سکتا تھا۔ پہلے تو آہستہ آہستہ آوازوں میں آوازیں ملنے رہی۔ پھر مجھے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے گالے میں کوئی چیز اچک گئی ہو۔

سامنے دروازے سے ایک بلور دی قنادی دار اور سوئیں کپڑوں میں لباس تین آدمی مندر میں داخل ہو رہے تھے۔ نظروں ہی نظروں میں ہم نے ایک دوسرے کو قتل دی نور آنے والے حالات سے بچنے کے لئے خود کو تیار کرنے لگے۔ مندر میں موجود لوگوں نے ایک نظر تو آنے والوں پر معمول کے مطابق ضرور ڈالی تھی لیکن کسی نے فن کے آنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ کھتا اپنے جین پر تھی۔!

شاید قنادی دار یہی معمول کے مطابق آنے والی "مشت" میں شامل تھا؟ ہم نے سوچا لیکن قنادی دار نور اس کے ساتھیوں کی بے چینی سے چاروں طرف جائزہ لیتی نظر نہیں کسی نور ہی بہت کی چٹکی کھا رہی تھیں۔ مندر چو تک ریلے شیٹیں کے نزدیک موجود تھا اس لئے ہمیں یہ فائدہ ضرور حاصل تھا کہ یہی مخصوص لوگوں کی ہی آمدورفت نہیں رہتی ہو گی بلکہ اکثر مسافر بھی یہیں پوجا پاتھ کے لئے آ جاتے ہوں گے۔ چہ کیخ کے اندر ہی ہم نے اپنی حالت پر قابو پایا۔ کم از کم مجھے اس بہت کا احساس تھا کہ اب پاتھ کرنے والوں میں ایک لیلیاں آواز میری بھی تھی۔ دوسری طرف میرے ساتھی کا بھی یہی حال تھا وہ بھی بڑے جوش و خروش سے نشوع و نشوع کے ساتھ گارہا تھا۔

لوم ہے بجلیت ہے

مندر کے آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے فن لوگوں نے اپنی جگہ سے خود بخود ہٹا ہٹا مناسب نہیں سمجھا تھا وہ مختلف کونوں میں ڈٹے ہوئے اپنے کام میں مصروف تھے لیکن سب کے ساتھ پوجا میں بھی شامل تھے۔ قریباً دس بارہ منٹ تک وہ موجود رہے۔ اس اثناء میں نہ جلتے کٹی سرتہ ہمیں اپنے تنگ گالے تر کرنے کے لئے تھوک لٹکا پڑن فن کے دفع ہوتے ہی ہم نے مکہ کا سانس لیا۔ اس اثناء میں "ہر شتو" بھی آگیا تھا ہم نے گرم گرم "کڑاھا" کے دو دو

تھے ذہن رکھنے اور مندر کے کھینے کھینے ماحول کو خیر باد کہہ کر باہر نکل آئے۔

سورج طلوع ہو چکا تھا اور لوگوں کی آمدورفت خاصی بڑھ چکی تھی۔ دہلی کی چٹین چٹائی مار دھاڑ کرتی مخلوق کے پھپھو سچ راستہ ملتے ہم دونوں پیدل ہی ایک طرف کو چل دیے۔ مجھے دہلی کے حلقہ ابھی زیادہ مطہرت حاصل نہیں تھیں لیکن میں اس کے لئے اجنبی بھی نہیں تھا۔ جسونت کے بجائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچنے کے لئے ابھی دو گھنٹے کا وقت ہمارے پاس موجود تھا۔ "مسلسل ہنگام دوڑ اور ذاتی نعمت نے جب مجھے تھکا دالا تھا تو جلتے میرے ساتھی کا کیا حال ہو گا؟" یہ تو اس کا عزم تھا جو اسے کٹھن کشن میرے ساتھ لئے جا رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کے موردِ اہل کو مراد اب ہم مسلمانوں کے ایک ہوٹل کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پہلے تو میرا ارادہ ہمیں ہشت کرنے اور سسٹلے کا تھا لیکن کوئی انتہائی قوت مجھے یہاں جلتے سے روک دی تھی۔ پھر جیسے میں خواب سے بیدار ہو گیا۔ پچھلے تمام واقعات ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ انڈین سیکورٹی حکام نے کم از کم مسلمانوں کے تو ہر ہوٹل پر نظر رکھی ہو گی۔ جب غور کیا تو ہمیں یہاں بھی کچھ مشتبہ صورتیں دکھائی دیں۔ ہم آگے بڑھ گئے اور چند منٹ کے بعد ہی میں ایک غلامے گھوڑن آلود علاقے میں ایک درہماتے درجے کے ہوٹل میں بیٹھا بے چوڑے ٹاشٹے کا آرڈر دے رہا تھا۔

ہوٹل پہنچے تک سردی گرمی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ یہاں آنے تو طم ہوا کہ سردی کے بارے میں چٹنی چٹنی جاری تھی وہاں مسلسل مشقت سے ہم دونوں "مکو" کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ پہلے خواستہ ٹاشٹے کے ساتھ تین چار کیپول بھی لگتے پڑے۔

قریباً ایک گھنٹہ وہاں گزارنے سے میرے ساتھی کی حالت کافی سنبھل گئی تھی۔ مقررہ وقت پر ہم دونوں ایک سینما گھر کا رخ کر رہے تھے جہاں جسونت ہمارا مختصر قتل دہلی کے قریب سارے ہی سینماؤں میں صبح کی شہ سے ہی ہم دکھانے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں ایک رکشہ کے ذریعے وہاں پہنچے تھے۔ سینما ہاں سے کچھ فاصلے پر ہم دونوں اتر گئے۔ اب ایک نور منشی خیر مرطہ آ رہا تھا۔ چاسوس سے چاسوس کے ملاپ کا مرطہ۔!

میں نے اپنے ساتھی کو ہدایات دے کر وہیں کھڑا کیا اور خود چلے جھکا طریقے سے "چاروں طرف سے چو کنا سینما ہاں کی سمت چل دیا۔ سینما ہاں کے دروازے کے سامنے ہی مختلف سکرٹ پان کی دکانوں پر میں نے سرسری نظر ڈالی۔ کوئی مشتبہ صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ایک دکان سے سکرٹ خرید کر لے لیا۔ پان حذ میں رکھا اور ایک کونے میں نظر نہیں بھاویں

جس سے جسوت کی آمد متوقع تھی۔ میری نظریں ہر بار بے چینی سے گزری کی سوتیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ملاپ کی گزری میں دو تین منٹ باقی تھے اس لٹاء میں میرا ساتھی ایک قریبی دکان پر تھن کھڑا ہوا تھا اور منہ میں سگریٹ دہلے بچھ رہی نظریں جوار کی تھیں۔ ہم دونوں بے خبر دل کی دھڑکنوں کا شور کر رہے تھے۔

وقت مقررہ سے قریباً ایک منٹ بعد میں نے جسوت کو سینا ہل سے برآمد ہونے دیکھا وہ شاید اندر قلم کے پوسٹر دیکھ رہا تھا۔ پلان کے مطابق اس نے ایک سمت کو چلنا شروع کیا اور آدھ خڑا تک تک جا کر واپس پلٹ آیا۔ یہ اس بات کا شعل تھا کہ وہ خالوں کی دست برد سے بچ لگا ہے اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ مخالف سمت سے میں بھی پلن چہانا اور سگریٹ کے دھمیں کے مرغولے بنانا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے بھی اسے "Safe Signal" (خاطی اشارہ) مہیا کر دیا تھا۔

ایک دوسرے کے محفوظ ہونے کے یقین نے ہمارا سہول خون بڑھا دیا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی شدت جذبات سے مطلوب ہو کر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی چپہ تھپکا کر صحت کی دلدی۔ چہرے سیکڑ کے بعد جسوت دوسرے ساتھی سے بھگتیر ہو رہا تھا۔ اس نے چار آدمیوں کا پاس پیلے سے ریزرو کروا لیا تھا۔ پاس میں پہنچتے ہی ہم تینوں باری باری کھٹکھٹا کر ہنس پڑے اور ہنسنے ہنسنے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ کل سے آج تک دو غما ہونے والے واقعات کے حعلق کھٹکھٹا کرنا ہم میں سے کسی نے بھی مناسب نہ سمجھا۔ ہمیں خوشی اور اطمینان کے جو چند لمحات میرے آئے تھے انہیں قیمت جان کر ہم صرف انہیں اٹلی ہنس کی پوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اپنی تکلیف اور آنے والے بدترین حالات کے حعلق سوچ کر ہم ان قیمت لمحوں کو کھو نہیں چاہتے تھے۔

قلم بڑی روانگی تھی چلی تو پونم میرے من مندر میں آن برائی۔

پونم جو قیمت تھی۔! جو فضلوں میں ہمیشہ سے رہا یا بھی نہ قسم ہونے والا خوبصورت گیت تھی۔ وہ دھنک کے خوبصورت رنگوں کا استخراج تھی۔ اس کی دینے جلائی کٹورا آنکھیں سمندر کے سینے پر تھرنے والے وہ لائن پوس تھے جو طوفانوں میں بھگ جانے والے مابھوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ ذرا سکون ملا اور وہ میرے منہ غلہ دل سے نکل کر سانسے آن گزری ہوئی۔ "کھن پنج گئے مہاراج؟" مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر جسوت نے پوچھا۔ ہم تینوں غلے بے تکلف ہو چکے تھے۔

"جہنم میں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر تو اچھا ہوا جلدی واپسی ہو گئی۔" ہمارے بے ساتھی نے ہماری کھٹکوں میں حصہ لینے ہوئے کہا۔

تینوں حتی الوسع بیکو کوشش کر رہے تھے کہ باہل کو خوشگوار بنائے رکھیں، لیکن ہم تینوں میں سے کسی کو کوئی خوش حسی بھی نہیں تھی۔ ہمیں علم تھا ایسے حالات میں سرحد پار کرنا کتنا جان بوجھوں کا کام ہے۔ سرحدی اضلاع میں تاکہ بندیاں زور پکڑ رہی ہوں گی اور ہماری سیکورٹی شکری کتوں کی طرح ہماری بوسہمتی بھر رہی ہو گی۔

جسوت نے ہی پلانٹر پل کی۔

"میرے خیال میں راجستان سے کافی سولہ مل جائے گا۔" وہ بولا۔

"جی اللہ اس ذکر کو جانے دو، کل بات ہو گی۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

قلم کے غلے پر ہم اٹھنے ہی باہر آ گئے۔۔۔۔۔ شام تک کا وقت ہم نے گھوم بھر کے ضلع ایک شام کو میں نے اپنے بے ساتھی کو جسوت کے حوالے کیا اور اگلے روز ایک مخصوص مقام پر ملاقات کا وعدہ کر کے فن سے الگ ہو گیا۔ میں سیدھا رکیٹ میں پہنچا وہاں سے اپنے مل کے خلف آراؤر وصول کئے کیونکہ گھر سے تو میں اسی مشن پر نکلا تھا۔

دلی ہی کے ٹیلی فون ایکسچینج سے میں نے لہ حیانہ فون کیا۔ "پرکاش ایڈ پرکاش انڈسٹری" کے نزدیک ہی ایک فون لگا تھا جہاں میں نے پرکاش سے بات کی اور اسے اپنی قیمت کی اطلاع دی۔ میں اپنے کسی عمل سے فن لوگوں کو اپنے "پراسرار" ہونے کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ میری حتی الوسع بیکو کوشش تھی کہ میں ایسی کوئی حرکت نہ کروں جو انہیں میرے حعلق سوچنے پر مجبور کر دے۔ پرکاش کو میں یہ کہہ کر آیا تھا کہ میں دلی سے آرڈر وصول کرنے جا رہا ہوں۔ اب اسے اطلاع دینا بھی ضروری تھا کہ فلاں فلاں جگہ مل روٹہ کر دے۔

○○○

رات جسوت اور ہمارے بے ساتھی نے مجھ سے علیحدہ گزاری۔ اگلے روز مجھے معلوم ہوا۔ جسوت نے بے ساتھی کو تو ایک سرائے میں قیام کے لئے جگہ دلوا دی تھی جب کہ خود اس نے رات ہو کر میں ہمیں۔ دوسرے دن علی الصبح ہم لوگ منصوبہ کے مطابق اکٹھے ہو گئے۔ ہم تینوں نے بھی عام قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ صرف بے ساتھی نے بطور احتیاط گرم چادر لوٹھ رکھی تھی۔ ہماری شدید خواہش تھی کہ پاکستان پہنچنے تک اس کی جسمانی حالت مائل رہے۔ ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں چھتہ کرنے کے بعد ہم تینوں اسی بلڈ میں اکٹھے ہو

مجھے پہلے ایک مخلوق کو نے میں بیٹھ کر قریب دو گھنٹے کی بحث و محیس کے بعد بلا آخر جھوٹ اور میں نے اتفاق رائے سے اپنی دوست کے مطابق سرحد عبور کرنے کے لئے ایک بہترین جگہ منتخب کر لی تھی۔ جھوٹ اور میرے ساتھی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں دہلی سے واپس چلتے جاتوں لیکن میں نے انہیں تھا پھوڑا گوارہ نہ کیا۔ میں چاہتا تھا اپنی آنکھوں سے انہیں بحفاظت سرحد پار کرنا دیکھ سکوں۔ میرے ہند ہونے پر وہ مجھے سرحدی علاقے تک ساتھ لے جاتے پر رضامند ہو گئے۔

رہسے کاظم نیکل سے ہم نے معلومات حاصل کیں اور ایک ایسی گاڑی کا علم ہوا جو ہمیں ہمارے مطلوبہ سٹیشن پر شام کے وقت پہنچاتی تھی۔ وہ دن بھی ہم نے دہلی میں مگرز اور دوسرے روز علی الصبح ٹرین کے ذریعے اپنی منزل کو چل دیے۔ اس مرتبہ ہم تیسرے درجے میں عام بھارتی شہریوں کے روپ میں سفر کر رہے تھے۔ ہم آپس میں کبھی کبھی اس طرح بات کر لیتے تھے جیسے ایک ہی ڈبے میں سفر کرنے والے مسافر ایک دوسرے سے کیا کرتے ہیں۔ سٹیشن پر کوئی خاص سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ غالباً انڈین سیکورٹی کو یہ خیال مگرز تھا کہ ہم دہلی سے کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔

گاڑی شام کے قریب چھ بجے "ہندو مل کوٹ" پہنچی۔ چھوٹے سے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترتے ہوئے ہم نے سامنے نظر دوڑائی تو ہمیں رہسے لائنوں کی نظر آئی۔ جہاں رہسے لائن کا سلسلہ ختم ہوتا تھا۔ جس کے بعد پاکستانی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ سٹیشن سے بالکل لمبھوٹی۔ ایس۔ ایف کی چپک پوسٹ بنی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کھیتوں میں مختلف جگہ انہوں نے گرنالی کے لئے غور بنا رکھے تھے۔ کچھ قاصدے پر ایک مندر نظر آ رہا تھا۔ جس کی کوئی چمت کے ایک کونے میں بھارتی سیکورٹی فورسز کا ایک سپاہی آنکھوں سے دور بین لگائے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ صرف پاکستانی علاقے ہی پر نظریں رکھے ہوئے نہیں تھا بلکہ ارد گرد ہونے والی سرگرمیوں سے بھی باخبر تھا۔

جیسے ہی اس کی دور بین کا رخ پلیٹ فارم کی طرف ہوا نیلے کیوں میزائل اچھل کر صحن میں آگیا۔ قریبی دہشت کے رہنے والے لوگ کھیتوں میں چلتے ہوئے کھجوں کی سمت جا رہے تھے۔ طے شدہ پلان کے مطابق ہم لوگ ڈبے سے اترتے ہی ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ انہوں نے تو قریبی دہشت کی طرف جانے والی چمڑی کا رخ کیا جب کہ میں مختلف سمت شہر کی جانب چل دیا۔

رہسے سٹیشن سے پاکستانی سرحد کا فاصلہ بمشکل ایک فرلانگ بنا تھا۔ جھوٹ اور میرے

ساتھی نے بدی جرات کا مظاہرہ کیا تھا جو انہوں نے اتنے خطرناک علاقے کو سرحد عبور کرنے کے لئے منتخب کیا۔

ان کا خیال تھا کہ بھارتی سیکورٹی کی نظروں میں آنے تک وہ کم از کم آدھا حاصل طے کر لیں گے اور آدھا وہ اپنی قوت اور ہمت کے بل پر بھاگ کر بھی طے کر سکتے تھے۔ میرے ساتھی کا خیال تھا کہ کوئی گھنٹے کی صورت میں بھی وہ کم از کم پاکستانی علاقے میں گریں گے۔ اس طرح اپنے وطن کی خاک تر نصیب ہو گی۔ وہ ایک دفعہ فرار ہونے کے بعد دوبارہ زندہ بھارتی حکومت کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں اس کے جذبے کی دلو دہیے بغیر وہ نہ سکتا۔ جھوٹ نے بھی اس کی خواہش اور جذبات کے احزیم میں اس علاقے پر اتفاق رائے کیا تھا اور اب وہ دونوں جیلے قدم بہ قدم اپنی سرحد کی طرف گامزن تھے۔

○○○

میں سٹیشن کے ایک گوشے میں بیٹھ کر میری نظریں من پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ سورجوں کے موسم کی وجہ سے سورج غروب ہو چکا تھا لیکن ابھی تک اتنی روشنی ضرور باقی تھی جس میں مجھے پاکستانی ریغریز کی پوسٹ پر لڑا ہوا سبز پلاٹ پر جم صاف دکھائی دے رہا تھا۔

ریغریز کی پوسٹ درختوں کے جھنڈ میں گہری ہوئے کی وجہ سے کوکھ دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن میں دل ہی دل میں وہ سب کچھ محسوس کر سکتا تھا جو وہاں موجود تھا۔ خاک و دھن کے اتنے نزدیک ہونے کی وجہ سے مجھ پر ایک خاص قسم کی جذباتی کیفیت طاری تھی۔ پاکستانی فضا کی سمت سے آنے والی ہوائیں مجھے ایک گونہ طمانیت کا احساس بخش رہی تھی۔ میرے دل میں موجزن وطن کی محبت کے لئے میرے جذبات دوچند ہو گئے تھے۔ میرا بی چاہتا تھا میں من عاصیوں پر قربان کر دوں جو میری تقدس نب و صریٰ کی طرف میلی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میرے دونوں پیارے ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے دہشتوں کے ساتھ گھٹنوں کی سمت جانے والی چمڑی پر ردی دوں تھے۔ آگے آگے جھوٹ تھا اس کے پیچھے میرا ساتھی۔ جھوٹ کے دائیں ہاتھ میں دہشتی طرز کا کپڑے کا تھیلا پکڑا ہوا تھا۔ جس میں ایک رعب اور اس کی گولیوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس نے تھیلا کچھ اس طریقے سے پکڑا تھا کہ چند لمحوں کے نوٹس پر بھی وہ رعب اور کلکل کرنا نہ کر سکتا تھا۔

میرے ساتھی نے ایک گرم چادر لٹھ رکھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ چادر کے اندر تھے اور ایک ہاتھ میں اس نے بھی رعب اور تمام رکھا تھا۔ دونوں ساتھی چلتے چلتے لب اس مقام پر پہنچے

مجھے تھے جہاں سے ایک راستہ گھوڑوں کی سہارا تھا اور وہ سراسر پاکستانی سرحد کی طرف۔
ابھی وہ بمشکل دو تین قدم ہی چلے پائے تھے کہ میں نے شیشوں کے قریب منہ پر ہتھی چیک
پوسٹ پر ٹھکرائی کرنے والے علاقہ کو چڑھتے دیکھا اس نے اپنی دو درجین ایک طرف رکھ دی اور
مگلے میں لٹکی دسل کو مت میں دہرایا۔! دسل کی تیز آواز مجھے وہیں کھڑے بغلی منٹلی دسے دی
تھی۔۔۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی شیشوں سے لپکتے لپے۔ انیس۔ ایف پوسٹ سے میں نے ہادی
ہادی باہر نکلتے ہوئے پانچ مسلح سپاہیوں کو دیکھا۔ یہی ایسے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے تھے
شاید یہی وجہ ہے جو پہلے سے تیار سپاہی یہاں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ شیشوں سے یہ منظر
صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میرے علاوہ بھی وہیں موجود کئی لوگ محو تلاش تھے۔ دسل کی آواز
سننے ہی بے اختیار میرا ہاتھ اپنے گہڑوں میں چھپے رہے اور کوئی نہ لگا۔

میں اکیلا ایک معمول سے رہے اور سے ان لوگوں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ جن ضرور
موت سکا تھا جس سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ میری حالت کا اندازہ تب بخوبی فرما سکتے ہیں کہ
شدید خواہش کے باوجود میں اپنے ساتھیوں کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ میں بت بنا اپنی جگہ
کھڑا بھاگتے ہوئے بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس کے جوانوں کو دیکھ رہا تھا۔

جیسے ہی میرے ساتھیوں کو تعاقب کا احساس ہوا میں نے جسوت کو رکھنے دیکھا۔۔۔ اس
نے ہاتھ کے اشارے سے میرے ساتھی کو ایک سمت رہنمائی کی تھی۔ ان سے چند ہی گز کے
خلاصے پر ہی پاکستانی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ چند لمبے تو میرے ساتھی نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ پھر
اچانک وہ پاکستانی علاقے کی سمت چلے گئے۔ ہاتھ لگے جسوت اچانک چلتا اس نے ایک درست
کی آڑے کر اپنے تعاقب میں آنے والوں پر غارتگ شروع کر دی تھی۔

اسے غارتگ کرتے دیکھ کر بھارتی سپاہی وہیں رک گئے۔ چلتا وہ خلاصے تربیت یافتہ لوگ
تھے کیونکہ چند سیکنڈ میں ہی انہوں نے زمین پر لیٹ کر پوزیشنیں لے لی تھیں اور اب ان کی
خود کار رائفلیں فیلے اگلنے لگی تھیں۔ لیکن بے سود۔۔۔ کیونکہ جسوت نے ان کے زمین پر
گرنے کا انتظار نہیں کیا تھا وہ بھاگ اٹھا اور بھاگتے ہوئے اس نے رہے اور دوبارہ نوا کر لیا
تھا۔۔۔ وہ کبھی بھی رک کر ایک آواز نہ کر دیا تھا۔ اس لحاظ میں کسی بھارتی سپاہی کو یہ بہت
نہ ہوئی کہ وہ اٹھ کر اس کا تعاقب کرے۔

جسوت کے ہاتھوں طرف گولیوں کی بارش ہو رہی تھی لیکن اس کے ہاتھ کے انداز دیکھ کر
میں ہی کیا شیشوں پر محو تلاش ہتھی لوگ بھی غصے میں نہ آئے۔ وہ تربیت یافتہ کھنڈوں کی طرح

سیدھا نہیں بلکہ آڑا ترچھا ہو کر بھاگ رہا تھا۔ اس کے اس عمل میں بھی اتنی تعظیم اور رعب تھا کہ
کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر پاتا تھا کہ وہ اچانک دائیں مڑے گا یا بائیں طرف۔ اس کی پوزیشن آٹھ
کے بعد سے وہی تھی۔

اس اثناء میں اس کے عقب سے غارتگ کی آواز آئی۔ چلتا میرا ساتھی جو اپنی دھڑکی پر پہنچ
چکا تھا اسے "گورنگ ٹائر" دے رہا تھا۔ جن الاقوامی سرحد ہونے کی وجہ سے بھارتی سرحدی
افواج زیادہ غارتگ کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھیں کیونکہ دونوں اطراف میں سرحدوں پر ہنگامی
صورت عمل کارفرما تھی اور کسی بھی ملک کی فوج کی طرف سے کی گئی کوئی بھی غیر معمولی حرکت
وہ سری سست کی افواج کو اشتعال دلا کر جنگ کی صورت حال پیدا کر سکتی تھی۔

بھارتی افواج چونکہ مشرقی پاکستان میں کی جانے والی تحریکی کارروائیوں میں پوری طرح ملوث
ہو چکی تھیں اور مرکزی فوجی کمانڈ کی نظریں بھی مشرقی سرحدوں پر لگی ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ
خود بخود اپنی افواج کو مغربی علاقہ پر کسی جنگ میں الجھانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ان کی
تمام تر توجہ مشرقی پاکستان کی طرف مبذول تھی۔ مغربی سرحد پر لڑائی مول لینے میں جو خطرات
پوشیدہ تھے، ان سے بھارتی سپریم کمانڈ بھی بخوبی آگاہ تھی اور وہ اپنی افواج کو "بٹھنے" کے لئے
ہرگز تیار نہ تھی۔

سرحدی افواج کی غارتگ بند ہوتے ہی میں نے جسوت اور اپنے ساتھی کو فضا میں اچھلتے
دیکھا۔ چلتا وہ جوش مسرت سے یا پھر بھارتی سرحدی افواج کو ان کی بے بسی کا احساس دلانے
کے لئے یہ حرکت کر رہے تھے۔ میرے دونوں دوست بغایت سے سرحد پار کر گئے تھے خوشی
کے مارے میرا دل جلیوں اچھل رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد ہی بھارتی سپاہی منہ دکھائے وہیں پکٹ
کی طرف آ رہے تھے۔ شیشوں پر موجود لوگ دل کھول کر بھاگنے والوں کو دودے رہے تھے۔
میں مطمئن شرعی طرف چل رہا۔

صبح پہلی گاڑی سے میں جمنہ چلا گیا۔ جہاں مجھے ایک اہم کام سونپا گیا تھا۔۔۔ جمنہ میں
ہادی اطلاعات کے مطابق دشمن کچھ نئی دفاعی نوعیت کی حیرات کر رہا تھا مجھے نہ صرف ان کا
کھوج لگانا تھا بلکہ یہ بھی جائزہ لینا تھا کہ وہاں کس نوعیت کے ہتھیار نصب کئے جا رہے ہیں۔
مشن کی اہم نوعیت نے احساس ذمہ داری کو بڑھا دیا تھا۔

میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا۔ انجینیئر شہر انجینیئر لوگ اور کسی حد تک انجینیئر ہاؤس۔ میں نے
بھارتی معاشرے میں گو کہ خلاصے مضبوط قدم جاتے تھے لیکن میں اپنے ان فہمیت کی وجہ سے
شرعی حد تک ہی محفوظ رہ سکا تھا۔ دفاعی نوعیت کے اہم مقدمات کے گرد پھیلے ہوئے بھارتی

اصلی جنس کے جہل میں سے راستہ بتانے والوں کا کھیل نہیں تھا۔

مسمومہ میں 'میں' شہم کے وقت پہنچا تھا۔ ایک ہوٹل میں 'میں' نے سڑی لکھت کی حیثیت سے قیام کیا۔ شہم کو میں شہر کا پکر لگا کر اپنے ہارگٹ سے متعلق تھوڑی بہت معلومات حاصل کر کے ہوٹل واپس آیا تو اپنے کمرے میں جانے کی بجائے ہوٹل کے ڈاننگ ہال میں ہی جا کر بیٹھ گیا۔ مجھ پر صبح سے ہی غصی ہوسٹ سوار تھی۔ ایک تو پانچ ٹرین کا سفری تھا دینے والا تھا پھر سارا دن دھنگے کھانے کے بل بوتہ پر مجھے اپنے کام کی ایک بہت بھی مسموم نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ جی فونی نوٹ کی قبریات کس جگہ ہو رہی ہے اور آفیسر انچارج کون ہے؟ ایک کونے میں لگی خلی میز کے گرد کرسی گھومت کر میں بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے 'جب میں نے ایک سکھ فوجیوں کو سارے ہال میں بے چینی سے نظریں دوڑاتے دیکھ کر قہر سے ہر میز پر ایک سے زیادہ لوگ بیٹھے تھے وہ سیدھا میری طرف چلا آیا۔

"ست سری اکل" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

جواب میں 'میں' نے بھی "سج" بتائی۔

میں یہاں بیٹھ سکا ہوں صلہ راج۔" اس نے بڑی انکساری سے پوچھا۔

"کیوں نہیں 'کیوں نہیں' پوچھا۔" میں نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کی خوش اخلاقی سے میں غصا ساڑ ہوا تھا کیونکہ بھٹیلا اور پھر سکھ بد نیز بھٹے نہ ہوں لیکن اتنے نرم اور ملائم لمبے میں گھٹو۔ واقعی عجیب بات تھی۔

"آپ کیا یہاں قیام فرما رہے ہیں؟" اس نے بیٹھے ہی پوچھا۔

"جی ہاں۔" لیکن فائدہ کوئی نظر نہیں آتا۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر برائے متائیں تو اپنا پرچہ۔۔۔۔۔"

میرا کشم ہے میرا 'سیلا لکھت' ہوں۔ کیٹن پر کوئی کام بھی کر سکا ہوں اور پچھلے تین روز سے کوئی پرنس نہیں ملا۔" میں نے اس کا حقہ مکمل کر دیا۔

"بڑا آئندہ آپ سے مل کر" میرا ہم سونہرے تھکے۔ جلد میں ہاری برتن ہانڈنے کی فیکٹری ہے۔" اس نے اپنی فیکٹری کا نام بتاتے ہوئے کہا۔

"آپ کیا پرنس کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں؟" مجھے پھر امید کی گناہ دکھائی دی۔

"جی ہاں پانی کی خواہش ہے کہ میں گھوم پھر کے کاروبار کا جائزہ لوں۔" اس نے میرے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کافی؟" میں نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میرے لئے کافی لا رہا

تھا۔

"دعوتوں میں تو ذرا سی کامیابی بن بیٹھ۔" کوئی غصا دلچسپ اور یار ہاش دکھائی دے رہا

تھا۔

"پھر آپ مسمومہ فرمائیں تو میں آپ کے لئے کوئی خدمت انجام دوں۔ میں کیٹن پر بہت سی فیکٹریوں کے لئے کام کرتا ہوں۔" میں نے بڑی چالچی سے کہا۔

"کیوں نہیں 'کیوں نہیں'۔" اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"میں شہر سے باہر چھوٹی بن رہی ہے وہاں سنا ہے آفیسر انچارج کوئی آیا ہے۔ باقی تو سارا

ٹھیک سمجھ لی مار کر" ہی ہے۔ اس سے غصا لہا آزار مل جائے گا میں کے پر توں کل۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" اس نے بے چینی سے میری بات کانٹے ہوئے کہا۔

"سرورانی سیل میں شپ مجھے درانت میں ملی ہے۔ میں جو بات کہوں گا اس پر عمل کر کے

دیکھوں گا۔" میں نے پراحتہ لمبے میں کہا۔

بھارت میں کیٹن لکھت کے بغیر کسی کاروبار کا تصور ہی ناممکن ہے اس فوجیوں سکھ کا

تعلق سکھوں کی کاروباری قوم "پاپے" سے تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مسمومہ پر ٹھہار کے علاقے سے

متعلق ہیں اور یہاں سے ہجرت کر کے بھارت گئے تھے۔ "پاپے" اپنے بچوں کو اس وقت کوئی

کاروبار نہیں سونپتے جب تک کہ انہیں فن کی بصیرت کا یقین نہ آجائے یا اپنے "سروں" سے

فن کے "کاروباری" ہونے کا ثبوت حاصل نہ کر لیں۔ یہ فوجیوں اپنے کاروباری مشن پر نکلا تھا

اور چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ مل فروخت کر کے اپنے ہاں پاپ کی نظموں میں مقام حاصل کر

سکے۔ اس کو یہاں کیٹن لکھت مل جاتا جو اس کا مل معمولی کیٹن کے عوض فروخت کر سکے 'بڑی

خوش بختی تھی۔

میری خوش نصیبی یہ تھی کہ مجھے "پاپا سکھ" مل گیا تھا اور وہ بھی فیکٹری کے مالک کا بیٹا

میرے ذہن نے ایک شاندار منصوبہ ترتیب دے لیا تھا اور اب مجھے اس پر عمل کرنے کے لئے

اس کے لوازمات بھی پہنچانے تھے۔ میں نے جو معلومات اب تک حاصل کی تھیں فن کے مطابق

یہ دفاعی قبریات فوج کی گرانٹی میں ہو رہی تھیں۔ پہچیز کیٹن کے لوگ بھی فوج سے متعلق ہی

تھے۔ میں کا آفیسر انچارج ایک سکھ کرنل تھا۔

مجھے برتن ہانڈنے والی کپڑی کا سیلا لکھت بن کر اس کرنل تک پہنچا تھا۔

کافی آگئی۔ فوجیوں بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ میں کافی کے گھونٹ بھرتا اپنے منصوبے

کی جزئیات پر غور کر رہا تھا۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ منصوبہ بندی میں ذرا سی ڈھیل رہ گئی تو اس کا

پہلے حفاظتی دروازے کی قوبہم نے پروا بھی نہیں کی اور اس پر پتھر کے بڑھ گئے۔ کچھ
 یلیں جو یہاں "ٹھیکیداری" کرتے تھے، انہیں شافی کھڑات دکھانے کے بعد ایک مخصوص
 آئے تک جانے کی اجازت تھی۔ علیہا ہمیں بھی سپرداروں نے انہی میں سے جان لیا تھا۔ اب

”اُو میرے ساتھ کیا بات ہے؟“ پای منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا

ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ کمرل بھی جٹ سکھ تھا اور اپنے سکھ ساتھیوں کے سامنے اپنی کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ راستے میں چلتے چلتے میں نے اپنا اور اپنے ساتھی کا تعارف اور یہاں آنے کا مقصد بیان کر دیا اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ ہم نے یہاں تک پہنچنے کا خطرہ صرف اس لئے مول لیا تھا کہ یہاں ہمارے علاقے کا ایک جٹ کمرل پرچیز کا انچارج ہے، اب ہم ناکام واپس نہیں جانا چاہتے۔

”لیکن یاد رہی سلائی کرنے کے لئے رجسٹریشن کروانا پڑتی ہے۔ یہ تو غیر معمولی اقدام ہو گا۔ ٹھیک ہے ہمیں یہاں کے لئے برغوں کی ضرورت ہے لیکن.....“

”سدا جی قاتلون بھی آپ ہی ہیں، ہمارے آنے کا کوئی فائدہ تو ہو۔“ میں نے بڑی چالوسی سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں لوکل پرچیز کے کھاتے میں تم لوگوں کو آرڈر دلا دوں گا، لیکن مستقل سلائی ممکن نہیں۔“ اس نے جان چمڑاتے ہوئے کہا۔

دوران گفتگو وہ چاروں طرف گھوم پھر کر وہیں کالم کرنے والے عملے کو بھی ہدایات دیتا جا رہا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ اس سے پٹکل اجنبی، لیکن تجسس بھرے لہجے میں وہیں نصب شدہ ہتھیاروں کے متعلق بھی پوچھ لیا تھا۔ میرا ساتھی بھی ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔ سکھ کمرل بھی ہمیں باقاعدہ ہتھیاروں کے نزدیک لے جا کر ان کا معائنہ کروا رہا تھا۔

میری شدید خواہش تھی کہ اب اس سے جان چمڑاؤں اور ذہن میں سلائی ہوئی معلومات کو فوراً اعلیٰ تحریر میں لے آؤں لیکن میرے ساتھی کا دل کچھ زیادہ ہی لگ گیا تھا۔ ”ابا“ یہ سب کچھ اس کے لئے نیا اور دلچسپ تھا۔ ہم نے کمرل کو ایک کٹری سیٹ ”زبردستی“ بطور تحفہ پیش کیا اور اس سے چار ہزار روپے کے برتنوں کا آرڈر لے لیا۔ دوپہر کا کھانا کمرل ہاتھوں سے ہمیں عارضی طور پر بنے ہوئے ایک میس میں کھلایا اور جلد میں لٹے کا وعدہ کر کے ہمیں رخصت کر دیا۔ میرے دوست کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

”یاد واقعی تم تو مکمل کے بندے ہو، میں پتا جی سے کہہ کر حمیس سلائی بھری تو کمری دلا دیتا ہوں۔“ اس نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے مجھ سے راستے میں کہا۔

”بس سردار جی یہی تو کمزوری ہے میری، تو کمری نہیں کر سکتے ہیں اگر مجھ پر احسان کریں تو

کیشن ذرا بچھا دیں۔ آپ کے لئے آرڈر لاتا رہوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”یار یہ کوئی کہنے کی بات ہے، جلد میں مجھ سے ضرور ملے۔“ اس نے گرجوٹی سے ہاتھ ملائے ہوئے کہا۔

کمرے میں پہنچتے ہی مجھے ایک مرتبہ پھر بڑے دنگار لہجے میں اپنی بیماری کا ذکر کرنا پڑا، جس کے ہاتھوں میں اتنا مجبور تھا کہ شراب پیتا تو کیا اسے سوکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ سو دن سنگھ کف افسوس ل کر رہ گیا۔ رات تک وہ میرے ساتھ رہا۔ ڈنر بھی اس نے کھلایا تھا۔ میری کیشن اس نے فوراً لیا کر دی تھی کیونکہ میرا اس سے یہی معاملہ تھا۔ اب مل سلائی کرنا اور مل وصول کرنا اسی کے ذمے تھا۔

○○○

اسی رات میں نے رخت سرباندھا اور لدھیانہ روانہ ہو گا۔ صبح مجھے اچانک موجود پاکر پرکاش مجھ سے بغلیں ہو گیا۔

”یار اتنی دیر؟“ اس نے بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

”ایک اور دھندل گیا تھا۔“ میں نے ہنستے ہنستے اسے ساری کہانی سنا دی، کیونکہ کمرل ہاتھوں اور سو دن سنگھ میرے لئے بہترین ”دوست“ ثابت ہو سکتے تھے اور پرکاش کا حوالہ میرے لئے ضروری تھا۔

”دلہا! آج یقین ہو گیا سکھ ہوتے ہی یو قوف ہیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بہشت میں نے اور پرکاش نے اکٹھے ہی کیا تھا۔“

ماتا اور باپ جی تو اس ہو گئے تھے تمہارے بغیر اور وہ بھی.....“ اس نے شرارتی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے غور و امور اچھوڑ دیا۔

”وہ کون؟“ میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر پوچھا۔

”اچھا جیسے تمہیں تو معلوم نہیں، دلہا جی دلہا اتنا بڑا کالم کر گئے اور ہم سے چوری۔“ اس نے گھٹکے کہا۔

”پہلی چوری کی تھی زندگی میں، وہ بھی پکڑی گئی۔ بت تیرے کی۔“ میں نے ہنستے ہنستے کہا۔

”ایک بات کوں۔“ پرکاش بولا۔

”ہوں۔“ میں نے چائے پیالی میں ایڑی لیتے ہوئے کہا۔

”یہ پونم کا سواگیا ہے گا اور مجھے تم اس سلسلے میں ہمدرد پاؤ گے۔“ اس کا لہجہ خلصا سنجیدہ

جدائی کے بعد ان سے مل رہا تھا۔

”بیٹے مقامی مارکیٹ ہی میں میرے خیال میں تمہارے لئے کافی کام موجود ہے اتنی مشقت نہ کیا کرو۔“ انہوں نے مجھے کمال ہمدردی سے کہا۔

”دیکھئے ہوجی! مارکیٹنگ میرا شعبہ ہے اور میں پرکاش کو یہ موقع نہیں دنا چاہتا کہ وہ مجھے بھلاؤں گے۔ بس ہم دونوں میں دوڑ لگ گئی ہے۔ یہ مل جاتا رہے، میں اس کا ٹکس کرتا رہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا یار تمہاری مرضی ملنا کے لئے اتنی بھاگ دوڑ کچھ ٹھیک نہیں۔“ وہ بولے۔

”ہوجی آپ ٹھہرے کیونست، میں ابھی جنم کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میرے جواب پر وہ قہقہہ مار کر خنس دیئے۔

سوامی جی

میرے چچے کا قصدا تھا کہ میں کبھی ”آج“ کی حاصل کردہ مطلوبت پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مجھے روزانہ تازہ سے تازہ مطلوبت درکار تھیں۔ ہنگامی حالات ہونے کی وجہ سے ہولائی لڑوں پر تہذیبیاں اتنی تیزی سے رونما ہوتی تھیں کہ آج کی بات اگلے روز پر لٹی دکھائی دیتی تھی۔ ایک سکو لڑوں آج یہاں موجود ہے تو اگلے روز اس کے منزل کے متعلق کوئی بھی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی تھی۔ میری کوشش یہی رہتی تھی کہ میں نئی سے نئی اور اہم ترین مطلوبت حاصل کر سکوں اور تازہ مطلوبت حاصل کرنے کی بہترین جگہ تھی فضائیہ کے کلب اور ہوٹلوں کے ڈانسنگ ہل۔ سپر کی رات خوبصورت ہوتی تھی۔ ہوٹلوں کے ڈانسنگ ہل اور کلبوں میں قتل و دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ قریبی شہروں کی خوبصورت مستقبل کے خواب دیکھنے والی بھارتی ٹاریاں اور ”مخصوص طبقہ“ کی نوجوان لڑکیاں بھی عموماً انہی ہوٹلوں میں زیادہ پائی جاتی تھیں، جنم ان افسروں کی آمد متوقع رہتی تھی۔

شراب کے نشے میں دھند بھارتی فضائیہ کے افسروں اور ان کی بیگمات اکثر ”ڈپریشن“ سے نجات پانے کے لئے ایسے لول جلول بک جاتے تھے جن میں مطلب کی نہایت اہم بات موجود ہوتی تھی۔ میری خواہش پر پونم نے وہ سازشی خصوصی طور پر پہنی جو میں نے اسے پہلی ملاقات میں پیش کی تھی۔ پونم کے ساتھ رات کو میں ایک فیکسی میں بیٹھ کر اس کلب کی طرف جا رہا تھا جو افسروں کے لئے مخصوص تھا۔ مجھے اپنا تو علم نہیں کہ میں کیسا لگ رہا تھا لیکن پونم کے متعلق یہ بات دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ بھارت کی سب سے زیادہ خوبصورت کنیا لگتی تھی۔

جیسے ہی وہ میرا ہاتھ تھامے ”آفسرز کلب“ میں داخل ہوئی، ہل میں بیٹھے تمام لوگوں کی نظریں اس کی سمت اٹھیں۔ اسے دیکھنے والوں میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں بھی۔ ہوس ناک نظریں، حامد نظریں، دھک بھری نظریں، سب ہی نظریوں نے پونم کا احاطہ کر لیا تھا۔ ہمارے ایک کونے میں رکھی میز کے گرد بیٹھے تک کچھ لوگ گردنیں موڑے ہمیں دیکھتے رہے۔ ان کی میلی نظریں پونم کو سولینا چاہتی تھیں۔

”مجھے تو بڑی لاج آ رہی ہے۔“ پونم لوگوں کی طرف پیچھ کر کے بیٹھ گئی۔

”اور مجھے مزا آ رہا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے میز پر رکھا مینو اٹھایا۔

چند منٹ کے بعد ہی ایک منسوب بیرا ہمارے سر پر موجود تھا۔ میں نے پونم کی خواہش پر صرف کافی کا آرڈر دیا۔

”کتنے قابلِ رحم ہیں بے چارے“ اتنی سندر دیوی کو میرے ساتھ دیکھ کر یہ جملے کے علاوہ اور کبھی کیا سکتے ہیں۔۔۔۔۔“ میں نے ان کی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے پونم سے کہا۔

ابھی پیرے نے کافی لاکر رکھی ہی تھی کہ ڈانسنگ میوزک شروع ہو گیا۔ مختلف جوڑے اٹھ اٹھ کر ڈانسنگ فلور کی سمت جا رہے تھے۔ پونم نے کچھ نہ کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ ماحول اس کے لئے بالکل اجنبی ہو۔ ہمارے ساتھ والی میز پر دو کیزس جنہیں شاید حال ہی میں کیشن ملا تھا‘ شراب کے نشے میں اپنی اکھڑی پارنٹر کو چیخ چیخ کر اپنے کارنامے سنارہے تھے۔ ان لوگوں کی شاید یہ ”مشترکہ محبوبہ“ تھی اور دونوں نشے کی حالت میں اس کے سامنے زیادہ نمبر بنانے کے چکر میں خاصی اہم نوعیت کی معلومات اگل رہے تھے اور میں بڑی دلچسپی سے انہیں ”نگل“ رہا تھا۔

پونم نے کئی مرتبہ بے چینی سے پہلو بدل کر اپنی بیزارگی کا اظہار کیا لیکن میں نے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کئے رکھا۔ اچانک جیسے سارے ہل کو سکنت ہو گیا۔ ایک عجیب و غریب شخصیت دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ایک لمبا بڑا رنگارنگی اندر داخل ہو رہا تھا۔ شدید سردی کے موسم میں بھی اس کے جسم پر کپڑے کی صرف دو چادریں تھیں۔ ایک جو اس نے باندھ رکھی تھی اور دوسری اس نے اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔

آرکسٹر خاصوش تھا‘ اس کے پاؤں میں پستی کھڑاؤں کی آواز ہی سنائے کو مجروح کر رہی تھی ورنہ تو سارے ہل نے سانس روک رکھا تھا۔

”کو لکھ نرجن!“ اس نے اندر چھتے ہی زور سے پکارا۔

”مہاراج آ گئے۔“

”بھگوان آ گئے۔“

”پرہاتما آ گئے۔“ مختلف آوازوں کی جھنجھٹ سناؤی دینے لگی۔

”فراڈ ہے سلا“ ایک دم فرائڈ۔ ”شرابی کیڈٹ جس نے سارے ہل کے ساتھ ہی چپ سلاہ

لی تھی‘ اچانک چلایا۔

جہاں جہاں اس کی آواز پہنچی‘ لوگوں نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔ مردوں سے زیادہ عورتیں اس کی طرف گھور رہی تھیں۔ سلاہ کے ہل میں داخل ہوتے ہی لوگ مختلف کونوں

سے اٹھ اٹھ کر اس کی قدم بوسی کرنے لگے۔ ان میں زیادہ تعداد ان نیم برہنہ لڑکیوں کی تھی جو خاص طور سے سینئر کی رات کو یہاں آیا کرتی تھیں۔ کیڈٹ کی بات ختم ہوتے ہی اچانک بار کلوئٹر پر بیٹھا ایک نوجوان جو خود بھی کوئی آفیسر دکھائی دیتا تھا‘ اس طرف بڑھا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے گریبن سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

”کیا بکھتے ہو۔“ وہ غصے میں چلایا۔ شراب نوشی سے اس کی آنکھیں دھکتے ہوئے انگارے دکھائی دے رہی تھیں۔

”رک جاتو بالیکے۔“ اچانک سلاہو مدارج چلایا اور یوں لگا جیسے دونوں پر سحر طاری ہو گیا ہو۔ وہ بڑے پردہ دار انداز میں چلتا اس میز کی طرف آیا۔

”شانتی! شانتی!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر دونوں سے نظریں ملانے بغیر بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

”پرہمو! اس نے.....“ حملہ آور نے غصے سے کچھ کہا تھا۔

”شنت رہو بالیکے اس پر کرودھ اندری کا راج ہے‘ پرہاتما اس کی رکشا کرے۔“ سلاہو نے اس کی بات کانٹے ہوئے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔

”آئندہ ناو۔“ اس نے اچانک آرکسٹر کی طرف دیکھ کر زور سے چلاتے ہوئے کہا۔ ”رگھو پتی مدارج دیانند جی کی جے“ سارے ہل نے نعروں لگایا اور دوسرے ہی لمحے آرکسٹر حرکت میں آ گیا۔ تپنے والوں میں جوش و خروش مدارج کی آمد سے بڑھ گیا تھا۔ بڑا بیگانہ خیر منظر تھا۔

تھرکتے جسوں کا شیطانی رقص اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔

مدارج نے حسبِ عادت گردن جھکائی‘ پھر وہ اچانک مزا اور میرے سر پر براجمن ہو گیا۔ پونم نے اپنے قریب پا کر اٹھ کر اس کے پاؤں چھو لئے۔ مجھے بھی ہلبل خواستہ اس منوں عمل کو دہرائنا پڑا۔

”کلیان ہو‘ کلیان ہو!“ اس نے ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور ہمارے سامنے براجمن ہو گیا۔

میں نے دل ہی دل میں نجانے کتنی گلیاں اسے دے ڈالیں۔ اس کے یہاں آتے ہی میرے قریبی میز والوں کا سلسلہ گفتگو بند تو نہیں ہوا تھا‘ البتہ اس میں پہلے والی سرگرمی باقی نہیں رہی تھی کیونکہ ان کی محبوبہ بھی ہل میں موجود درجنوں خوبصورت لڑکیوں کی طرح مدارج دیانند سواہی کے گرد گھیرا ڈالے کھڑی تھی۔ نجانے یہ کبجنت کیا شے تھی جسے دیکھتے ہی لڑکیں آفیسروں کی بظلوں سے نکل کر اس کے پاؤں میں آ جھنسی تھیں۔ کوئی اس کے پاؤں دبا رہی تھی

لور کوئی اس کے چروں میں بیٹھی تھی۔

میرے سامنے تصویر کے دونوں رخ تھے۔ انڈین اٹلی جنس کو بھی بخوبی اس ہلت کا علم تھا کہ ایسی جگہوں کا رخ غیر ملکی جاسوس ضرور کرتے ہیں، اس کے علاوہ بھی وہ لوگ اپنے شرابی لور بدکردار افسروں کو اپنے زیر نگرانی رکھتے تھے لور ایسے مصلحت پر ضرور موجود رہتے تھے۔ سوای دبانڈ کو دیکھتے ہی نجلے کیوں میرے دل سے ایک ہی آواز اٹھ رہی تھی۔ اس کا تعلق ضرور اٹلی جنس سے ہے۔ اب اس کی اپنے نزدیک ”تشریف آوری“ کو بھی میں نے کوئی اچھا لکھون نہیں جتنا تھا۔ خوبصورت عورتوں کا اس کے گرد گرد نگہداشت کرنا یہ اندازہ تو ہو چلا تھا کہ وہ کس قسم کا ”ہنگوٹ“ ہے۔ ایسے ”پرہیزگار“ کا پونم ایسی خوبصورت کنیا کے نزدیک براہمن ہونا بھی سمجھ میں آسکتا تھا لیکن یہ ہلت بھی میرے پیش نظر تھی کہ میں پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں لور وہ بھی ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ — من مصلحت میں بھارتی اٹلی جنس مجھے چپک نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

سوای دبانڈ کی آمد میری میز پر معمول کے مطابق ہرگز نہیں تھی۔ مجھے اس کا بخوبی احساس تھا میں بھی محتاط ہو کر بیٹھ رہا۔ خود کو اس سے لائق ظاہر کر کے خود کو ملوث مصیبت کو دعوت دینا نہیں چاہتا تھا، میں بھی اس پر مٹا جا رہا تھا لور اس کی اپنے پاس آمد کو ”سوناگاہی“ کر دینا رہا تھا۔

میری شدید خواہش پر مہاراج نے میری طرف سے ”سوم رس“ دینا قبول کر لیا تھا۔ ہل میں موجود خاصے لوگ تو پہلے ہی پونم کی وجہ سے مجھ سے حسد کر رہے تھے۔ اب مہاراج کی آمد نے مجھے من کی نظروں میں غیر معمولی اہمیت دلا دی تھی۔ جتنی دیر مہاراج بیٹھے رہے، انہوں نے بمثل چند باتیں ہی اپنی طرف سے کی تھیں ورنہ تو وہ زیادہ تر لوگوں کی باتوں کا جواب ہی دیتے رہے تھے۔ مختلف عورتیں ہاری ہاری من کے چروں میں بیٹھ جاتیں، سوای جی اپنی جیتیاں میں فرق ہو جاتے لور اہانک جبکہ کر کوئی ہلت اس کے من میں کہہ دیتے۔ عورت ہلت سن کر افسوس من کی قدم بوسی کرتی لور اٹلے پاؤں اپنی کرسی پر واپس چلی جاتی۔

”تم بہت خوش قسمت ہو بالکل۔“ اس نے اہانک میری طرف نظریں اٹھائیں۔ ایک لمحے کو تو مجھے زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔ ضرور اس کی نظروں میں کوئی معناتیس قوت پوشیدہ تھی لیکن اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی حالت پر کھج پالیا۔

”سندری کو ساتھ لے کر ہمارے آشرم میں آنا مارگو جیسے اپنے درشن دیں گے۔“ اس نے فقرہ مکمل کرتے ہی نظریں جھکا لیں۔

”مہاراج سوناگاہی مہاراج ہم سر کے بل آئیں گے۔“ پونم نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

آرکسٹرا تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ مہاراج بھاشن دینے والے تھے، پھر سوای جی کا بھاشن شروع ہوا۔ بھاشن کیا تھا تعویذ کا مجموعہ تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کو جنسی آزلوی کا سبق دے رہا تھا۔ لور ”شری کو خا کر کے آتما کی آزلوی“ کا رسپیڈ نین فارمولہ لائٹن لور گیتا کے مختلف اشلوکوں کی مدد سے سنا رہا تھا۔

جیسے ہی اس کا بھاشن ختم ہوا، لوگ پھر سجدے میں گر گئے لور سوای دبانڈ مہاراج ”شانجی“ لور ”کلیں“ کا راگ لاپتے وہاں سے پھار گئے۔ من کے جلتے ہی نئی مصیبت آگئی۔ اب لوگ ہمارے گرد اکٹھے ہو کر ہمیں ”دو حلی“ دے رہے تھے کیونکہ مہاراج ہم پر خاص طور پر ”دال“ ہوئے تھے۔ من کے خیال میں ہم دونوں میں سے کسی میں ضرور کوئی ”ہمت“ تھی۔ ”مٹی“ تھی جس نے مہاراج کو خاص طور سے ہماری طرف متوجہ کیا تھا۔

جب پڑھے لکھے ہندو طبقے کا یہ حل تھا تو جمل عوام کے نظریات کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔ میں نے دل ہی دل میں من کی ذہنی ہستی پر لعنت بھیجی لور من کیڈس کی طرف متوجہ ہو گیا جو سوای جی کے جلتے ہی اپنی مشترکہ محبوبہ کو گالیاں دینے لگے تھے جس نے مہاراج کو دیکھتے ہی طوطے کی طرح من سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔

”فرقا ہے سلا، ایک دم فرقا“ میں اسے خوب جانتا ہوں۔ ”ابھی اس کا ٹیگر جاری تھا کہ اہانک دو تین نوجوان مختلف میزوں سے اٹھے لور اس پر ہل پڑے۔ اپنے ساتھی کو پتہ نہ تھا کہ اس کا دست بھی مقابلے پر اتر آیا لور وہاں وہ دھماچو کڑی پٹی کہ خدا کی پند!

میں پونم کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے گیا۔ رات کے قریب“ ہارنچ رہے تھے۔ کلب کے باہر دو تین خلی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ہم گھر روانہ ہو گئے۔ پونم لور میں دونوں اپنے آپ کو اس بد لگنی کا باعث جان رہے تھے۔

”جسیں تو پوری کیا ہیل لاکر!“ میں نے اس کا ہاتھ تھامے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں تو — میں تو خود شرمندہ ہو رہی تھی شاید میری وجہ سے۔۔۔۔۔“

”تمہاری وجہ سے ایک کلب تو کیا دو لکھوں کے درمیان جگ چھڑکتی ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے فقرہ مکمل کر دیا۔

اس کے شرابا جانے کی لوار پر بے اختیار مرنے کوئی چلا۔

گھر پہنچے تک ہم دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ میرے جانے کا مقصد کافی حد تک مل ہو چکا تھا، مجھے وہاں مختلف لوگوں کے آپس میں بحث مہلتے سے کچھ نئی باتوں کا علم ہوا تھا جو

کہنے والوں کی نظروں میں تو کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں لیکن ان کی میرے ملک کے نزدیک کیا اہمیت ہو گی! اس کا اندازہ میں بخوبی لگا سکتا تھا۔ پونم کے قریب کا احساس اتنا سرور انگیز تھا کہ میں شاید اس کیفیت کو بیان نہ کر پاؤں۔ جب وہ میرے حلقہ ہوتی تو میرا من بڑھ جاتا تھا۔

○○○

واپسی پر نہر کے قریب سے ٹیکسی گزری تو میں چونک اٹھا۔ یہ نہر ہوائی اڈے کے قریب سے گزرتی تھی اور شاید حفاظتی اقدامات کی غرض سے وہاں آری ڈیپلائے ہو رہی تھی۔ ساری رات میرے ذہن میں نہر اور اس کے ارد گرد کا علاقہ گھومتا رہا۔ ہوائی اڈے کے گرد اگر دایسے دفاعی حصار کا علم ضروری تھا۔ مجھے بے چینی سے صبح کا انتظار تھا تاکہ اس سلسلے میں کوئی لاٹھ عمل ترتیب دے سکوں۔ اگلے روز چھٹی تھی۔

صبح میری تجویز پر سب نے نہر کے کنارے پلنگ منڈے کا پروگرام بنالیا۔ علی الصبح میں نے ماتابی کو یہ تجویز پیش کر دی تھی۔ وہ تو سنتے ہی کھل اٹھیں۔

”جیسا تمہیں تو سمجھوانے ہمارے لئے اوتار بنا کر بھیجا ہے۔ جل پوجا تو ہمارا دھرم ہے لیکن پرکاش کے باجی نبھانے کس مٹی کے بنے ہیں۔ پچھلے سال بھر سے مجھے نہر کا منہ نہیں دیکھنے دیا۔“ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میرا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ ان لوگوں کی موجودگی میں مجھے وہاں کام کرنے کا موقع مل جائے گا بلکہ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ میری موجودگی میں وہ لوگ اتنے مصروف رہیں کہ انہیں میرے بارے میں سوچنے کی فرصت نصیب نہ ہو۔

زندگی سے اپنے حصے کی سمرتیں حاصل کرنا ہر انسان کا فرض ہے لیکن وقت نے کبھی انہیں اتنی سہولت نہ دی تھی کہ باجی انہیں اس طرح گھما پھرا کر لاتے۔ ایک عرصے سے ماتابی انہیں ”ویشنو یا ترا“ کے لئے کہہ رہی تھیں لیکن وہ ہر مرتبہ بات گول کر جاتے۔ صرف اس لئے نہیں کہ بقول ان کے انہیں ایسی فضولیات سے نفرت تھی بلکہ اس کا بوجھ پیسے کا نہ ہونا تھا۔ اب ان کے لئے جہاں ایک باعزت زندگی گزارنے کے مواقع میسر تھے وہاں انہیں مجھ جیسا ”دھرم پتر“ بھی مل گیا تھا جو زبردستی ان کی جھولی میں ان کے حصے کی خوشیوں ڈال رہا تھا۔ جب کبھی میں ان لوگوں کو قلم یا کسی دوسرے تفریحی پروگرام کی تجویز پیش کرتا تو باجی جذباتی ہو جاتے۔ مجھے اس بوڑھے کیونٹ پر برا رحم آتا اور اس بات کا یقین ہونے لگتا کہ قدرت نے بلاوجہ مجھے ان لوگوں سے نہیں نکرایا۔ شاید اب خدا کو انہیں کچھ سکھ دکھانا ہی مقصود تھا۔

میرے شدید اصرار پر موسیٰ جی بھی ہمارے ساتھ جا رہی تھیں۔ ایک مقامی نمبر پر بیٹھ کر وہ

لوگ نہر کی طرف چل دیئے۔ نہر کے کنارے پر ایک جگہ لوگوں نے کتاب کی شکل دے کر وہاں ایک موڑتی کھڑی کر رکھی تھی۔ موڑتی ہو گی تو مندر بھی ہو گا اور مندر بنے گا تو پوجا بھی ہو گی۔ ہندو بھی بڑی عجیب و غریب قوم ہے۔ پوجا کے لئے ان کے کوئی خاص دیوتا مخصوص نہیں۔

میں نے انہیں ایک چوٹی سے لے کر پہاڑ تک کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ کیونکہ تمام دریا کیلاش پرمت سے نکلتے ہیں اس لئے ان میں سے نکلنے والے ندی تالے بھی قلیل پرستش ہیں۔ نہر کے متعلق تو انہیں علم تھا کہ یہ ”گنگا جل“ ہے اس لئے یہاں کچھ زیادہ ہی سرگرمی دیکھنے میں آتی تھی۔ نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ کچی سڑک بنی ہوئی تھی جس پر سے گزر کر لوگ ”ماتا مندر“ کو جاتے تھے، محلہ چونکہ پوجا کا تھا اس لئے اندرین آری وہ سڑک بند نہ کرنے پر مجبور تھی۔ یہ الگ بات کہ انہوں نے وہاں اپنی سیکورٹی خاصی پھیلا دی تھی بلکہ محلہ میں پاکستانی جاسوس بھی اس علاقے سے گرفتار ہوا تھا۔ اخبارات کے مطابق وہ جاسوس پلنگ منڈے والوں کی آڑ میں فوٹو کرنی کر رہا تھا۔ اس جاسوس کی گرفتاری کے بعد سے تو انتظامات اور بھی سخت ہو گئے تھے۔

پلی تمام لوگ تو نمبر پر چلے گئے جب کہ میں نور پرکاش موڑ سائیکل پر آرہے تھے کیونکہ ہمیں بازار سے کچھ فروٹ بھی خرید کر لے جانا تھا۔ نہر کے قریب پہنچتے ہی موڑ سائیکل ”پروگرام“ کے مطابق پلنگ منڈے کھانے لگی۔

”کیا ہو؟“ پرکاش نے پریشلنی سے پوچھا۔

”پلنگ“ پکڑا پھڑول میں ملاوٹ یا کوئی اور تھپلا۔“ میں نے گردن موڑ کر جواب دیا۔

”یار نہ جسنے یہ معصیت کیوں پل رکھی ہے باجی نے؟“ پرکاش بولا۔

”کاش تم نے بھی کوئی معصیت پالی ہوئی!“ میں نے یہ فقرہ کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

نہر کی سڑک پر کچھ دور تک تو موڑ سائیکل چلتی رہی، جیسے ہی ایک آری پونٹ کے نزدیک پہنچے وہ اچانک بند ہو گئی۔

”کھل مروا دیا سلی نے۔۔۔ یار اس میں تو پلنگ پانا بھی نہیں ہے۔“ پرکاش پریشلنی سے بولا۔

”جھاکھ کرتے ہیں۔“ میں نے اسے فروٹ کی ٹوکری تھما دی۔

ہم موڑ سائیکل کھینچنے ہوئے ایک اینٹی ایئر کرائٹ گمن کے نزدیک پہنچ گئے جسے بڑے خوبصورت طریقے سے کیونٹ لٹان کیا گیا تھا۔ نزدیک ہی ایک آری ٹرک کھڑا تھا جس سے جوں

○○○

”سواہی دیانند جی مہاراج سنگھوں کو ورثہ دینے آئے ہیں۔“

میرے مطلق اٹھلی جس کا ایک خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ رائے کوٹ میں میری آمد حال ہی میں ہوئی تھی۔ اٹھلی جس والے فوراً "میرے ماضی کا تعاقب شروع کر دیتے" جس کا

میں نے اسے اس موضوع پر مزید چھیڑنا مناسب نہ سمجھا لیکن دل ہی دل میں مجھے اس بات

000

گھاس کے اندر ہی اندر بطیر کو انہیں چھپا رکھے چلتا ہوا میں خلدوار تار کی ہاڑھ کے نزدیک پہنچ چکا

پونم کھکھلا کر ہنس پڑی۔ کافی دیر ہم دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ وقت کا پیچھے ہٹا کر اڑا رہا۔ ہمیں شام ڈھلنے کی خبر تب ہوئی جب سب گھروالے واپس آ گئے۔ موسیٰ اور ماما جی مدارج و مائید سوائے کے گمن گارے تھیں۔ انہیں مدارج کی اھل میں "پرہو" کے درشن جو ہو گئے تھے جب کہ دونوں پاپ پڑا اسے سارے راستے کو تنے آئے تھے۔

قلہ یہ پہلی حافضی بازہ تھی۔ میں نے چاروں طرف آہٹ لی اور اطمینان کرنے کے بعد جی بھرتی سے ایک چھوٹے سے پاس کی مدد سے اسے کٹ کر اپنا راستہ بنایا۔ پھر اسے جوڑ کر ٹھیک کیا اور اندر جا کھلا آگے ایک جگہ بنایا گیا تھا جسے عبور کرنا ذرا مشکل دکھائی دیتا تھا لیکن اللہ کی مدد شامل حال تھی۔ اپنی قوت ارادی کے قیاس پر میں نے اسے بھی عبور کر لیا۔ اس کے بعد پھر لمبی لمبی گھاٹوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ گھاٹوں کے ایک سلسلہ پر لگی ہوئی تھی۔ اچانک میں چونک اٹھا۔ نزدیک ہی ایک تاریخہ آیا جس کا سلسلہ کسی جست کی پلٹ نماشے سے ملا ہوا تھا۔ دل ہی دل میں میں بھارتی سیکورٹی کو دلو دے بغیر نہ رو سکے۔ انہوں نے یہاں ہونے والی غیر معمولی نقل و حرکت نوٹ کرنے کے لئے ایسے حساس آلات کا سلسلہ چاروں طرف پھیلا رکھا تھا جو معمولی سی آہٹ کو بھی ریکارڈ کر سکتے تھے۔

ان آلات کا بروقت علم ہونے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور مزید احتیاط کے ساتھ آگے رینگ گیا۔ اب میں اسی سڑک کے نزدیک پہنچ گیا تھا جو ہوائی لڑے کے چاروں طرف حشری دستوں کے لئے بنائی گئی تھی۔ مجھے یہاں رک کر "پنڈول پارٹی" کا انتظام کرنے کے بعد آگے جانا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹہ تک میں زمین سے چپکا دیا ہوا تھا جب اچانک دور سے آنے والی جیپ کی آواز میں کر میرے اصرار پر تھ گئی۔

آرکی جھگڑا گئی تھی اور دور کی چٹریں بجلی کی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتی تھیں۔ سوائے ان جیپوں کے جو ہوائی جہازوں کے جو یہاں سے کم از کم ایک فرلانگ کے فاصلے پر استعدہ تھیں اور جن میں سے ایک عمارت میں مجھے داخل ہو کر معلومات حاصل کرنا تھیں۔ حشری پارٹی کی جیپ میرے نزدیک آکر ٹھہر گئی۔ میرے دل کی دھڑکنیں اچانک بے قابو ہونے لگیں۔ جیپ کے پڑ پر لگی ایک طاقتور سرج لائٹ کی روشنی وہاں پڑنے لگی۔

"کیس انیس ٹک تو نہیں ہو گیا" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ہاتھ میں پکڑے ہسپتال پر میری گرفت لور خست ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ کو اچھی طرح گھاس میں چھپا رکھا تھا اور دم سلاخے زمین سے چپکا ہوا تھا۔ روشنی کا ہل میرے لوہے لوہے سے گھومتا ہوا اب آگے کی سمت بڑھ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ ابھی میں بھٹک کر آگے بڑھنے کے ارادے سے زمین سے اٹھا ہی تھا کہ اچانک مجھے پھر اسی پوزیشن پر واپس آنا پڑا۔ کوئی بیدل حشری پارٹی اس طرف آرہی تھی۔

میں سنبھل ہی پایا تھا جب دو نین سائے مجھے اپنے قریب ہی دیکھنے دکھائی دیے۔ جنگی

گھاٹوں میں مختلف جگہ ہرجوں کی روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ وہ تاریکی تھی جس میں لوگوں نے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ سرج لائٹ سے پتا تو ممکن تھا لیکن تاریخ کی روشنی 'لفوا میری ہتھیلیاں پیسے میں بھیک رہی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح میں نے ہسپتال کے سیٹنی کچ کو کھولا اور اسے ہتھ کی پوزیشن میں کر کے آنے والے حالات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اچانک میرا دل زور سے دھڑکا۔ ایک لمبا فوجی بوت میرے منہ کے سامنے موجود تھا اور پنڈول پارٹی کا جوفن میرے سر پر تاریخ لئے کھڑا تھا۔ میری تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں، میں نے بھٹک پڑا ہسپتال کا رخ لینے ہی لینے اس کے سینے کی طرف کر دیا۔ ایک ایک لمحہ قیامت ڈھارہا تھا۔

○○○

میں اُسی پوزیشن میں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اسے میری خوش قسمتی سمجھنے یا نہ کی یہ تو فی کہ ہرج ہمدار گارڈ میرے سر پر کھڑا ہو کر ارد گرد روشنی ڈالتا رہا جب کہ میں اس سے چند انچ کے فاصلے پر موجود تھا۔ پھر مجھے ایک لور جیپ کے انجن کی قریب آتی ہوئی آواز سنائی دی۔ جیپ بھی ٹھیک اسی جگہ آکر رک گئی اور ایک آواز گر گئی۔

"کچھ ملا؟"

"نہیں۔" "تالیا" میرے سر پر مسلہ گھڑنے بول رہا تھا۔

"ٹٹ اپ۔۔۔" اس نے چلاتے ہوئے کلمہ "اسے ڈھونڈو" وہ ہمیں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ایک مرتبہ پھر میرے ارد گرد ہرجوں کی روشنی پھیلنے سننے لگی۔ اب بھٹکے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ "تالیا" وہ لوگ چاروں طرف پھیل رہے تھے۔

زمین میں چھپے حساس آلات نے انہیں میری موجودگی سے خبردار کر دیا تھا۔ ایک ہی کوٹ لینے لینے اب مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔ پھر اچانک میرے منہ سے چیخ نکلتی نکلتی رہ گئی۔ نیلے کس قسم کا کینڑا تھا جس نے میری ٹانگ پر کلمہ میں نے تربیت کے مطابق اپنی سٹیک (ساقوں کے کانٹے سے مدافعت کی) گولیاں تو ٹنگ رکھی تھیں لیکن اس بات کا مجھے علم تھا کہ ہوائی طاقت ایسے ذہریلے سناپ بھی ہوتے ہیں جن کے ذہر کا اثر روکنے میں یہ گولیاں ناہم رہتی ہیں۔ دور کی شدت لور جلن کو چھو کرنے کے لئے مجھے ہار بار اپنے ہونٹ کانٹے پڑتے تھے۔ خدا کا شکر ہوا کہ وہ کوئی سناپ نہیں تھا جس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ اب وہ لوگ آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہتے جا رہے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں آنے والے ایک خیال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ ”اگر یہ لوگ کتے لے آئے تو۔۔۔“

اس سوال نے مجھے پریشان کر دیا۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ وہ خاص نوعیت کے اہم مقلبت پر متعین گارڈ کے پاس سدھائے ہوئے کتے ہوتے ہیں جو شکار کو چند منٹ میں ڈھونڈ لیتے ہیں اور بھاگنے والوں کی تھک بونی کر ڈالتے ہیں۔ پھر جیسے میں خود ہی مطمئن ہو گیا۔ میں نے سوچا ”اگر ایسی بات ہوتی تو اس مرتبہ آنے والی جیپ میں کتا بھی ہوتا۔ غالباً“ قرعہ کھیتوں سے جنگلی جانور بھی بلا وقت ہمیں گھس آتے ہوں گے۔ ان کی آہٹ کا نوٹس لینا خاص طور سے ان حالات میں جن سے بھارتی انواع آج کل دوچار تھیں بہت ضروری تھا۔ ”پھر میری بات کی تصدیق اسی کو بجا آواز نے کر دی جس نے سب کو چلا کر مجھے ڈھونڈنے کا حکم دیا تھا۔“ ”یار کوئی جنگلی جانور ہو گا۔ یہ سارے پوسٹ والے خولہ خولہ پریشان کر دیتے ہیں۔ کم آن ہوا۔“ اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی جیپ سٹارٹ ہونے کی آواز سن کر میری بن میں جان آئی۔

”قربا“ پانچ منٹ تک میں دم سلوے لینا رہا۔ اس اثناء میں میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر اس بات کا جائزہ لے لیا تھا کہ میں بھاگنے کے قتل بھی رہ گیا ہوں یا نہیں؟ ٹانگ پر ہاتھ بھرنے سے مجھے سوجن کا احساس ہوا لیکن جلن اب ”قربا“ ختم ہو چکی تھی۔ لیٹے لیٹے میں نے پانچ چھ مرتبہ ٹانگ کو ہلایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اب سوائے سوجن کے ہلکی معطلہ ٹھیک ہی تھا۔ میں بغیر آہٹ پیدا کئے اب اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ اندر میرے میں میری آنکھیں بھی اچھی طرح دیکھنے کے قتل ہو گئی تھیں۔

○○○

میں نے سرسری نظر اس سڑک پر ڈالی جسے ”ہیڈونگ پارٹی“ استعمال کرتی تھی۔ اس بات کا اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد کہ اب خطرہ ٹل چکا ہے۔ میں اپنی جگہ سے بڑی احتیاط کے ساتھ کھسکا اس درخت کے قریب آ گیا جس کے بعد سڑک کو عبور کر کے مجھے قرعہ ”درکشپ“ تک پہنچنا تھا۔ درکشپ کی مختلف بلڈنگیں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر تعمیر کی گئی تھیں۔ سب ہی بلڈنگوں کی مشابہت ”قربا“ ایک جیسی تھی۔ ان کی چھتوں کو لوہے کے بڑے بڑے شیڈ بنا کر ڈھلپا گیا تھا اور ان پر گہرا خاکی رنگ کر کے کافی حد تک کمپوزٹنگ بھی کر دیا گیا تھا۔ درکشپ کی دیواریں بھی خاکی رنگ میں ہی رنگی ہوئی تھیں۔

سڑک میں نے پھرتی سے عبور کر لی تھی۔ اب میں نزدیکی درکشپ تک پہنچ چکا تھا۔

درکشپ کے گرد اگر دنگے بلب اور سرچ لائٹیں ہنگامی حالات کی وجہ سے ”قربا“ آف تھیں۔ صرف ایک دو بلب کہیں کہیں چلتے نظر آ رہے تھے۔ رات کے وقت ہوئی لڑے کی درکشپیں عموماً بند ہو جاتی ہیں لیکن ایمرجنسی کے دوران کچھ بھی ممکن تھا۔ میں نے ایک درکشپ کی دیوار کے قریب کھڑے ٹرک کی لوٹ میں خود کو چھپا رکھا تھا۔ یہ بڑے بڑے ٹرک عموماً ”لوڈنگ کے لئے استعمال کئے جاتے تھے اور درکشپوں کے ارد گرد کھڑے تھے۔

اب میرا رخ نزدیکی درکشپ کے ٹائیلٹ کی طرف تھا۔ ٹائیلٹ میں اندر اٹھنا صرف ایک باہر کا محدود روشنی والا بلب روشن تھا۔ میں بڑی پھرتی سے ٹرک کی لوٹ سے نکلا اور ٹائیلٹ میں جا کھلا۔ ”قربا“ تین چار منٹ کے بعد ہی میرے جسم سے بندھے پلاسٹک کے مضبوط تھیلے میں رکھی ایندین ایئر فوس پولیس کی دردی میرے پٹے سے پٹے ہوئے لباس پر نخل ہو چکی تھی۔ پلاسٹک کا تھیلہ پلاسٹک کے باہر رکے کوڑا کرکٹ کے ڈرم میں غائب ہو چکا تھا۔

ہوئی لڑے کا تنظیمی ڈھانچہ کو کہ خلاصہ منظم ہوتا ہے لیکن بہت بڑی تنظیم ہونے کی وجہ سے لاکھ حقائق لگاتار کے وجود اس میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسا ”خلاء“ رہ جاتا ہے جس سے ایک ذہین جاسوس اس میں داخل ہونے کا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ مجھے علم تھا کہ یہاں سیکورٹی گارڈ کی اپنی اپنی حدود متعین ہیں اور ہر گروپ کے ذمے الگ الگ فرائض ہیں۔ عموماً ”درکشپوں وغیرہ کے گرد پیرے کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا۔ حالت جنگ کی البتہ اور بات تھی کیونکہ اس وقت ”کمپنڈوز“ کے ممکنہ حملے کے پیش نظر چپے چپے پر مسلح گارڈز موجود رہتے ہیں۔ میری حاصل کردہ اطلاعات کے مطابق کسی درکشپ کے گرد گول تو کوئی سیکورٹی گارڈ مقرر ہی نہیں تھا۔ اگر ایک آدھ ہوا بھی تو مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں اسے ہاتھ پائی کر سکتا تھا۔ ارد گرد دور دور تک کسی کاہم و نشین بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اپنی پی کیپ خاصی جھکا رکھی تھی۔ پہلی نظر میں میری شناخت ممکن نہیں رہی تھی۔

میں دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہا تھا کہ شام سے چھلے گھرے ہلہل اب برس جائیں۔ کبھی کبھی دو چار بوندیں چھتیں اور سلسلہ بند ہو جاتا۔ اب تو جیسے مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ بارش نہیں ہوگی۔

میں بظاہر لا پرواہ سا ملتا ہوا درکشپ کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ جب اچانک میری نیچے کی ساٹس نیچے اور لوہر کی ساٹس لوہر رہ گئی۔ چند گز کے فاصلے سے ایک دوسری درکشپ کی لوٹ سے اچانک ایک سیکورٹی گارڈ نکل کر میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے حفظ بقا کے طور پر

اچانک قدرے ٹیز سے ہو کر چلنا شروع کر دیا تھا۔

جیسے جیسے وہ میرے قریب آتا جا رہا تھا، میرے جسم میں بجلیاں دوڑنے لگی تھیں۔ میری خواہش تھی کہ وہ مجھ سے بغیر ہتھکڑی کے آگے نکل جائے لیکن بظاہر ایسا ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے مجھ سے چند فٹ کی دوری سے پکارا۔
”ٹیکر“ شاید یہاں کسی ٹیکر کی ڈیوٹی تھی۔

اس اثناء میں میرے ذہن نے ایک تجویز سوچ رکھی تھی، ابھی اس کے منہ سے بمشکل ٹیکر ہی نکلا تھا جب میں نے اس کے مخالف سمت منہ کر کے آہستہ آہستہ کھانسا شروع کر دیا۔ کھانسنے کھانسنے میں آہستہ آہستہ نیچے کو جھکا جا رہا تھا۔ آنے والا شاید میری خیریت دریافت کرنے کے لئے تجویز سے میری طرف آیا۔ اسے اپنے قریب محسوس کرتے ہوئے میں نے پھرتی سے سرخ بدلا۔ میرا زوردار گھٹنا اس کے پیٹ کے نیچے سے پر زور زوردار ہاتھ اس کی کٹینی پر ایک ساتھ لگے تھے۔ آدمی کمزور دل کا دکھائی دیتا تھا۔ پچارے کو منہ سے آواز نکلنے کی سہلت بھی نصیب نہ ہوئی۔

زمین بوس ہونے سے پہلے وہ میرے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں آچکا تھا۔ مجھے کچھ نہ سوچنا، اسے بھی میں اپنے ساتھ ہی ورکشاپ میں لے آیا۔

ورکشاپ کا باغیچہ دروازہ کھلا ہی ملا۔ بے ہوش گارڈ کو میں نے ایک کونے میں لٹایا۔ اس کی بے ہوشی کو لمبا کرنے کے لئے میں نے اپنی جیب سے ایک روئل نکل کر اسے سوکھا دیا تھا۔ اب تین بار گھنٹے سے پہلے اس کے خود بخود ہوش میں آنے کا امکان نہیں تھا۔ کوئی اور اسے جگا دیتا تو الگ بات تھی۔

اندروں کی روشنی کے ایک دو بلب جل رہے تھے۔ میری توقع کے عین مطابق ورکشاپ میں ایک جہاز کے انجن کے مخصوص حصے مرمت یا لوور ہانگ کے لئے ایک ٹیبل پر رکھے تھے۔ چند منٹ کے بعد ہی میں ان کے ایک ایک پرزے کو اپنے پاس موجود ایک چھوٹے سے طاقت ور کیمرے کی مدد سے اپنی ”گرفت“ میں لاچکا تھا۔ پرزوں پر لگے مختلف ٹریڈ مارک میرے ذہن میں ساچکے تھے۔

ابھی میں بمشکل چند قدم ہی چل پایا تھا کہ اچانک لڑکھڑایا اور گرتے گرتے پچل میری ٹانگ میں زبردست ٹیس اٹھی تھی، ”غالباً“ زخم بھر سے ہرا ہو رہا تھا۔ درد سے بے حال ہو کر میں نے قریبی دیوار کا سارا لیا۔ ذرا سکون ملا تو دوبارہ قدم آگے بڑھتا چلا لیکن ایک مرتبہ پھر منہ میں آنے والی جھج کو ضبط کرتے ہوئے اسی پوزیشن میں واپس آنا پڑا۔ ”کلف“ میرے خدایا۔ کیا

اتنی زبردست کالیابی کے بعد میں ایک کچھے کی طرح بھارتی ایئر فورس کے تھو آجہاں گ۔ میں نے سوچ لوہ میرا دل ڈوبنے لگا۔

اچانک پیش آنے والی صورت حال نے مجھے رلا دیا۔ میں غصا جذبائی ہو چلا تھا جب قدرت کو مجھ پر رحم آیا اور رک رک کر ہونے والی پونہ پانہی نے اچانک زوردار بارش کی صورت اختیار کر لی۔ اب کم از کم مجھے اتنا تحفظ تو حاصل تھا کہ بارش کی وجہ سے شاید ہی کوئی اس طرف آئے۔

میرے کپڑے بھینچنے لگے تھے۔ میں نے دل کڑا کر کے قدم بڑھائے۔ درد سے میرا برا حال تھا لیکن کسی نہ کسی طرح ٹھٹھٹے ہوئے میں نے خطرے کی پہلی مدد یعنی سڑک عبور کر لی۔ سڑک سے تاروں کی پہلی باز تک کا فاصلہ میں نے قریباً ”کینیوں کے بل“ ہی طے کیا تھا۔

واپسی کا سفر کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر لوہے کی خاردار تاروں میں سے راستہ بنایا اور وہ فاصلہ جو مجھے اپنی تربیت کے مطابق تین یا چار منٹ میں عبور کر جانا چاہیے تھا وہ صدیوں پر محیط نظر آنے لگا۔ خدا خدا کر کے قریباً ”آدھ گھنٹے بعد کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا میں اس کھیت تک پہنچ گیا جہاں مجھے کپڑوں سے ”نہلت“ حاصل کرنا تھی۔

میری سانس بری طرح پھولنے لگی تھی۔ سارا جسم پیسے سے نما گیا تھا، موت کا خوف تھا یا میری قوت ارادی کہ درد کا احساس اب آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ ہنگامی ضرورت کے تحت اپنے پاس پہلے سے موجود اسپرن کی دو تین گولیاں لٹکے کے بعد اب قدرے لائق محسوس ہونے لگا تھا۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ میں لنگڑاتا ہوا کھیت سے باہر نکلا اور اپنے مقررہ راستے پر چلنے لگا۔ مجھے صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے بہت دور چلے جانا تھا۔

صبح جب سورج کی رو پہلی کرن نے تاریکیوں کے چھت جانے کا مشہد سنایا تو میں نے اندازے کے مطابق اپنی خستہ حالی کے باوجود کم از کم دس میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ میں محفوظ تو ہو چکا تھا لیکن ٹانگ کی بری حالت تھی۔ سوجن بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے جلد از جلد کسی ڈاکٹر تک پہنچنا تھا۔

ایک لاری میں بمشکل میں لدھیانہ پہنچا۔ دو دن سفر میں نے زبردستی اپنے آپ کو نارمل رکھا۔ لدھیانہ لڑے کی بجائے شہر سے باہر ہی اتر گیا۔ اب میرا رخ ایک مقامی ڈاکٹر کی دکان کی طرف تھا جس سے میرا تعارف پرکاش نے کرو لیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ابھی کلینک جانے کی تیاری کر رہے تھے جب میں ان سے کرا گیا۔

آخر یہ ملتا ہے کیا؟

پھر جی سے مکمل ہانپوں کے درمیان بھی مد نظر تھے کیونکہ ذریعہ زمین چلنے والی تحریکیں کسی ملک کی سیاست میں کیا کردار ادا کرتی ہیں، مجھے اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ ذاتی طور پر مجھے خود بھی غراہی رہی تھی کہ میں جن لوگوں کو قریب سے کام کرتے ہوئے دیکھوں ہر ایک لمبے عرصے سے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

”ہمارا دوسرا درجہ“ جن دنوں بھارتی اخبارات کی شہ سرخیوں کا موضوع بنا ہوا تھا یہ ہر اسرار شخص مکمل ہانپی تحریک کا سربراہ تھا جسے بھارتی حکومت نے ایک زبردست مقابلے کے بعد دائمی حالت میں گرفتار کر لیا تھا۔ حقیقت کے برخلاف سراسر اس سے گزارنے کے بعد اسے کلکتہ جیل میں داخل دیا گیا تھا۔ جیل وہ حسب روایت ”پر اسرار بیماری“ کی وجہ سے جیل بند گوارہ حکومت نے اس کے نواحین کو ڈارادھکا کر چارہ موندہ کی طبی موت کی تصدیق کروالی تھی اور اس کی بیماری کے سرٹیفکیٹ بھی اخبارات میں پھیل رہے تھے لیکن حقیقت کیا تھی؟ بھارت کا ہر با شعور شہری اس سے آگاہ تھا۔ چارہ کی موت کے بعد ملک کے قریب تمام بڑے بڑے اخبارات کو مکمل ہانپوں کی دھمکیاں موصول ہو رہی تھیں کہ وہ بھارت کے ہر صوبے میں اعلیٰ سول حکام کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنے ”عظیم بیج“ کو ”شرعاً ناجائز“ سمیٹ کریں گے۔

انہوں نے اپنی کارروائیوں کا آغاز کلکتہ کے اس ایس۔ پی کو موت کے گھاٹ اتارنے سے کر دیا تھا جس نے چارہ موندہ کی حقیقت کی تھی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ ابلت کاٹھان ملے سے بچ گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ لمبی سرکاری رخصت لے کر بجائے مکمل دہمچش ہو گیا تھا۔

○○○

میں شام ڈھلے رائے کوٹ پہنچا۔ پھر جی گھر پر نہیں تھے، کسی بیٹنگ میں گئے ہوئے تھے۔ میری آمد کا سننے پر جی گھر سے نکلتے ہوئے تھے۔ میں گھر سے لئے چلی آئی۔

”تمسکار“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے۔

میرے ذہن میں ابھاری وہ تصویر ابھری جس میں پارٹی نے اپنے دونوں ہاتھ اسی طرح سینے پر باندھے ہوئے تھے۔ اس کی سرکیش آنکھوں کے گہرے پائوں میں ’میں ڈوب ڈوب گیا۔ پونم کو دیکھتے ہی ایک عجیب سا سرور — ایک طہارت — ایک تمسیر سے سکون کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کے صحن میں ایک مقدس تھا۔ رک رکھتا میں اک جلیب۔ وہ ایسی ہی حسین تھی جیسے کرسٹل کا پڑا ہوا ہے۔ وہ صورت فرشتے ہوتے ہیں۔

اسے دیکھ کر مجھے سکول کے زمانے میں پڑھی دواؤں کی ساری طبیعتیں یاد آ جاتی تھیں۔

انہوں نے مجھے پہچانتے ہوئے خصوصی توجہ اور مکمل مہربانی سے مجھے دیکھا۔

”مکمل ہے سوچیں اپنی زیادہ کیسے ہو گئی — شاید کسی ”ٹھوس“ نے کہا ہے۔“ انہوں نے میری سوچیں ہونے لگیں۔

”جنت اصل میں کل رات ایک جگہ پھنس چکے ہوئے کسی کینزے نے کل لیا تھا۔ اس وقت تو کچھ محسوس نہ ہوا۔ اب صبح سے درد ہونے لگا ہے۔“ میں نے متلاطم چہرہ کیا۔

”تو میں کوئی تیار ہے احتیاط کی وجہ سے یہ حالت ہوئی ہے۔“

انہوں نے مجھے دو انجکشن لگائے۔ ہانک پر معمولی سی نشترنی کے بعد پٹی باندھی۔ دو اینٹی کی ایک فہرست لکھ کر مجھے تھوڑی دور نہیں لے کر چلا گیا۔ ایک رکتہ میں پتلے میں سٹیشن پہنچا۔ جیل ایک لاکر میں اپنی ضروری اشیاء محفوظ کیں اور دوبارہ رکتہ کے ذریعے پرکاش کے پاس جا پہنچا۔ میری حالت دیکھ کر وہ گہرا گھبراہٹ۔

”کیا ہو؟“ کیا ہو؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”پتلے یہ لاؤ پھر دوسری بات کرنا۔“ میں نے دو اینٹیوں کا نسخہ اسے تھما دیا۔

پرکاش اگلی بات کرنے سے پہلے بھاگا بھاگا باہر گیا۔ اس کی واپسی چند منٹ کے بعد ہی ہو گئی۔

اسی دن میں ’میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے ایک شدید کھلی گھڑی تھی۔ پرکاش مطمئن ہو گیا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ گھر میں کسی کو اس حادثے کی اطلاع نہ دے۔ میں انہیں خوار خوار پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ پرکاش نے میری یہ درخواست اس شرط پر مانی کہ میں کم از کم ایک مہینہ کسی فیملی جہازوں کا بڑی کڑی شرط لگاتی تھی اس نے۔۔۔!

نہیں دن میں نے بیماری کی حالت میں گزارے۔ ہانک کی سوچوں نے بخار کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ پھر بخار شدت اختیار کرنے لگا لیکن میں نے بڑے جبر سے اپنی حالت کو پرکاش کے سامنے بظاہر نارمل بنائے رکھا۔ مجھے تشویش تھی کہ وہ گھبرا کر کہیں باہر جی کو اطلاع نہ کر دے۔ تیسرے دن میری حالت خاصی سنبھل گئی۔ اب مجھے چلنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔ صحت یاب ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے اپنے ”بی“ کی فکر کی اور اسے ”محفوظ ہاتھوں“ کے ذریعے اپنے ملک میں پہنچا دیا۔

پانچویں روز جب میں ابھی طرح چلنے کے قابل ہو گیا تو میں نے رائے کوٹ کو رخصت سفر پندرہ میل پرکاش کام کی زیادتی کی وجہ سے لڑھکانہ ہی رو گیا۔ پہنچنے کا دن تھا میں نے سوچا اگلے روز چھٹی ہے۔ پونم سے بھی ملاقات رہے گی۔ میرا دل اس مرتبہ سوای جی کو ”چیک“ کرنے کا تھا کہ

اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں راستہ بھول کر پہیوں کے دھنکے میں
آٹکا ہوں۔ وہ لمبے امروہو جاتے جو اس کی محبت میں گزرتے۔

”کھلی عتاب رہے شریک کی اتنے روز؟“ اس نے غصت بھرے لہجے میں پوچھا۔
میں اٹھتے کیا تاتا میرا جی چاہتا تھا اس سے کہہ دوں کہ میں اس سے بچ کر کھلی جا سکتا
ہوں۔ اس کے قصور سے چھٹکارا میرے لئے کب ممکن ہے؟ لیکن رعب حسن تھا کہ اسے کہنے
کو ہمت بدل بدل جاتی تھی۔

”دراصلحت خراب تھی، چوت لگ گئی تھی۔ سوہانم لوگوں کو پریشان کیوں کروں؟“ میں
نے جواب دیا۔

”کھلی گئی چوت؟“ اس نے بے چینی سے کہا۔

”ہیمل۔۔۔!“ میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”لور پوئم لہا گئی۔ دھنک رنگ اس کے ٹھوکوں پر قوس و قزح کی طرح پھیل گئے، اس کی جیا
آلو نظریں جھک جھک گئیں۔“

”آپ کو تو ذوق کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں۔۔۔ میں چائے لاتی ہوں آپ کے لئے۔“
اس نے نظریں جھکائے ہوئے کہا لور ہا ہر چلی گئی۔

پوئم دلیس آئی تو میں کپڑے بدل کر تیار ہو چکا تھا۔ آج میں نے دوبارہ ”انفیرو کلب“
جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ہوائی لڑے پر گزرنے والی قیامت کے اثرات کس
حد تک باقی ہیں۔ پوئم کو ساتھ لے جانے کے لئے اب مجھے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت
نہیں تھی نہ ہی شاید پوئم کو۔ ہم دونوں صرف انہم محبت کے لئے گھر والوں کے سامنے اپنی
مددگارگی کا اعلان کر دیا کرتے تھے۔

پوٹی کا کلن دیر انتظار کرنے کے بعد پھاڑا، ہم دونوں کلب کی طرف روانہ ہو گئے۔
اس مرتبہ میں نے سوڑا سائیکل پر سفر کرنے کو ترجیح دی تھی، ہم کلب میں پہنچے تو ایک مرتبہ پھر
حریصانہ نظروں نے پوئم کا اعلان کر لیا لیکن میں نے پوئم کا ہاتھ تھامے رکھا لور ایک کونے میں
رکھی میز سجھلی لی۔۔۔ آج سوہانی تھی نظر نہیں آ رہے تھے لور میرے دل سے دعا تھیں کہ وہ
تھی کہ خدا کرے اس کی مخصوص صورت ہیمل دیکھ لی نہ دے۔

میں نے پوئم کی خواہش پر ”صرف کلن“ کا آرڈر دیا لور اس میں کھو گیا۔۔۔ او کہتے
خوبصورت لہجے تھے جو اس کی محبت میں گزرتے تھے! زندگی انہی خوبصورت لمحوں سے تو
مہارت ہے۔

”آپ سوہانی جی کے آخرم نہیں جائیں گے کیا۔۔۔؟“ پوئم نے اچانک پٹپٹے پٹپٹے سوال
کر دیا۔

”میرے لومہ! یہ وقت ایسے موضوعات پر گفتگو کرنے کا ہے؟“ میں نے جان چھڑانے کے
لئے کہا۔

”ایک بات کھوں پر کاش ہو۔۔۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”اگر سوہانی کی بات کرنی ہے تو نہ کہہ ہیں لور کوئی بات ہو تو کہہ ڈالو۔“ میں نے اس کی
آنکھوں میں جھانکتے ہوئے غلام آلو لہجے میں جواب دیا۔

”نہالے مجھے کبھی کبھی یہ احساس کیوں ہونے لگتا ہے کہ آپ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔“
اس کی اس بات نے ایک لمحے کے لئے تو سسٹی کی ایک لڑکھری رینگ کی ہڈی میں دوڑا دی۔

”کیا لگتا ہے؟“ میں نے لمحہ شوخ ہٹائے رکھا۔

”کچھ بھی۔۔۔ میں شاید وضاحت نہ کر پاؤں۔ مجھے آپ کی طرح جیسے بڑے لفظ بولنے
نہیں آتے۔ بس مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے پچھلے کئی برسوں سے مجھے آپ کا انتظار تھا لور اب تو
میں کا سوا گھر بیتا نظر آتا ہے لیکن یہ کیا جذبہ ہے جو میرے اندر ہی اندر مجھے میری کم باتیں کا
احساس دلاتا رہتا ہے، نہالے مجھے کیوں دشاوش نہیں ہو تاکہ آپ کو کبھی پتا بھی سکوں گی؟“

اس لمحے اس کی بات نے مجھے بھی جذباتی کر دیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ پچھلے کئی روز
سے مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں پاتی تھی۔ اب شاید میرے پانچ روز تک بغیر اظہار
دیئے عتاب رہنے کی وجہ سے اس کو معینہ لگی تھی لور اس نے اپنا لہو اگل دیا تھا۔

میں اسے کیسے غماز کہہ دل کی گھڑی کا دستور ہی نہلا ہے۔ ہیمل سب سے پہلے آنے والا
مسافر ہی اس کا مالک بن بیٹھا ہے۔ جس کیفیت کا وہ شکار تھی، میں بھی اسی آگ میں جل رہا تھا۔
پوئم سے میری محبت اس جانب کی بات نہیں تھی جو زندگی کی سطح پر ایک لمحے کے لئے نمودار ہو
کر عتاب ہو جاتے اس میں تو درہا بھی گھرائی تھی۔ اس کی تپش تو مجھے کبھی بھی جلا سکتی تھی۔
ہم دونوں ایک دوسرے کی ٹھنکی ہوئی آگ میں جل رہے تھے۔

”ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ تم بیٹھ حتی نقطہ نظر سے کیوں سوچتی ہو؟“ میں نے دل
پر جبر کے سحرانے ہوئے کہا۔

”چھاپا ہمارے ساتھ دیشو پاترا ضرور چلتے۔ پوٹی جی آپ کو منع تو کریں گے لیکن میرے
لئے۔۔۔ وہاں مجھے دل ہر صفت پوری ہوتی ہے۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے ہل کر

میں نے اپنی جھگڑتیاں۔ اس تعارف نے ہی راجکار کے ارادوں پر اوس ڈال دی تھی لیکن وہ جلدی ہتھیار پیچھے دلا دکنائی نہیں دتا تھا۔

”آپ لوگ کبھی میس میں آئیے نہ۔“ اس نے مجھے بڑی پر غلوص دعوت دی۔
اندھے کو کیا چاہیے وہ آنکھیں — میں نے ایک آدھ فھرے میں اپنی لدھیانہ معصوفیت کا رونا رو کر اس کی پر غلوص دعوت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے وعدہ کر لیا کہ ضرور آؤں گا۔

لائٹ لیفٹیننٹ راجکار کی درخواست پر ہم نے ایک مرتبہ پھر اس کی منگوائی ہوئی کٹنی لیا۔
کٹنی کی چٹکیں لیٹے ہوئے وہ ہاتس تو بظاہر مجھ سے کر رہا تھا لیکن اس کی نظروں نے پونم کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ پونم کو سخت کوفت ہو رہی تھی۔ وہ عورت تھی اس لئے مرد کی حسیں نگاہوں کا مجھ سے زیادہ بہتر اندازہ لگا سکتی تھی۔

”مجھے آپ کی مارشل لائف بہت پسند ہے۔“ میں نے بالآخر مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہہ دیا۔

”شکریہ آپ لوگ آئیے تو آپ کو کچھ دکھائیں“ میں ایریڈانیکل انجینئر ہوں۔“ اس نے میری بات سے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

قریباً گیارہ بجے رات تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ میں اسے ہیر پھیر کر ایئر فورس کی طرف لے آتا تھا۔ دورین منگلو میں نے اس کو اس بات کا مطلقاً احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ فوج کی تنظیم (Organisation) کے متعلق معمولی سی معلومات رکھتا ہوں کیونکہ ہم جنگ کے موضوع پر بات کر رہے تھے۔ اس لئے راجکار کے سامنے مجھے (خاکم بدہن) اپنے ملک کے خلاف خوب خوب زہر اگانا پڑتا تھا۔ جواب میں مجھے انتہائی اہم معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔ جدید ترین ایئر کنٹرول سسٹم، بھارتی فضائیہ کے دفاعی اقدالت، حملہ کرنے کی صلاحیت کا اندازہ وغیرہ وغیرہ۔

گیارہ بجے کے قریب جب وہ ٹائیلٹ جانے کے لئے اٹھا تو پونم نے سکھ کا سانس لیا۔ اس اثناء میں وہ زبردستی ہماری منگلو میں صرف ”ہوں“ ہی ”کرتی رہی تھی۔
”پر اتنا کہ لئے اب اس مصیبت سے جان چھڑائیے اور گھر چلئے۔“ اس نے ہاتھ ہاتھ سے ہوتے کہہ دیے۔

”اخلاق بھی کسی چیز کا نام ہے اور پھر اس بے چارے نے ہم پر ایسے جھکس روپے ضائع کئے ہیں۔ اسے کم از کم جی بھر کے اپنا دیدار تو کرنے دو۔“ میری بات پر پونم بھر جا گئی۔

عجب بات تو یہ تھی کہ کلب میں ابھی تک کسی کے منہ سے میں نے ہوائی لڑے پر ہونے والے ”واقعات“ کے متعلق کچھ نہیں سنا تھا یا پھر ان لوگوں کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے کیونکہ بھارتی سیکورٹی کم از کم اتنی مضبوط نہیں تھی کہ وہ ایسی بات کی ہوا کسی کو گلے ہی نہ دیتی۔ نئے سکولاروں کی آمد، افسران کے بدلے، فکائیتیں، نئے نئے اعمشلت اور مختلف سیکٹل (جن کا موضوع زیادہ تر یہی ہوتا تھا کہ فلاں افسر کی بیوی فلاں کیڈٹ سے چٹکیں بڑھا رہی ہے اور فلاں کی فلاں سے) یہ سب وہ موضوعات جن پر عموماً ”میس“ میں منگلو سننے کو ملتی تھی۔

ہم اگرچہ دوسری مرتبہ کلب میں آئے تھے لیکن ابھی وہاں کے مستقل بیٹھے وانوں نے پونم کو نہیں بھلایا تھا۔ ان کے لئے ہاٹ حسد بات یہ بھی تھی کہ اعلیٰ فوجی افسران کے ہوتے ہوئے آخر ایک سول لڑکے سے پونم کی دوستی چھ معنی دارو؟ کیونکہ اعلیٰ فوجی افسران کی ذہنی تربیت ہی کچھ اس انداز میں کی جاتی ہے کہ کم از کم لڑکیوں کی حد تک وہ خود کو بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت جانتے ہیں۔ عجب بات کہ بھارت میں آج تک مارشل لاء نہ لگنے کے باوجود وہاں فوج کے خلاف خاصی نفرت پائی جاتی ہے۔ خصوصاً پولیس اور فوج کے درمیان تصادم اور تلخ کلائی تو آئے روز اخبارات میں پڑھنے کو ملتی ہے۔

ہمیں بیٹھے ہوئے ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا جب میں نے ایک سمارٹ براہمن آفیسر کو اپنی میز کی طرف دیکھا، وہ سول کپڑے پہنے ہوئے تھا۔

”اگر آپ کی اجازت ہو تو.....؟“ اس نے بڑے مودب لہجے میں پوچھا۔

”لوہ! کیوں نہیں، کیوں نہیں!“ میں نے خوش اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”لائٹ لیفٹیننٹ راجکار۔۔۔۔۔“ اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”پر کاش اور پونم۔“ میں نے پونم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پونم نے ہاتھ ملانے سے بچنے کے لئے پہلے ہی ہاتھ ہاتھ دیئے تھے۔ کلب میں آنے والی کسی بھارتی عاری سے یہ امید تو کم ہی ہوتی تھی کہ وہ شرم و حیا کا مظاہرہ کرے لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کبھی کبھی کوئی ”بھارتی ملا“ بھی آ جاتی۔۔۔۔۔ جس کے متعلق عموماً وہ لوگ بھی اندازہ لگاتے تھے۔ اور کل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔ دو چار روایتی باتوں کے بعد ہم بے تکلفی سے آپس میں منگلو کرنے لگے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم تو ”کلب“ کو ”واحد شرفانہ تفریح گاہ“ سمجھ کر یہاں چلے آتے ہیں کیونکہ دور نزدیک اور کوئی اچھی جگہ بیٹھنے کے لئے نہیں ملتی، پونم کو

میں سوئے میں موت کے گھٹات اندر دیا جائے گا۔ کارروائی مکمل ہونے کے بعد پولیس کے اعلیٰ افسروں کو ٹیلی فون کے ذریعے اس قتل کی اطلاع دے کر آئندہ خطرناک تبدیلی کی دھمکی دی جائے۔

قریباً دس چورہ صف تک بحث مباحثہ کرنے کے بعد پلاؤن لوگوں نے کثرت رائے سے پولیس کی بات مان لی اور اس بات کا فیصلہ ہوا کہ پولیس افسر جو جائدہ حر کا پولیس کپتان تھا اور جس نے وہ مکمل ہائیوں کو گرفتار کرنے کے بعد فراری کے بدلے گولی مار دی تھی (دن دہائے قتل کیا جائے۔ اس سلسلے میں لوگوں نے امریکہ سمیت کایم منتخب کیا جو مقامی کیونسٹ پارٹی کا سرگرم کارکن تھا۔ چپ چپ والیس چلا آیا۔ اس واردات کے لئے انہوں نے دس دن بعد کی تاریخ مقرر کی تھی کیونکہ وہ افسر جسے گولی مارنی تھی من دونوں ڈیرہ دن کیا ہوا تھا۔

راہنکار والیس آیا تو ہم جاننے کے لئے تیار تھے۔ میں نے مزید وقت اس کی "بچی صحبت" میں نہ گزارنے پر معذرت کرتے ہوئے اس سے اجازت لی اور ہم اٹھ گئے۔ فلائٹ اینٹینٹ راہنکار ہمیں باہر تک پہنچانے آیا تھا۔ آخری لمحے تک پونم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اب تو میں بھی رنجیت محسوس کرنے لگا تھا۔ سردی میں خلصا اعتقاد ہو گیا تھا لیکن پونم کی بھرنی نے مجھے سارے راستے لٹھک کا احساس نہیں ہونے دیا۔ خواہ مخواہ میں کسی کی خیر عاقبت نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے گھر سے کچھ قاصدے پر سوز سائیکل کا انجن بند کر دیا۔



گھر میں داخل ہوتے وقت میں نے خاصی احتیاط سے کم لیا تھا۔ میری متوقع آمد کے پیش نظر فامانی نے دروازہ کھلا رکھا تھا۔ پونم دوسرے دروازے سے اپنے گھر چلی گئی۔ میں اندر داخل ہوا تو چونک پڑا۔ بیٹھک کی لائٹ جل رہی تھی۔ عمو! اس وقت لائٹ نہیں جلا کرتی تھی اور سارے گھر والے دس بجے ہی لی ٹیوٹن کے سو جاتے تھے۔

پولیس رات کو درگئے گھر ضرور آیا کرتے تھے لیکن انہوں نے گھر میں بھی اتنی رات گئے تک کم نہیں کیا تھا۔ عمو! من کی بیٹھکیں من کے دفتر میں ہی ہوا کرتی تھیں۔ شاید کوئی مسلمان ہو؟ میں نے سوچا لیکن ایسا کون سا مسلمان تھا جس کی آمد کی خبر مجھے نہ ہوتی کیونکہ اس دور میں میری کوشش یہی رہی تھی کہ اس گھر میں آمدورفت رکھنے والے ہر شخص کے حلقے مجھے معلومیت حاصل ہو جائیں۔ مبادا کوئی میری لاطمی میں میرے لئے خطرہ نہ بن جائے۔

میرا فطری جتن تھا یا میرے پولیس کا تقاضا کہ میں نے چھپ کر وہاں موجود لوگوں کی کھنگرنے کا ارادہ کر لیا۔ گھر کے باقی تمام لوگ لی ٹیوٹن کر سو رہے تھے۔ سردیوں کی وجہ سے بیٹھک کا دروازہ بند تھا۔ اندر شاید کسی معاملے میں گرم گرم بحث ہو رہی تھی۔ میں جلی کی طرح بغیر آواز پیدا کئے بچوں کے بل آگے بڑھا اور نیم وا دروازے سے کلن لگا دیا۔

وہ لوگ کسی پولیس افسر کو قتل کرنے کے طریق کار پر بحث کر رہے تھے۔ پولیس اور من کے حامیوں کا خیال تھا کہ اسے دن دہائے بھرے بازار میں گولی مار دی جائے خواہ اس میں کوئی ور کر ہی کیوں نہ کم آجائے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس طرح دہریہ سے کی گئی واردات کا اثر زیادہ دیرپا ثابت ہو گا اور پولیس گھبرا جائے گی۔ اس طرح ممکن ہے پولیس کے اعلیٰ افسروں بھی آئندہ "مکمل ہائیوں" کو گرفتار کرتے ہوئے گھبراہٹ محسوس کریں۔ جب کہ دوسرے گروپ کا کہنا تھا کہ بجائے شور شراب کرنے کے چپ چاپ اپنا کام کیا جائے اور اس پولیس افسر کو رات

دیشنو یا ترا

باہو جی اور ان کے ساتھیوں کے متعلق سوچنا سوچنا میں سو گیا۔ — مج پونم نے آکر مجھے جگایا۔ آج چونکہ چھٹی تھی اس لئے وہ گھر پر ہی تھی۔
باہو جی سے ناشتے پر ملاقات ہوئی ”کب آئے تھے یار تم لوگ؟“ انہوں نے بے تکلفی سے پوچھا۔

”آپ اس وقت معروف تھے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ایک لمحے کے لئے باہو جی کے چہرے کا رنگ بدلا، لیکن پھر وہ سنبھل گئے۔
”لوہ بس کیا بتاؤں کل تمہارے جاتے ہی کچھ دوست آگئے تھے۔ وہ لوگ بند تھے کہ آج میرے گھر ہی تاش کھلیں گے۔ میں نے تمہاری ماما کو سوتے دیکھ کر ہل کر دی۔ کیا کروں یا روہ لوگ پہلے ہی کہتے ہیں۔ میں بیوی سے ڈرتا ہوں۔“ میں بھی ان کے ساتھ ان کی بات پر ہنس پڑا۔

باہو جی کا رات والا روپ میں نے ابھی تک نہیں بھلایا تھا۔ میں نے فی الحال اس معاملے کو جوں کا توں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”بیٹا ہم لوگ دیشنو یا ترا پر جا رہے ہیں۔ اب زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں، سوچتی ہوں جیتے جی دیشنو یا ترا کے ورژن کر لوں۔“ ماما جی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔
”ضرور کیجئے۔“ میں نے فوراً ”لن کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ قدرت نے بیٹھے بٹھائے ایک مشکل جو آسان کر دی تھی۔

باہو جی نے ناشتہ کرتے کرتے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو۔

”آدمی کو تھوڑا بہت ”آرتھوڈکس“ بھی ہونا چاہیے باہو جی!“ میں نے لن کے کچھ بولنے سے قائل ہی کہہ دیا۔

جواب میں انہوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ دیشنو سے لے کر برہما تک سب کو مغلطات

سے نوازے ہوئے ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں ان کے متعلق لکھی باتوں کا حوالہ دے کر پوچھا۔

”سب کیا خیال ہے؟“

”جو ماما کی کہ۔۔۔“ میں نے دوبارہ ہنسنے ہوئے کہا۔

”یعنی مرنے کی وہی ایک ٹانگ۔۔۔“ وہ بھی مسکرا دیئے۔

ماما جی اس اثناء میں خاموش بیٹھی رہیں کیونکہ ایسی باتیں انہوں نے بچپن سے پہلے بھی ہزاروں مرتبہ سنی تھیں۔ جس کا ان کے نزدیک ایک ہی جواب تھا کہ وہ ”سنیا گئے ہیں۔“

”دیشو پوجا“ بھارت کی عبادت سب سے بڑی پوجا ہے۔ قریباً سارے بھارت کے ہندو اس دیوی کو پوجتے ہیں۔ ورنہ میرے مشاہدے میں تو یہی بات آتی تھی کہ جوں جوں پنجاب سے آگے چلتے جائیں دیویاں تبدیل ہوتی جاتی ہیں۔ مثلاً کلکتہ میں جتنی پوجا ”کالی ماما“ کی ہوتی تھی اتنی پنجاب میں نہیں ہوتی تھی یا پھر اتر پردیش میں جتنی پوجا ”درگا مائی“ کی کیجاتی تھی اتنی مہاراشٹر میں نہیں ہوتی تھی۔ ایک ”دیشو ماما“ ایسی دیوی تھی کہ دنیا بھر کے ہندو اس کی پوجا کرتے تھے ورنہ تو ہر ایک نے مرضی کا بھگون گھڑا ہوا تھا۔

بچپن میں مجھے ماما جی اور پونم کے ساتھ بیچ کر اپنی دانست میں اپنی جان چھڑانی تھی جب کہ پرکاش نے بھگون کا شکر لوا کیا تھا کہ وہ شدید سردی سے بچ گیا ہے ورنہ کشمیر کی بریلی ہوائیں تو ہڈیوں میں کھس جاتی ہیں۔ سالگ رام بھارے کو سب معمول چھٹی نہیں ملی تھی۔ پر ننڈو کو بچپن سے یہ کہہ کر روک لیا تھا ”اس پر ماما کا سلیہ نہ پڑے تو بہتر ہے۔ اتنی سردی بھارا کھل برداشت کرے گا۔“ خود ننڈو بھی پہاڑیوں میں پیدل چلنے سے خوفزدہ تھا۔ اس کی خواہش تو بس یہی تھی کہ بچپن سے اس پرکاش اٹکل کے پاس لدھیانہ چھوڑ آئیں۔

○○○

ہم چاروں تیزی سے لدھیانہ سے بس کے ذریعے جوں جا رہے تھے جہاں سے آگے ہمیں کنڈہ جانا تھا۔ جو پہاڑوں کے دامن میں ایک واوی ہے جس تک پہنچنے کے لئے انتہائی دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

قریباً شام کے وقت ہم چھاگوت پہنچے۔ راستے میں جگہ جگہ بھارتی افواج کے کوائے گزرتے نظر آتے۔۔۔ سارے بھارت پر جنگی جنون طاری تھا۔ خصوصاً چھاگوت کے گرد و نواح میں تو سرحدی علاقے ہونے کی وجہ سے چپے چپے پر حفاظتی اقدامات کئے گئے تھے۔ یہ بس زیادہ تر یاत्रीوں پر ہی مشتمل تھی جو سارے راستے ”ماما کی جے جے کار“ کرتے آئے تھے۔

مجھے بھی پہلے خواہش تھی کہ ساتھ دیا پڑا۔

یہاں بھی سرحدی شہروں کی طرح یہاں ہات سننے میں آتی: ”فلاں جگہ سے پاکستانی جاسوس پکڑا گیا فلاں جگہ وہ لوگ کنویں میں زہر ملا رہے تھے۔“ بھارتی حکومت پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے اپنے ملک کے علاوہ دنیا بھر میں بھی خوب خوب پرائیگنڈ کر رہی تھی۔ یہ طریقہ بھارتی عوام کو یقین دلانے کے لئے اپنایا گیا تھا کیونکہ بھارت کے سنجیدہ ملتے شدت سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ جنگ نہ لگے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بھارتی سرکار خولہ خواہ مشرقی پاکستان کے پھڑے میں ٹانگ اڑائے۔

لیکن آئے روز اخبارات خاص طور سے کانگریسی اخبارات میں پاکستانی جاسوسوں اور ”مکس و میٹھس“ (کمائنڈرز) کے متعلق خبریں چھپتے رہنے سے بالآخر بھارتی عوام بھی دھوکے میں آ گئے تھے۔۔۔ ان کے دلوں میں بھی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ جہاں کہیں کوئی شبہ شخص نظر آتا پہلے اس غریب کی اچھی بھلی ٹھکانی ہو جاتی۔ اُس کے بعد اُسے پولیس کو سونپ دیا جاتا۔ بعد میں اکثر بے گناہ جاہل ہوتے تھے۔

چھاگوت چھوٹا سا شہر ہے لیکن ہاچل، پنجاب اور کشمیر کا سٹیم ہونے کی وجہ سے یہاں کچھ زیادہ ہی گرمائی دیکھنے میں آتی ہے جس میں زیادہ ہاتھ سلنا کٹھن، شیزن پور اور اس کے گرد و نواح میں بسنے والی گوجر قوم کا بھی ہے۔ اس خطے کو قدرت نے اپنے لازوال حسن سے نوازنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ پنجاب اور کشمیر کے حسن کی آمیزش یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ گوجر قوم کے مردوں کو کھیتی باڑی کے مواقع میسر نہ ہونے کی وجہ سے اور تو کوئی کام کرنے کو ہوتا نہیں، وہ ”تجہ گری“ شروع کر دیتے ہیں۔

صبح چھاگوت میں ان علاقوں سے تازہ دودھ آتا ہے اور شام کے بعد عورتیں۔ خصوصاً چھاگوت چھوٹی اور شہر میں واقع دوسرے رجمنٹل ہیڈ کوارٹرز میں ان کی آمد و رفت لگی رہتی ہے۔ سرحدی علاقوں سے لوٹنے والے سپاہی بغل میں رم کی بوتل دہائے (جو انہیں سستے داموں مل جاتی ہے) قبضہ خاں کا رخ کرتے ہیں۔ یہی ”دلچسپی“ گور داسپور، دنا نگر اور چھاگوت کے ارد گرد بسنے والے رنگین مزارعوں کو کشش کشش چھاگوت کھینچ لاتی ہے۔ کسی نہ کسی تماشین کا کسی نہ کسی فوجی سے پٹ جانا یہاں روزانہ کا معمول بن چکا تھا۔

چھاگوت میں بس نے قریباً آدھ گھنٹہ فہرنا تھا۔ ہم نے بھی دوسرے یاत्रीوں کی طرح لاری لڑے میں واقع ایک ہوٹل کا رخ کیا جہاں ”دیشو ڈھلے“ پر ہر چیز نئے بھلا بک رہی تھی۔ ہوٹلوں والے یاत्रीوں کو خصوصاً دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔

وال پھلکے زہر مار کر کے ہم لوگ واپس بس میں آ گئے۔ ٹکٹ خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار کھڑکیوں پر لگی تھی۔ یہ وہ یاتری تھے جو ٹکٹ کے دوسرے حصوں سے میل آئے تھے اور اب جنسین جوں تک جانے کے لئے بھی ٹکٹ ملنا مشکل نظر آتا تھا۔ عموماً "دوسرے دن باری آتی تھی۔ ہم خوش قسمت تھے جو لدھیانے سے براہ راست جوں جا رہے تھے۔ پچھاگوٹ سے جوں پہنچنا ایک مسئلہ بنا ہوا تھا کیونکہ ان دنوں پچھاگوٹ کو کشمیر سے ملانے والا واحد رابطہ سڑکیں تھیں۔ پھر ہوائی جہاز۔ ابھی تک پچھاگوٹ سے آگے ریلے لائن نہیں بنی تھی۔ (ریلے لائن بعد میں کنوہہ تک اور پھر جوں تک بن چکی ہے۔)

○○○

کنوہہ بس پہنچی تو ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ یہاں کشمیر اور پنجاب کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں اور بہت بڑی چمک پوسٹ بنائی گئی ہے۔ بس کے رکتے ہی چار انٹیلی جنس والے اندر گھس آئے۔ وہ ہر مسافر کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اپنی انٹیلی جنس کے لئے قریباً ہر مسافر کا سلیٹ چمک کر رہے تھے۔ مسافروں کی تو تو میں میں بھی جاری تھی لیکن وہ اپنے کام میں مصروف تھے۔

میں اور پونم، ماما اور موسیٰ جی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ پونم کھڑکی کی طرف بیٹھی تھی۔ اس نے انٹیلی جنس والوں کو دیکھتے ہی اپنا رخ موڑ لیا تھا اور باہر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ یہ پاؤ جی کی تربیت کا اثر تھا یا پھر پونم کا اپنا کوئی کپکپس، حلاکتہ اس کا سا بھائی فوج میں ملازم تھا اسے فوج سے کوئی خاص انس نہیں تھا۔

"کیا مصیبت ہے ان کبوتروں کو بھی یہیں آنا تھا؟" اس نے ناگوار لہجے میں آہستہ سے کہا۔
"تم آخر انہیں اتنا برا کیوں سمجھتی ہو۔ بمبئی دیش کے رکھوالے ہیں یہ لوگ ہماری رکشا کرتے ہیں۔" میں نے اسے چڑانے کے لئے کہا۔

"بھائو میں گئے یہ اور ان کی رکشا۔ آپ کو تو بس موقع ملے ان کی تعریف کرنے کا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ اپنا "کام" مکمل کر کے چلے گئے۔

کنوہہ سے جنوں تک شاید ہی سڑک کیس خالی نظر آتی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ بھارتی مسلح افواج کے کوائے نظر آ رہے تھے۔ سڑک کے کنارے کئی مقلات پر انہوں نے مورچے کھودے ہوئے تھے جن میں سے طیارہ شکن توپیں صاف جھانک رہی تھیں۔ اپنے اسلحے اور مورچوں کو انہوں نے اس طرح کیونچلایا ہوا تھا جیسے وہ جنگ لڑ رہے ہوں۔ جن کیس راستے

میں کراسنگ آتا، ہمیں رکنا پڑتا اور جب تک فوجی کوائے گزر نہ جاتا، ہم کھڑے رہتے۔ جنوں ہم رات کے وقت پہنچے۔ جنوں کا لاری لڑا کم از کم میری معلومات کی حد تک چندی گڑھ کے بعد پنجاب کا سب سے خوبصورت لاری لڑا ہے۔ یہاں حکومت نے ایک شاندار اور جدید طرز کی سرائے لڑنے کی حدود میں بنا رکھی ہے۔ یہ سرائے یاتریوں کی ضرورت کو مد نظر رکھ کر بنائی گئی ہے جن کی آمد کا سلسلہ سارا سال جاری رہتا ہے۔ اس کے علاوہ غیر ملکی سیاحوں کا آنا جانا بھی لگا رہتا ہے۔

سرائے میں کمرہ حاصل کرنا جوئے شیر لانا ہے۔ خدا خدا کر کے ایک مسافاتی کی مٹھی گرم کی تو ہمیں ایک فیملی روم مل گیا۔ یہ کمرہ تو خلاصہ بڑا تھا لیکن اس میں صرف دو چار بایس تھیں تھیں۔ یہاں وہ کپل کام آیا جو ہم اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ وہ میلے پچھلے کپل جو ہمیں سرکاری طور پر ملے تھے وہ ہم نے نیچے بچھائے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کون کون سوئے اور نیچے کون؟ خاصی روداد کے بعد یہ طے پایا کہ چلتوں پر ماما اور موسیٰ جی سو جائیں۔

ساری رات سرائے میں گونجنے والے، مجنوں کی آوازوں اور سردی نے جگائے رکھنے سونے کا ہوش کے قند مختلف علاقوں سے آئی ہوئی کھتا کرنے والوں کی ٹولیاں نے اپنے اپنے کمروں کو سنوڈیو میں تبدیل کر لیا تھا اور دیشنوماتا کے پالک اس کی عظمتوں کا رونا رو رہے تھے۔ ساری رات میں جانتا رہا اور ان کے عجیب و غریب دھرم پر لعنت بھیجتا رہا۔

صبح تھوڑی دیر کے لئے اس وقت لوگ آئی تھی جب پونم نے اپنی گرم شل بچھ پر زبردستی ڈال دی۔ وہ قریباً آدھی رات کے بعد دونوں بوڑھیوں کے ساتھ "بچن کھتا" سننے چلی گئی تھی۔ واپس پر اس نے مجھے بیدار پایا کیونکہ صبح بہت سویرے اٹھ کر ہی ٹکٹ ملنے کی کوئی امید تھی وگرنہ تو لوگ کھڑکیوں کے سامنے ہی ڈیرے ڈال کر بیٹھ جاتے تھے۔ ٹکٹ کا حصول یہاں پہلے سے بھی زیادہ مشکل دکھائی دیتا تھا۔

پونم نے جب مجھے واپس پر بھی جاگتے پایا تو اسے شدید شرمندگی محسوس ہوئی۔ آخر اس کے کہنے پر ہی تو میں چلا آیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں شریمن جی؟" اس نے ماما اور موسیٰ جی کا ہنر سمیٹتے ہوئے کہا۔
"سوچا ہوں پاؤ جی کے دھرم کے متعلق وہاں کچھ ٹھیک ہی ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہائے رام! ماما کے چروں میں بیٹھ کر ایسی باتیں۔" اس نے میری طرف مڑتے ہوئے کہا۔
رات کو جاگتے رہنے سے اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرفی جھلک رہی تھی۔ مجھ پر

فسوں پھونک دیا تھا اس نے۔ ”آنکھیں ایسی خوبصورت بھی ہوتی ہیں۔“ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں محرزہ سا اپنی جگہ سے اٹھ نہ جائے کون سا جذبہ تھا جس نے میرے دونوں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیئے۔

”جانتی ہو! میں یہاں کیوں آیا ہوں؟“

پونم کی حیرت زدہ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بہت کچھ جانتا چاہتی تھی۔

”تمہارے لئے! تم جو میری پارٹی ہو۔“ میں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے کہا۔ وہ لمحہ ہم دونوں کو جذباتی کر گیا۔ ہمیں ہوش اس وقت آیا جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ماما اور موسیٰ جی قریبی مندر سے پرجاپات کے بعد واپس آگئی تھیں۔ ناشتے کے لئے پیچھے کئین میں آئے تک بمشکل پونم نے ایک مرتبہ مجھ سے نظریں ملائیں۔ نجلے ہم دونوں اس سے ایک دوسرے سے کیوں شرمندہ تھے! ٹکٹ خریدنے کے لئے میں نے ٹکٹ گمر کی بجائے نزدیکی ٹرانسپورٹ آفس کا رخ کیا۔ جہاں ایک کنڈیکٹر نے مجھ پر خاصی مہربانی کرتے ہوئے مجھے دو گئے داسوں چار ٹکٹ دیئے۔ ماما اور موسیٰ جی تو حیران ہی رہ گئے۔

”اسی لئے تو میں کتنی تھی کہ پرکاش جائے ہمارے ساتھ۔“ انہوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ایک مرتبہ پھر وہی ہنگامے، یاتریوں کا شور و غل، بچوں کی چیخ و دھاوا۔ پونم ابھی تک اسی جذباتیت کا شکار تھی۔ چپ چاپ سی باہر فسطوں میں نجلے کیا دھڑکتی رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔

”کچھ تو ہے! آخر ایسی خاموشی بھی کیا۔ ہم بس کے دوسرے مسافروں سے الگ ہیں کیا۔“

”ایک بات ہے پرکاش بہ!“

”ہوں؟“

”یہ آپ مجھے اتنا مان نہ دیجئے۔ میں آپ سے کیا کہوں۔ میں کیسے آپ کو ہتھوں میں آپ کی داسی ہوں، دیوی نہیں۔“ اس کی بات سے ظاہر تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے کہ نہیں پائی۔

”پونم!“ میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے ڈبایا۔ لفظوں کی جھولیں خلل ہو چکی تھیں۔

○○○

کٹھنہ سے دس بارہ میل نوہری بس رک گئی۔ مقامی لپٹیا کے جوں میں مرغ جھنڈیاں لئے

ٹرینک روکے ہوئے تھے۔

”پاکستانی کمپنڈوز نے پل اڑا دیا ہے۔ اب کشتیوں کا پل بنایا جا رہا ہے۔“ یہ تھی وہ اطلاع جس نے سب پر سنا طاری کر دیا تھا۔ ساری بس کو جیسے سناپ سو گئی۔ وہ لوگ جو سارے راستے ”شیریں دلی ماما“ ”لاٹھی دلی ماما“ کے جھکڑے لگاتے آئے تھے اب ”ہرے لوم“ ہرے لوم“ کے علاوہ فن کے منہ سے کچھ نہیں نکل پاتا تھا۔

پونم کی حالت بھی دوسرے مسافروں سے الگ نہیں تھی۔ ماما اور موسیٰ جی جو ہم سے اگلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ فن کا تو خوف کے بدلے رنگ فق ہو گیا تھا۔ میں نے انہیں حوصلہ دیا اور کہا ”مہاری سینا کے سامنے کس کی جھل ہے جو دم مار سکے“ یہ تو بے خبری میں ایسا ہو گیا۔ ابھی میرا فخر بمشکل کھل ہوا تھا کہ قریبی سیٹ پر بیٹھے ایک لالہ جی پھٹ پڑے۔

”بے جنم میں مگی تمہاری سیٹ کھنڈ کھنڈ مٹی بھر فوج نے سارے بھارت کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ روزانہ اخبارات فن کے کارپسوں سے بھرے ہوتے ہیں، کتنے پکڑے جاسکے ہیں اب تک؟“ لالہ جی کی بات نے مسافروں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک گروپ تو فن لوگوں کا تھا جو لالہ جی کی مہمیت میں اپنی ”سینا“ کو کس رہے تھے اور دوسرے وہ جو پاکستانی جاسوسوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ فن کے ہاتھوں سے کسی کو لٹا نہیں۔ پونم پہلے گروپ کا ساتھ دے رہی تھی وہ چونکہ کم گودا تھی اس لئے بحث میں تو حصہ نہیں لے رہی تھی، البتہ میرے سامنے اپنے دل کی بجز اس ضرورت نکل رہی تھی۔

دو گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد آخر ہمیں روانگی کا سگنل مل ہی گیا۔ یہ سارا وقت ہم نے بس کے اندر اور باہر آنے جانے میں گزارا تھا۔

کٹھنہ سے پہلے ایک چھوٹی سی ندی آتی ہے جس کے گرد فوج نے کوم پور کی حفاظت کرنے والا ریڈار سسٹم قائم کر رکھا ہے اور اس کی وجہ سے اس علاقے کی فوجی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ندی پر سے گزرتے ہوئے ہم نے وہ پل بھی دیکھا جو کشتیوں کے عارضی پل سے کچھ فاصلے پر بنا ہوا تھا اور جسے بھارتی سیکوں کے پاکستانی کمپنڈوز نے نجلے کتنے دشوار گزار پناؤں کا سفر کرنے کے بعد نہ صرف نشانہ بنایا بلکہ وہ بخیر و عافیت واپس بھی چلے گئے۔

اس ندی سے کٹھنہ صرف دس بارہ کلومیٹر دور جاتا تھا اور وہ پھاڑی سلسلہ جس سے پیدل گزر کر ہمیں ماما دیشو کے مندر تک پہنچنا تھا اس میں ریڈار نصب کئے گئے تھے۔ یہاں سے ریڈار کی لوکیشن حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم ہرگز نہیں تھا۔ جاسوس کو یہاں داخل ہونے کے لئے بمشکل ہی کوئی غطاء (Gap) میسر آتا تھا۔ مجھے دورن تربیت جو بات ہمیشہ بتائی جاتی تھی۔ وہ یہ

تھی کہ ”بہترین جاسوس پھوٹو“ سے صرف قاتل ہی نہیں اٹھتا بلکہ قاتلہ اٹھانے کے لئے بہتر پھوٹو بھی پیدا کر لیتا ہے۔“

میں نے یہ اطلاعات حاصل کر لی تھیں کہ مائادیشنو کا مندر بھی یہیں کیس واقع ہے اور مجھے شدت سے اس موقع کا انتظار تھا۔ جب میں ایک برائمن یا تری کے روپ میں اپنی خود ساختہ ٹیلی کے ساتھ ہیل آؤں اور بھارتی سیکورٹی کا زرم توڑ کر کٹرو ریڈار سسٹم اور موٹائل میزائل سسٹم کا پرہ چاک کر سکوں۔ آج جب قدرت نے مجھے یہ موقع نصیب کیا تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں خوشی سے پھولے نہیں سارہا تھا۔ مجھے علم تھا کہ گوہم پر کے ہوئی ٹوے کی وفاقی اہمیت کیا ہے اور اس کی حفاظت میں پھاڑوں کی چوٹیوں پر گئے ہن ریڈار انٹیکا کتا ہاتھ ہے۔ جب میرے ہمراہی اپنے دلوں میں ”مائادیشنو“ کی یا تری کی خواہش کے لئے کشش کشش کٹرو کی سرلوں کی طرف بھرتے تھے تو میں بھی ”آپریشن دوسر“ کو پائل سے نکل کر کھڑے پر نکل کرے کا عزم لئے ہن کے ساتھ اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا۔ میں کہ محمود غزنوی کا جیو دیکر مائادیشنو کے مندر کا بھرم توڑنے جا رہا تھا۔

○○○

جوں سے کٹرو تک کشمیر کا ننگا حسن میرا منہ چراتا آیا تھا۔ یہ خطہ جنت نظیر بقیہ قدرت کی فیاضی کا بہترین شاہکار ہے۔ ہرے بھرے سرسبز پہاڑ اور ہن کے دامن میں بنے ہلات کی قطاریں، جہرے اور ہن میں پانی کی منگیلیں، بھرتی گویاں، چرواہوں کے پھاڑوں کے دامن سے نکراتے خوبصورت ماہنے اور پہاڑی سلسلوں سے اٹھیلیں کرتے، جھوٹے گائے دریا، دریاؤں میں دھوپ کی روشنی سے چمکتے شکرزے اور کہیں کہیں ہن کے کنارے پانی جتی بھیڑیں۔ ہیل کے درے سترے ہیں اور چہرے چاند، یہ الگ بات کہ مظلوم اٹلی نے انہیں گناہا ہے۔ میں ہیل پہنچنے ہی ماضی میں کھو گیا۔

یادیں تازہ کی کڑیاں ملائی چلی جا رہی تھیں۔ انہی پھاڑوں کے دامن میں میرے ۱۹۷۰ء کے گمنام شہیدوں کا لہو بکھرا تھا۔ کبھی کبھی تو یوں وہم گزرتا جیسے ہن کی ہریالی کا سبب انہی پاکستانیوں کا خون تو نہیں۔ انہی پھاڑوں کے پچے پچے پر کشمیری صحت پسندوں نے اپنی جالوں کا خزانہ دیکھ کر کیا تھا۔ میری آنکھوں میں ۱۹۷۰ء کے جہللوں کے وہ چہرے گھونٹنے لگے جو سترہ دلوں اور سترہ راتوں کی خوریز اور تیز ترین سرکرہ آرائی، شب بیداری، جہود، دھول اور ہن کے زخموں سے بہتے مقدس خون سے لالہ رنگ ہو رہے تھے۔ ہن کی دریاں اپنے شہید ساتھیوں کے خون سے تھکری ہوئی تھیں۔ ہن کے جسم چھلچھلی ہو گئے تھے۔ لیکن ہن کا عزم و حوصلہ بھی ہن کے

قدموں کی طرح کبھی نہ ڈگمگایا۔ یہ بدرد و حین کے سپاہی تھے جو چودہ سو سال سے مصروف جملہ تھے کیونکہ انہوں نے یہ سبق پڑھ لیا تھا کہ:

”یاد رکھو! آج کے دن جس نے اپنے دکھائی بغیر اس کے کہ وہ لڑائی کی کسی ضرورت کے لئے پیشتر بدلے تو وہ جیل لے کہ خدا کا غضب اس پر نازل ہو گا۔ وہ سیدھا جہنم میں جائے گا جو بہت ہی برا لکھتا ہے۔“

(الانفل: ۱۱)

قرآن لایہ فرما ہن جہانوں کے خون میں شامل تھا۔ انہوں نے انہی پھاڑوں کی چوٹیوں سے آسمان پر کندیں پھینکیں۔ وہ خود شہید ہو گئے لیکن انہوں نے دلوں کے لئے راہ عمل متعین کر گئے۔

○○○

کٹرو کوئی میا شہر نہیں جہاں قیام کا کوئی بلانہ بن سکے۔ صرف وہی لوگ ہیل کے مستقل کیمپ ہیں جن کے اپنے ہلات ہیں۔ ایک بہت سی مختلف مندروں میں مفت کے ایلن پر پلنے والے ہن بھاریوں کی فوج نے آہر کر رکھی ہے جو کسی بچ جاتی کا دہلے سے گزر ہونے پر بھی دھرم بھرشت ہونے کا روٹا دوتے نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ”بھانٹو“ بھی گائے بجلنے والی قوم کے گھوس ہن سے الگ تھلک ہیں۔ ہن بے چاروں کا تو مندر بھی ملیکا ہے۔ گو کہ لب وہ راستوں میں ہارمونیم اور ڈھولک لئے لہجے بھرتے ہیں لیکن لاکھ سیکور ہونے کے باوجود بھارتی حکومت ابھی تک اس بات کی ہمت نہیں کر سکی کہ انہیں مائاد کے درشن کرنے کی اجازت دے۔ کھنڈرات اور تھلون کی موٹی موٹی کتابوں میں یقیناً ایسی کسی پابندی کا تذکرہ نہیں ملتا لیکن گندھی کے چیلے وہ کبھی نہیں کرتے جو کہتے ہیں اور وہ کبھی نہیں کہتے جو کرتے ہیں۔

شام کو مجھے بھی ہلال غرامت سب کے ساتھ مندر میں جانا پڑا۔ جہاں رات گئے تک سرکھائی کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ رات کو ایک سرائے میں قیام کا بندوبست کیا۔ ابھی تک مجھے سوائے اس کے اور کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی کہ میں نے ایک فنی جیب کو مندر کے نزدیک رکھ دیکھا تھا جس میں سے ایک فنی جبر اور کچھ سپاہی مندر میں ”ماتھا لپتے“ آئے تھے۔ جیسی دیر تک وہ لوگ مندر میں رہے میں کسی نہ کسی بلانے ہن کی جیب کا طواف کرتا رہا۔ ہن کے ”ہیلٹن مارک“ پر سے مٹی اٹانے کے لئے مجھے ایک مرتبہ ہن کی جیب سے رگڑ کھا کر گزرتا بھی پڑا تھا۔ ”ہیلٹن مارک“ دیکھ کر میں کم از کم اپنے ذہن میں ایک اندازہ قائم

کرنے کے قتل ہو گیا۔

○○○

کنوہ سے مانا دیشو کے مندر تک دس گھنٹے کا پیدل راستہ تھا۔ فجر بھی ایک خاص مقام تک ہی جاتے تھے۔ راستے میں ہر دوسرے تیسرے میل کے بعد کوئی نہ کوئی مندر نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ تین چار مقلات پر سرائیں بھی بنی ہوئی تھیں تاکہ ضعیف لوگ سستا کر یا آرام کرنے کے بعد آگے روانہ ہوں۔ اس کے علاوہ پانچ چھ مقلات ایسے بھی آتے تھے جہاں رک کر مختلف رسومات لوا کر پڑتی تھیں۔ اس سارے راستے میں دونوں طرف کھائیوں اور جنگلات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کہیں کہیں حکومت نے ہلکت بھی لگائے تھے جن میں گے سرخ سیب یا تو جنگلات میں لپٹے والے بندروں کی فوج چٹ کر جاتی تھی یا پھر راستے کے کنارے لگے درختوں سے یا تری آثار کرکھا جاتے۔

علی الصبح ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ سرائے سے چھ فرلانگ کے فاصلے پر پہلے ایک تلاب آتا تھا۔ ہر یا تری کے لئے لازم ہے کہ وہ یہاں اٹھن کرے۔ تلاب ایک ندی کی شکل میں تھا جس کے ایک کونے میں بڑی بڑی چاروں کا پرہ جو نہ ہونے کے برابر تھا، تن دیا گیا تھا جس کی ایک سمت خواتین اٹھن کرتی تھیں اور ایک سمت مرد۔ ہندوانہ رسومات کی بے حیائی کی بہترین تصویر دیکھنے کو ملتی تھی۔ میرے ذہن میں رلمان اور گیتا کے وہ اشلوک گھومنے لگے جن میں کرشن کے تلاب میں سنائی گویوں کے کپڑے اٹھا کر بھاگ جاتے کا بیان ہے۔ اس زمانے میں شاید کیمرو نہیں تھا لیکن اب تھا اور آج کے بھارتی کرشن بڑی بے باکی سے کسی نہ کسی بہانے تلاب کی دوسری سمت چلے جاتے اور اٹھن کرتی اپنی ماؤں بہنوں کے بے ہودہ متاعیر کیمرو کی فلم پر نقل کر لیتے۔ چند بوڑھوں کے علاوہ اور کسی کو میں نے اس قبیح حرکت پر ٹاک بھوں چڑھاتے بھی نہیں دیکھا۔

مرتا کیا نہ کرتا کے صداقت مجھے بھی اٹھن کرنے پڑے کہ یہ حیرتہ اٹھن ہی مانا کو شروا نہیں بیٹھ کر کے کا بہترین طریقہ تھا۔ یہ الگ بات کہ سارے راستے نزلے اور زکام نے جان نہ چھوڑی۔ پونم دلیس پٹی تو اس کی سیاہ گھنیری زلفوں سے پانی موتیوں کے قطرے بن کر ٹپک رہا تھا۔ ایک چہرہ دیکھ کر وہ اپنے ہاں کھلنے لگی۔ جہاں میں پہلے ہی سکڑا سنا بیٹھا تھا۔

”دوبی درشن کی ابتدا ہی ٹھہرا دینے والی ہے۔ انتہا نبلے کیا ہو گی۔“ میں نے لپکتے ہوئے کہا۔

”انتہا کی فکر آپ نہ کیجئے۔“ پونم کے قہرے میں چپے اٹھنے مجھے لرزا کر رکھا۔

تلاب کنارے کھڑی ”مکھو ماتوں“ کو آنے کی ٹیکیں کھلا کر وہاں سے چھٹکارہ حاصل کیا اور آگے چل دیئے کیونکہ پہاڑی راستے تھے۔ اس لئے دو گھنٹے کے سفر نے ہی سب کو تھکا دیا۔ دونوں بوڑھیوں کی حالت تو خاصی قہل رحم تھی۔ راستے میں دوسرے یا تریوں کی طرح ہم بھی مختلف متاعیر کی تصویر کشی کر رہے تھے۔ دورین کے ساتھ میں مانا اور موسیٰ جی کو خصوصاً دعوت علامہ دے رہا تھا۔ وہ سب تو پہاڑوں کے دامن میں دھپے چھوٹے سے شہر میں فرق تھے جب کہ مجھے بڑی بے چینی سے اپنے مطلب کی شے کی تلاش تھی جو نظر آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

پہاڑی راستے پر جب جابجا چھوٹے چھوٹے ہوٹل اور چائے کے کھوکھے بھی بنے نظر آ رہے تھے جہاں یا تری دم لے کر سستا کر آگے روانہ ہو جاتے تھے۔ سارا راستہ چروں کے ایک جنگل سے پنا پڑا تھا۔ بھات بھات کی بولیاں، مگر مگر کے لوگ، بوڑھے، جوان، بچے، نوجوان، خوبصورت کنیاں بھی ایک ایک دوسرے کے سبک سبک ایک سرشاری کی کیفیت میں مانا دیشو کے بنکارے لگتے، ایک دوسرے سے اٹھیلیں کرتے، آنکھیں لڑاتے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں بھانڈوں کی نوجوان لڑکیوں تمام تر حشر سلتیوں کے ساتھ ہر آنے والے کو دعوت نکلتے بھی دیتی جا رہی تھیں۔ چلنے والوں سے کوئی نوجوان رکتا، کسی لڑکی سے دو چار خوش بولوں کا بدلہ کرتا اور وہ دونوں پہاڑی سلسلے میں کھو جاتے۔ اتنے پورے استھان پر بھی کبنت باز نہیں آتے تھے۔

یہ تھا ان کا دھرم۔۔۔ جس سے وہ انسانیت کی اصلاح کرنے چلے تھے۔

دو گھنٹے کے مزید چلنے کے بعد پلا آخر ہم لوگ ”لوہ کوادی مندر“ پہنچے۔ یہاں بھیڑیے کے بھٹ سے مشابہ ایک سوراخ سا بنا ہے جس میں سے گزر کر اندر موڑتی تھک پہنچا جاتا ہے۔ یہاں ایک عجیب و غریب تماشا لگا تھا۔ کئی لوگ اس سوراخ کے نزدیک جاتے اور واپس پلٹ آتے۔ کہا جاتا تھا کہ جس کے من میں ذرا سی بے اہلی ہو وہ اس سوراخ سے کبھی اندر داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ روایت خاصی قدیم ہے۔ پونم سے پہلے میرا نمبر آتا تھا۔ میں خدا کو یاد کر کے کھڑکڑے میں گھس گیا اور اطمینان سے اندر دیوی درشن کر کے واپس آ گیا۔ باہر نکلنے کا راستہ خلاصا کٹھن تھا لیکن اندر رش ہونے کی وجہ سے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔

”میرا دوشاں تجربوں کا صحت نہیں رہا پر کاش پو۔“ پونم نے تڑپ کر کہا۔ اس کے لیے کی سنجیدگی مجھے بسا وقت دلا دیتی تھی۔ میں یہ سوچ کر سہم جاتا تھا کہ اس خوبصورت ایسے کا انجام آخر کیا ہو گا؟

”پونم! میں تمہاری عنایت کے ایک ایک لمحے کو حسین بنانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں یہ سفر میرے جیون کا امرت بن جائے۔ کبھی نہ بھلائے جانے والا۔“ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔۔۔ پونم سے باتیں کرنے کے بدلے میں نے آپریشن روم کی تمام جزئیات کو اپنے ذہن میں نقش کر لیا۔ اب میں انہیں پہلی فرصت میں کلغہ پر منتقل کرنا چاہتا تھا۔ واپسی پر تھمائی میسر آئی اور دشمن کا زعم کلغہ کے پرزے کی شکل میں میری پتلون کی جیب میں منتقل ہو گیا۔

رات کو ”آودھ کوری“ پر قیام کرنے کے بعد علی الصبح ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر دی جوش و خروش، ”ماتا دیشو کے بنکارے“ خوش فطیلیں۔ شام گئے تک ہم اس مخصوص مندر تک پہنچ گئے۔ ”ماتا دیشو کے مندر سے پہلے“ ”بھیرو کا مندر“ آتا ہے جسے دیکھتے بغیر آگے گزر جاتا ہے کیونکہ ہندو مسندلوی کے مطابق اگر پہلے بھیرو کا مندر دیکھ لیا تو سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ میں نے البتہ ضرور گزرتے ہوئے بھی اسے دیکھ لیا تو سب کے لئے ایک مرطلے کا آغاز ہونے والا تھا۔۔۔۔!!

رات گئے پھر اشین کا حکم ملا۔ پہاڑیوں سے آنے والا پانی جو ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق کیلاش پریت پر بیٹھے برہما کے ہاتھوں کی انکیوں سے بہہ رہا ہے۔ یہاں مختلف جگہ تلاءوں کی شکل میں محفوظ ہے۔ خیریت یہ مگر یہ کہ یہاں خلاصہ رش تھلا۔ میں نے ہائی لوگوں کو خواتین کی قطار میں کھڑا کر دیا اور خود دسری طرف چلا گیا کہ جہاں رش کم ہو گا وہاں اشین کر لوں گا اور اس طرح مجھے اس بے ہودہ رسم سے نجات مل گئی ورنہ میرے منجھد ہو جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی تھی۔

اشیخ کے بعد اب ماما کے درشن کی باری تھی۔ اس کے لئے بھی مشترکہ خواتین اور مردوں کی قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ قریباً ایک گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد پونم کے بعد میری باری آئی۔ یہ مندر بھی بڑے پر اسرار طریقے سے پہنایا گیا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہونے کے لئے بریلے پانی میں سے گزرنا پڑتا تھا جس کے بعد ایک چوڑے پر ایک سوڑتی جس کے سر پر سونے کا چھتر لگا ہے (یہ چھتر سمرات اکبر نے رکھوایا ہے) رکھی ہے۔ جس کے دونوں اطراف دو چٹے کتے کرمہ العورت بیماری بیٹھے ہیں۔ ہر آنے والا باری ناریل اور حسب توفیق پیسے

میں نے درہمیں آنکھوں سے لگا لی۔ اس کی انگلی کی سمت نظریں دوڑائیں تو خوشی سے
جھوم اٹھ سامنے ریڈار کا ایک انشیا حرکت کرتا نظر آ رہا تھا کیونکہ پونم کے لئے یہ چیز نئی تھی
اس لئے اسے سمجھ میں آ رہی تھی۔

”کمل ہے یہ کیا ہے۔ آؤ اس طرف جا کر دیکھیں۔“ میں نے خوشی سے بے قابو ہونے ہوئے بظاہر انجیلین کرپونم سے کہا اور اس کا جواب سننے بغیر اس کا ہاتھ قلعے اس سمت چلے دیا۔ وہاں اس کا دامن نظر آ سکتا تھا۔ کرپونم بھی مجھ سے میرے ساتھ کھینچی چلی آئی۔

وہ مقام جہاں سے ہمیں پہاڑی کا دامن نظر آنے کی امید تھی، بظاہر تو بہت قریب لگتا تھا لیکن وہاں پہنچنے میں ہمیں کم از کم آدھ گھنٹہ تو لگا ہو گا۔ اس اثناء میں پونے دو تین مرتبہ مجھے اس قصے کو چھوڑ دینے کو بھی کہل۔ لیکن میں اسے ہر دفعہ یہی کہہ دیتا تھا ”تم نے ہی مجھے وہ پراسرار شے دکھائی ہے۔ اب جب تک میں اسے قریب سے نہ دیکھ لوں وہاں نہیں ہو سکتا۔“

اب ہم اس لوہے پہاڑی ٹیلے کے پاس کھڑے تھے جہاں سے ہمیں یہ نظارہ کرنا تھا۔
میں نے بے مبری سے آنکھوں سے دور بین لٹکانی اور میرا دل بیلیوں اچھلنے لگا۔ سامنے بھارتی
فوج کا انتہائی محفوظ طریقے سے کیبولانج کیا ہوا آپریشن روم موجود تھا۔ دل ہی دل میں میں نے
کے حفاظتی حکام کی دلدو دینے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ مانا ویشنو کے مندر کو جانے والے مخصوص
راستے سے صرف انتہائی بمشکل نظر آسکتا تھا وہ بھی اس طرح کہ جیسے پونم نے اچانک ایک
مخصوص زونویے سے نظارہ کیا تھا۔ آپریشن روم کے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں
نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو اس عظیم کارنامے پر دلدوئی اور نظارہ کرنے میں غرق ہو گیا۔

”کمل کو گئے شریکان جی!“ پونم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کمل میں چونک

”تم تو نہ ہی دیکھو تو میرے ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور دو درجین اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔

مورتی کے چہنوں میں رکھ کر اسے "سیس لوائے" کچھ جواب میں اس کو نابریل ایک آدھ پیہر (جس پر بیماری اپنے دانت کا نشن لگا دے گا) ملنے پر چند رات تک لگا کر بیماری آگے دھکیل دے گا" جہاں سے اسے باہر لکھنا ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے یہ مراحل بھی طے ہوئے۔ قریباً آدمی رات کے بعد ہم عیالوں سے فارغ ہوئے اور سرائے میں چلے آئے۔

نیز تو سرائے ہم ہی تھی کیونکہ صبح تک مجھوں کے شور نے آنکھ نہ لگنے دی۔ صبح ہم نے "مانا کی کھنکیں" وہاں ملنے والوں میں تقسیم کیں اور تمام رسومات سے فارغ ہو کر واپسی کے لئے رخت سربانہ حملہ واپسی پر "بھیرد کا مندر" اور "ہاتھی متھا" سے گزرتے خدا خدا کر کے کٹروہ پہنچے۔ سفر کے ہر لمحے کو پونم کی قربت نے حسین بنا دیا تھا۔ کشمیر کے حسن پر نظر جاتی تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ اہی کب اس خطہ جنت نظیر کے کین آزاد فضاؤں میں سانس لے سکیں گے؟

کٹروہ سے روانگی سے پہلے مانا جی نے مجھ سے علیحدگی میں بات کرنے کے لئے کہا۔ میں حیران تھا کہ انہیں ایسی کیا پراسیڈنٹ بات کی ضرورت پیش آگئی۔ ہم دونوں مندر سے نکل کر اپنے آشرم کے کمرے میں آگئے جب کہ موسی جی اور پونم پر دو گرام کے مطابق دیں رہ گئیں۔ "بیٹا کچھ عرصے سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ پونم تم میں خاصی دلچسپی لیتی ہے، وہ میری بیٹی تو نہیں لیکن تم نے بھی محسوس کیا ہو گا کہ مجھے بیٹیوں سے بڑھ کر عزیز ہے۔ مجھے علم نہیں کہ تمہارے اس کے متعلق کیا جذبات ہیں۔ بیوی لالہلی آدی ہیں۔ وہ تم سے شاید کبھی بات نہ کر پائیں۔ بیٹا میں نے دونوں پر کاشوں کو ہمیشہ ایک ہی سمجھا ہے۔ تم ہمارے لئے اوتار بن کر آئے ہو۔ اگر تم پونم سے دو لو کرنا قبول کر لو تو میرا اگلا جیون پھل ہو جائے گا۔" انہوں نے بغیر تمہید ہاندھے بڑی شفقت سے سیدھی سلامتی بات کر دی۔ جیسے جیسے وہ بولتی جا رہی تھیں، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اندر آری چل رہی ہو۔ مانا جی نے مجھے بڑے لذت ناک استحقاق میں ڈال دیا تھا۔ مجھے نزدیک کے سارے سبق بھول گئے۔ انہیں اسی لمحے میں دو ٹوک جواب ملنا چاہیے تھا۔ چند لمحوں تک میں سوچتا رہا، پھر مجھے ایک فیصلے تک پہنچنا ہی پڑا۔

"مانا جی پونم سے دو لو میرا سوچا گیا ہے، لیکن میری خواہش ہے، وہ اپنی پڑھائی جاری رکھے۔ کم از کم ایم۔ اے کر لے۔ اس ایشیہ میں ممکن ہے میرے چاچی کا دل بھگون میری طرف پھیر دے۔" میں نے گول مول سی بات کی۔

"اس کا مطلب ہے میں تمہاری طرف سے ہاں سمجھوں۔" انہوں نے بڑے پر امید لہجے

میں کہا۔

"آپ میرے سب کچھ ہیں، آپ کے علم کی سرکوبی میں کیسے کر سکتا ہوں۔" میں اس کے علاوہ اور کیا کہتا۔

مانا جی نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا۔ من کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔ میں اندر ہی اندر کٹ کر رہ گیا۔ قدرت نے اپنے بھیا تک ایسے کا آغاز کر دیا تھا اور مجھے اس سے بہرہ منی گزرتا تھا۔

موسی جی اور پونم کو انہوں نے یہ خوشخبری فوراً ہی سنا دی تھی، کتنی خوشی ہوئی تھی بے چاروں کو یہ جان کر کہ میں نے ہاں کر دی ہے۔

"میں نہ کتنی تھی کہ یہاں سے مانگنے والی ہر منت پوری ہوتی ہے۔" پونم نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے مجھے گھر پہنچتے ہی کہا۔

آشمرم کے اصرار

گھر واپس آئے تو بو جی نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

”جھگوان کا شکر ہے کہ تم لوگ کھل واپس آ گئے ہو۔“ انہوں نے فقہہ لگاتے ہوئے کہہ دو روز تک میں نے رائے کوٹ میں ہی قیام کیا۔ اس اثناء میں صرف ایک مرتبہ اپنا پیغام آگے پہنچانے کے لئے ہی گھر سے باہر نکلا تھا۔ اگلے روز منگل تھا اور وہ دن جسے مکمل بازیوں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے چنا تھا۔ میں نے گھرتا دیا تھا کہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے جلدھر جا رہا ہوں۔

”یار منگل ذرا منحوس دن ہوتا ہے، ایک آدھ روز بعد چلے جانا۔“ بو جی نے مجھے روکنا چاہا۔

”آپ کو کیونسٹ ہو کر ایسی بات نہیں کرنی چاہیے بو جی۔“ میں نے مسکرا کر ہن کو بل دیا۔

جلدھر جانے سے پہلے میں پرکاش سے ملا۔ برنس کے معاملات پر بحث اور سورن سنگھ سے ملنے کا کہہ کر جلدھر چلا گیا۔ سورن سنگھ نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میری اچانک آمد سے وہ بہت خوش ہوا۔ رات میں نے اس کے ہاں قیام کیا اور صبح مارکیٹنگ کا ہلنہ کر کے پولیس کپتن کے دفتر کی طرف چل دیا۔ میں دفتر کے سامنے بنی کنٹین میں بڑی بے چینی سے آنے والے واقعات کا خضر تھا۔ ابھی تک وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں اچانک چونک پڑا۔ مجھے امریک سنگھ کنٹین کے ایک کونے میں جہاں خلا مارش تھا کھڑا نظر آیا۔ اسی اثناء میں پولیس کپتن کی جیب بھی آتی دکھائی دی۔ امریک سنگھ آہستہ آہستہ کنٹین کی دوسری طرف کھٹک رہا تھا جہاں سے جیب کو گزرنا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک مجھے اپنی دھڑکنیں رکتی محسوس ہوئیں۔

ایک پولیس تھانیدار امریک سنگھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید اس نے امریک کو پہچان لیا تھا کیونکہ اکثر پنجاب کے پولیس افسران اسے جانتے تھے۔ تھانیدار کو اس کی وہی موجودگی نے

مکھوک کر دیا تھا۔ گو کہ ان دنوں امریکہ سگھ کو آزادی میسر تھی پھر بھی قہنیدار نے اپنا شک دفع کرنا ضروری جانے۔ امریکہ کو بھی شاید اس کی آمد کی خبر ہو گئی تھی، کیونکہ وہ مختلف لوگوں کی آڑ میں آہستہ آہستہ دوسری طرف کھسک رہا تھا۔ قہنیدار نے کارکردگی دکھانے کے شوق میں اسے لٹکارا اور ٹھہرنے کے لئے کلا۔ امریکہ سگھ مڑا اور دوسرے ہی لمحے دو گولیاں قہنیدار کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔۔۔ اس کی فائزنگ اور نشاندہ تھل دلو تھل۔

کنٹین میں افزائری پھیل گئی۔ پولیس کے علاوہ عام لوگوں کو بھی ابھی تک معاملے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے اوپر اوپر بھاگ رہے تھے۔ میں بھی بھاگنے والوں کے جھوم میں شامل تھا۔۔۔ یہ الگ بات کہ ابھی تک میری نظریں امریکہ کو تلاش کر رہی تھیں جو بجائے کہیں غائب ہو گیا تھا۔

پولیس پکتن ابھی جیب کے نزدیک ہی پہنچا تھا اور معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کنٹین کے ایک کونے میں ایک میز کی آڑ میں چھپا امریکہ سگھ باہر نکلا۔ اس نے پکتن کو زوردار مٹھی دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اور اس سے پہلے کہ دوسرے پولیس اہلکار اس کی مدد کو لپکیں، باقی چار گولیاں اس نے چند لمحوں میں اس پر خالی کر دیں۔ پولیس پکتن الٹ کر دوسری طرف جا کر اس کی دروزی خون سے رنگین ہونے لگی تھی۔ امریکہ سگھ نے جھوم کے مختلف سمت چھلانگ لگائی، لیکن اب پولیس اس کے تعاقب میں تھی۔ ابھی بے شکل اس نے پکھری کا دروازہ ہی عبور کیا تھا جب بھاگتے ہوئے اس پر فائزنگ کرنے والے ایک حوالدار کی گولی اس کی پہلی میں لگی، امریکہ سگھ تڑپ کر دوسری طرف جا کر۔۔۔ لیکن چند ہی سیکنڈ بعد اٹھا، اس کا ہاتھ اپنے کپڑوں میں چھپی کوئی چیز ٹٹولنے لگا۔

تعاقب کرنے والوں نے یہی سمجھا کہ وہ کوئی خطرناک چیز نکل رہا ہے۔ اب پولیس اسے مہلت دینے کے لئے تیار نہ تھی۔۔۔ ایک ہی وقت میں دو اطراف کی فائزنگ نے اسے بھون کر رکھ دیا۔ میں دل ہی دل میں اس کی جو انمردی کی واو دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ حیثیت اس کے کپڑوں میں ایک خلی پتول تھا جس سے وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن اسے علم تھا کہ ایک مرتبہ زندہ قہو آگیا تو پولیس اپنے روایتی قہر ڈگری تشدد کے ذریعے اسے ذہن کھولنے پر مجبور کر دے گی۔ شاید اسی لئے اس نے پولیس کو دھوکہ میں ڈال کر مرنا قبول کر لیا کہ اپنا راز بھی اپنے ساتھ ہی لے جائے۔

چند منٹ کے اندر ہی پولیس نے پکھری کے چاروں سمت گھیرا ڈال لیا تھا۔ ایس۔ پی کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا، جہاں وہ آپریشن ٹیبلر میں پینچنے سے پہلے ہی مر گیا جب کہ

قہنیدار سوہن لال موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔

ایسے خطرناک مواقع پر موجودگی اصولاً غلط تھی۔ تربیت کے مطابق مجھے بھیڑ بھاڑ اور ہنگامہ خیز جگہوں سے احتیاط برتنا چاہیئے تھا لیکن اسے میرا بے پناہ تجسس کہہ لیجئے کہ میں نے وہیں سے اس وقت تک ہٹا پھرتا نہ کیا، جب تک پولیس اس کی لاش کو اٹھا کر نہیں لے گئی۔

جب میں واپس سون سگھ کے پاس جا رہا تھا تو میرے ذہن میں پاجوئی کے بارے میں کئی طرح کے خطرات سر اٹھا رہے تھے لیکن ایک انمولی طاقت مجھے احساس دلا رہی تھی کہ اس ”مکھوک کیونٹ“ نے اتنے والے واقعات کی فورا پش بندی کرنی ہو گی اور پولیس کبھی اس تک نہ پہنچ سکے گی۔

○○○

دھپہ تک میں پکھری کے ارد گرد گھومتا رہا۔ اس کے بعد سون سگھ کے پاس آئید۔ سون سگھ کا خیال تھا کہ شاید میں اس کی اس پشیمانی سے فائدہ اٹھانے آیا ہوں لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ میں یہاں صرف تفریح کرنے آیا ہوں، تب بھی اس نے میری خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ میں نے پہلے ہی ”برنس ٹرپ“ میں اسے قہو کر لیا تھا۔ سون سگھ نے مجھے بتایا کہ کرنل پاجو اس پر خاص طور سے مہربان ہے۔ اس نے سمجھنے کے بعد سے آفیسر میس کی ہاتھ سلائی اسے دلا دی ہے اور آرمی ہیڈ کوارٹر میں بھی اس کی ہاتھ رجسٹریشن کروادی ہے۔

اس کے ذریعے مجھے اس بات کا بھی علم ہوا کہ کرنل پاجو نے ایک دو مرتبہ مجھ سے ملنے کی بھی خواہش ظاہر کی ہے۔ بھارتی فوج کے ایک کرنل کی مجھ سے دلچسپی میری خوش بختی کی علامت تھی۔ میں نے خود سون سگھ کے سامنے اس کی مہمان نوازی اور ”بھٹی پوری“ کی تعریف کئی مرتبہ کی لیکن ساتھ ہی اپنی حد سے بڑھی معروضیات کا رد بھی دیا (کیونکہ ابھی تک مجھے دوبارہ کرنل پاجو والے ایریا میں کوئی مشن نہیں سونپا گیا تھا) سون سگھ نے مجھے ایک مرتبہ پھر اچھی خاصی تنخواہ اور بہت سارے لائسنسز کی پشیمانی کی، لیکن میں نے اسے بتایا کہ نوکر مالک کے رشتے میں دوستی نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی، صرف اطاعت ہی اطاعت رہ جاتی ہے اور میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا ہوں۔ میں اس کی فرم کے لئے بطور کمیشن ایجنٹ کام کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں، جیسے ہی کوئی آرڈر ملے، اپنی کمیشن کھری کر لوں گا۔

میری اس بات نے سون سگھ کو خدا جانے متاثر کیا یا نہیں، البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ مجھے کھونے پر ہرگز تیار نہیں تھا اور ایک کاروباری شخص کی طرح اپنے برنس کے لئے فائدہ مند

آسانی کو کسی نہ کسی صورت اپنے قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔ اگلے دو روز تک میں اس کی مصلحت نوازی سے لطف اندوز ہوتا رہا، پھر میں واپس لدھیانہ آگیا۔

لدھیانہ میں پرکاش کی زبانی علم ہوا کہ بیوجی کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ میرے ذہن میں بہت سے خدشات نے سر اٹھایا، ”اگر انہیں پولیس پکتن کے قتل کے جرم میں پکڑا گیا ہے تو محلہ واقعی خطرناک ہے ورنہ صورت حال اتنی خراب نہیں۔“ پرکاش کے ساتھ میں فوراً رائے کوٹ پہنچا۔ سارے گھروالے پریشان تھے۔ میں نے انہیں حوصلہ دیا۔ بیوجی ابھی تک رائے کوٹ پولیس سٹیشن میں ہی تھے۔ یہ سن کر میری جان میں جان آئی کہ انہیں محض انڈیش نقص امن کے تحت پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔ کیونکہ ان دنوں کیونٹ پارٹی سارے بھارت میں ملک گیر پیمانے پر ہڑتوں کا پروگرام بنا رہی تھی اور کانگریس ”جسورت نواز“ حکومت نے آنے والے حالات سے نشے کے لئے تمام صوبوں کو کیونٹ اے اور بی کلاس لیڈر شپ کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے تھے۔

میرے ذہن میں جس بات کا کھٹکا تھا وہ صورت حال نہیں تھی۔۔۔۔۔ بیوجی کی ”سیاسی بصیرت“ کو میں دلو دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ جس روز پولیس پکتن کو قتل ہوا تھا، میں اس روز علی الصبح وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق گرفتار ہو گئے تھے۔ یہ بات ان کے لئے کچھ مشکل بھی نہیں تھی۔ سی۔ آئی۔ ڈی والے ان کی سرگرمیوں پر پہلے ہی سے نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس روز رات کو ایک جیلے میں دھواں دھار تقریر کر دی اور صبح دھڑلے گئے۔ اس طرح انہوں نے خوبصورت چال چل کر جلد ہروالے قتل میں اپنے ملوث ہونے کے امکانات ہی ختم کر دیئے تھے۔

پولیس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہاں کوئی کنسن باڑی بھی رہتا ہے۔۔۔۔۔!

شام تک بھاگ دوڑ کر کے ہم نے بیوجی کی اچھے چال چلن کی مناجات دینے کے بعد مناجات کروائی تھی۔ رائے کوٹ کے سرکردہ افراد کا تعلق ہم نے اپنے وکیل کے ذریعے حاصل کر لیا تھا۔ رات تک ان کی رہائی عمل میں آئی تو سب نے سکھ کا سانس لیا۔ بیوجی حالات سے نکلنے ہی مجھ سے بے شکریہ ہو گئے۔

”بیوجی! چھوڑیے اب سیاست کو اس میں رکھنا ہی کیا ہے۔ لدھیانہ چلئے۔ کاروبار سنبھالئے۔“ میں نے گھرواپس آتے ہوئے راستے میں ان سے کہا۔

”بیٹا بچھلے پانچ چھ سال سے میں خاموش تھا اس لئے کہ تمہاری ماما جی بڑے چھوٹے دل کی

مالک ہیں اور پرکاش بھی اکیلا تھا پھر مجھ پر اپنا ہی سہی تمہاری موسیٰ جی کا بوجھ بھی تھا۔۔۔۔۔ اب سالک رام اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ میرے دو پرکاش ہو گئے ہیں، اب مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ میں اپنے کاز سے کیسے پیچھے ہٹ جاؤں، مجھے تمہاری صلاحیتوں کا علم ہے بیٹا۔۔۔۔۔ نیراوشاش ہے کہ تم کبھی گھروالوں کو میری کمی کا احساس نہیں ہونے دو گے۔۔۔۔۔“ بیوجی کے جواب میں چھپے احمد پر میں کٹ کر رہ گیا۔

اس گھر کے ہر فرد نے مجھ سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ نبھانے قدرت نے ان لوگوں کو اپنے بھائی کا مذاق کا نشانہ بنانے کے لئے کیوں جن لیا تھا۔ مجھے خود اپنے کل کا علم نہیں تھا۔ میری حیثیت بظاہر ہوا میں اڑنے والے اس پتے کی سی تھی جسے آندھی نے ان کے آگن میں لا پھینکا تھا۔ اگلا جھوٹا مجھے کہل لے جائے اس کا مجھے بالکل پتہ نہ تھا۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو ان لوگوں کی حالت پر مجھے رحم آنے لگتا تھا۔ اس وقت میرا دل چاہتا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں، کہیں اور پناہ لے لوں۔ کوئی اور Safe House بتا لوں۔ ممکن ہے اس مرحلے پر میری جدائی ان پر زیادہ شاق نہ گزرے۔

لیکن۔۔۔۔۔ وہ عظیم جذبہ جو میرے وجود میں کار فرما تھا۔ ان سب جذبوں پر غالب آ جاتا۔ میری زندگی کا تقاضا تھا کہ میں یہاں بھاڑوں۔ ایسی محفوظ پناہ گاہ جانے پھر میرا ہو کہ نہ ہو۔ میں نے ایک کومٹ منٹ خود سے ضرور کر رکھی تھی کہ ”زندگی میں اگر کوئی ایسا مرحلہ آ گیا جس کی توقع ایک جاسوس کو رخصتی چاہیے تو کبھی اس ہتھ بٹے گھر پر آج نہیں آنے دوں گا۔“

گھر پہنچے تو ماما اور موسیٰ جی کے چہرے کھل اٹھے۔ انہوں نے بیوجی کی رہائی کا ”کارن“ بھی میری آمد ہی کو جان لیا تھا۔ ابھی تمام باتیں ان کی نظروں میں میرا من بوجھ رہی تھیں۔ انہیں پونم سے میری نسبت ملے کرنے پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔

پونم کے رویے میں اس روایتی حجاب نے جگہ پالی تھی جو مشرقی دوشیزاؤں کا خاصہ ہے۔ گو ہم پر ایسی کوئی معاشرتی پابندی عائد نہیں تھی جو ایک دوسرے سے مل نہ سکیں پھر بھی نبھانے کیوں اب اس کے رویے میں وہ پہلی سی بے ساختگی باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے حسین سراپے کے گرد شرم و حیا کا خول چڑھا لیا تھا۔ وہ ابھی سے ذہنی طور پر مجھے اپنا ”بھتی“ جاننے لگی تھی۔ وہ ہندو لڑکی تھی۔ اس کے دھرم اور سراج نے اس کے لاشعور میں ”بھتی ورتا“ کا جو تصور باندھ دیا تھا۔ وہ جی جان سے اس پر عمل پیرا تھی۔ اس کی محبت نے اب پوجا کا درجہ پالیا تھا اور اپنے ہر عمل سے وہ خود کو ”دھارک بھتی“ ثابت کرنے پر تلی تھی۔ میں اس کے برتاؤ سے کٹ کر رہ جاتا اور کبھی کیا سکتا تھا۔ تقدیر کے سامنے تدبیر کی بے بسی کا احساس مجھے حقیقتاً اب ہوا

○○○

اس روز میں اکیلا ہی سوہی دیناندی کے آشرم کی طرف چل دیا۔ میں نے اپنی روانگی کے حلقہ پونم کو بھی نہیں بتایا تھا مگر اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے ہرلو سوہی دیناندی کے آشرم جاؤں لیکن سوہی کے حلقہ باریاد میرے ذہن میں جو خدشات سر اٹھا رہے تھے، ان کا تقاضا یہ تھا کہ میں پہلے اکیلا مدارج کے درشن کروں۔ ایک مرتبہ اس کے اصل روپ کا علم ہو جاتا تو ہم جھٹکا ہو سکتے تھے ورنہ تو جو خطرناک لہوہ اس نے لوڑھ رکھا تھا کوئی بھی دوست اس کی پیٹ میں آ سکتا تھا۔

میں علی الصبح دہلی جا پہنچا سوہانی نے شہر سے باہر ایک دیرانے میں صدیوں پرانے ایک مندر پر قبضہ کر کے اسے آشرم کی شکل دے رکھی تھی۔ مندر سے ملحقہ پر اسرار عمارت کے کھل کرے میں کوشش کے باوجود نہ گن سکے ہر کمرے کا مصرف الگ الگ تھا۔ ”ماتا دیشنو“ کے بعد مجھے یہاں صحیح معنوں میں عقیدت مندوں کا ٹھکانا دکھائی دیا۔ لڑکیاں اور لڑکے یہاں موجود تھے۔۔۔ یہ تمام لوگ یہاں ”روحانی غسل“ کرنے آئے تھے اور مختلف الیٹھ یوگا کورسوں کے ذریعے اپنی آتما کی کتنی کے لئے کوشش تھے۔ پہلی نظر میں ان کے لئے میرے ذہن میں ”فورا“ ایک لفظ ابھرا تھا ”مشتی جی۔۔۔“ ان کے ”پلے“ لباس، چہل ڈھل میں عجیب سی بے نیازی پائی جاتی تھی۔ یہ بے نیازی لباس میں تو کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتی تھی۔ نوجوان لڑکیاں جو زیادہ تر امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے ”آتما کی کتنی“ پانے یہاں آگئی تھیں۔ ان کی آنکھیں ایک عجیب و غریب نشے سے سرشار تھیں۔ یہ کیسا نشہ تھا جو یہاں کے کینوں کے رگ دپے میں سلایا ہوا تھا۔ مجھے اسی کا کھوج لگانا تھا۔

سوائی دیانند کا اصل روپ تو یہی دیکھنے میں آتا تھا۔ کلب میں جو اندازہ میں لگایا تھا۔ اُس سے کہیں بڑھ کر اس کی پوجا ہو رہی تھی۔ آشرم میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو گھوم کر ایک بڑا ہل کرہ تھا۔ ایک عجیب سی پابست اس کے درو دیوار سے چلتی تھی۔ ہل کرے میں پھیلی "دھوف" کے دھویں سے اٹھنے والی پراسرار سی خوشبو انسانی تصور کو صدیوں پرانے دور میں لے جاتی تھی۔ کرے کی دیواروں پر دیویوں اور دیوتیوں کے نقش "آمن" سب سے پہلے آنے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتے تھے۔ "آمنوں" میں وہ صدیوں پرانے راز پنہل تھے جو سینہ بہ سینہ مختلف رشیوں سے ہوتے ہوئے سوائی دیانند مدارج تک پہنچے تھے۔ وہ لوگوں کو جنسیت پرستی کی کلی تعلیم دے رہا تھا۔ لمبی نور پر حیش زندگی کا راز ان "یوگ آمنوں" میں چھپا

ہوا تھا جن کی ایک مختصر سی جھلک اس آشرم کے درود پوار پر بنے نقش و نگار میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔

میں بھی پہلے سے موجود لوگوں کی بھیز میں ایک طرف جا بیٹھا۔ سب لوگ ہل کر رہے تھے۔ ایک بظنی دروازے پر نظریں جمائے بے چینی سے سوای جی کی آمد کے منتظر تھے۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے بمشکل دو تین منٹ ہی گزرے تھے جب اچانک فضا ”جے بھولے ہاتھ کی“ ”جے شو شبنو“ کے بے ہتکم شور سے گونجنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی گیروی لباس پہنے مہاراج کے داس اور داسیاں اندر کھس آئے۔ انہوں نے ”سنگھوں“ کو ”امرت جل“ جو جنگ لور و دیگر الم غلم پر مشتمل تھا‘ پلانا شروع کیا۔ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے تھے اور کوئی مقدس پانی سمجھ کر حفاظت نہی رہے تھے۔ میرے علاوہ کچھ لوگ اور بھی ایسے تھے جنہوں نے اس سے احتراز کیا، جن لوگوں نے یہ امرت جل نہی لیا۔ لن پر ایک عجیب سی بے خودی طاری ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ”بھجن کہتا“ شروع ہو گئی۔۔۔ ڈھولک لور و فل کی شکست میں سب لوگ گھا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔

جی تاچون سیتارام

جنگ نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا اور کچھ لوگ وجد میں آکر پہلے تو جمعہ منے گئے، اُس کے بعد انہوں نے بے اہم انداز میں ناچنا شروع کر دیا۔ پھر اس ناچ میں سواہی جی کی داسیاں اور داس بھی شامل ہوتے چلے گئے تھے۔

خدا کی پناہ۔۔۔۔ ایسا وحیانیہ اور بے اہم رقص شاید افریقی قبائل میں بھی دیکھنے کو نہ ملے جس کا مظاہرہ میں کیا جا رہا تھا۔ بچنے والے اپنی سرپوشی سے قہقاہے بے نیاز ہوتے جا رہے تھے۔ خصوصاً "دایاں تو نیم برہنہ ہو چکی تھیں۔ شیطانی رقص اپنے عروج پر تھا" جب اچانک دروازہ کھلا، اس کے ساتھ ہی "سوامی دوانند مہاراج کی ہے" کے نعرے کو بچے لگے۔ جیسے جیسے نعرے بلند ہو رہے تھے، یہاں انگیز رقص میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ جو لڑکیاں یا نوجوان پھر کھا کر گرنے لگتا اسے آشرم کے سیوا دار اٹھا کر ایک نزدیکی کمرے میں غائب ہو جاتے۔ دروازے پر جیسے ہی وہ خوبصورت ناریاں جنہوں نے گہرے لہجے لے چوئے پھن رکتے تھے اور جن کی سیاہ لمبی زلفیں ناگوں کی طرح ان کے شانوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں لوہے کی گڑدیاں پکڑے نمودار ہوئیں۔ ایک نعت سارا ہنگامہ ختم کیا "اچانک چاروں سمت سکوت طاری ہو گیا۔

سہارا ج پڑھا رہے تھے۔۔۔!

اپنی ہڈیوں کو سلیقے سے سینے، دو کیڑی دھوپیں بدن پر لوڑھے، بائیں ہاتھ میں "گیش" لونچا کئے، دایاں ہاتھ جس میں قیمتی پیرے جو اہرلت جڑی انگوٹھیاں جھنگ رہی تھیں۔ سانبلیں کے انداز میں افسانے "شاقی" شاقی، "پھارنا" راسپونین ہلی کرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے لباس اور جسم پر بھلے کیسی کیسی تیز خوشبوئیں لگی تھیں۔ سارا ہل کرہ منک افلا سوائی کو دیکھتے ہی "سنگیں" مٹھنوں کے مل جھک گئیں۔ زیادہ تعداد میں لوگوں کی تھی جو باقاعدہ سجدے میں جا کرے تھے۔ اس کی سیوا دار کنیاؤں سنگوں پر اپنی گڑبڑوں سے مرق کا چمڑکا کر رہی تھیں۔ جہاں جہاں سے وہ گزرتی، خوشبوؤں کا ایک طوفان ان کے ہر کلب ہو تا۔ ساراج اس اثناء میں اپنے آئین پر تین برابرے تھے۔

ایک کونے میں دھرا چھوٹا سامانچک بن کے سامنے لاکر رکھ دیکھ اس اثناء میں لوگ انھ انھ کر ان کے چہروں کو چھو رہے تھے۔ کئی نوجوان لور لڑکیاں تو انہیں کتوں کی طرح چوسنے چاہنے بھی لگے تھے۔ سوائی دواندہ کا کسی کی پیٹھ جھکنا غلبہ، وابھی کا اشارہ ہوتا تھا۔ جیسے ہی سیوا دار کنیوں کا چمڑکا عمل ہوا، وہ ساراج کے دائیں بائیں انھوں میں لوہے کی پتلی پتلی سلاخیں لئے جن پر گیش لگا تھا، ان کر کھڑی ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی لوگ منسوب ہو کر نظر میں جھکائے بیٹھ گئے لور ساراج کا "بھاشن" شروع ہو گیا۔

اس نے ہندو دھرم کے حوالے سے ایک مرتبہ پھر لوگوں کو کدودھ "کھم" "کودھ" "سودھ" اور اپنکار کو اپنے شر سے باہر بھیجنے کی ترغیب دینی شروع کر دی اور اس کا واحد طریقہ جنسی ہے راہروی تلبا۔ اس طرح بغول اس کے ہر ہاش جنسی کھتوں سے بے نیاز ہو سکتا تھا۔ اس دوران ایک بات میں نے خاص طور سے غموس کی کہ یہاں کسی کو کیڑو تک لانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ بات بعد میں میرے علم میں آئی کہ یہاں فونو گرانی کرنے یا ساراج کا بھاشن ریکارڈ کرنے کی کوشش کرنے والے کے کبیرے لور شپ ریکارڈر توڑ دیے جاتے ہیں۔ ساراج کے بے پند اثر و رسوخ کے آگے مقامی پریس بے بس دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی دلی دلی تواز اس کے خلاف اکر اٹھ بھی جاتی تو اس کے بیروکار ایسا کرنے والے کو پاتل کی تہ سے اضمیضہ نکالتے اور اس کا وہ حشر کرتے کہ دو سروں کو دیکھ کر نصیحت ہو جاتی لور وہ کلن پکڑ لیتے۔

کچھ شہسار چرے بھی مجھے دکھائی دے رہے تھے، یہ وہی لوگ تھے جو کلب میں ساراج کے گرد گھیرا والے بیٹھے رہتے تھے لور جن میں زیادہ تعداد لویز فورس کے افسران کی یکمل کی تھی جو سوائی پر مٹی جا رہی تھی۔ وہ پیر تک کا وقت سوائی کے بھاشن ہی میں گزارا۔ اس دوران میں فورٹیں لور مرداس کے قریب جا کر اسے اپنی مشکلات بھی بتاتے جن کا حل سوائی ہی فوراً نکال

دیتے۔

تھقف اقسام کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے تھقف کرے تھقف تھے۔ جہاں سوائی دواندہ کے بٹے کئے چیلے چاہتے خواتین کا اور اس کی دایاں مردوں کا علاج کرتی تھیں۔ زیادہ تر مریضوں کو یوگا کے تھقف آئین بتائے جاتے تھے۔ جھاڑ پھوک کا فریضہ سوائی خود لوار کرتا تھا۔ وہ پیر کے بعد "بھوجن" کا غلظہ افلا سوائی کے درشن کے لئے آتے دلوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ صبح سے رات تک کا وقت آشرم میں گزاریں لور اس دوران میں ان کی مسکن داری کے عمل فراغ سوائی کے ذمے ہوتے تھے۔ صبح کے بٹھتے سے لے کر رات کے کھانے تک سب کچھ فراغ سوائی کے سپلائی ہوتا تھا۔ یہاں آنے والے خود بخود اپنے لئے کوئی خدمت تجویز کر لیتے آشرم کے نگر سے سپلائی ہوتا تھا۔ یہاں آنے والے خود بخود اپنے لئے کوئی خدمت تجویز کر لیتے تھے۔ کوئی نگر میں چلا جاتا، کوئی کرے صاف کرنے کی داپنی منبیل لیتا، اگر کوئی ساراج کے "ہوگا کورسوں" میں شرکت کا خواہش مند ہوتا، اس کو اپنا ہم ایک جگہ کھانا پڑتا تھا۔ ان لوگوں کی پہلے سوائی دواندہ سے فردا "فردا" ملاقات کر لائی جاتی تھی، جس پر اس کی نگاہ انتخاب فہرستی تھی وہی اس کی سیوا کا مستحق قرار پاتا، ورنہ اسے انتظار کرنے دلوں کی لمبی قطار میں شامل ہونا پڑتا تھا۔

ان لوگوں کے روزانہ کے معمولات کا شیڈول ان کے گروپ کا انچارج میا کرتا تھا جس کے مطابق وہ آشرم میں زندگی گزارنے کے پابند تھے۔ اگر کوئی مروجہ اصولوں کی خلاف ورزی کرنا تو اسے دھکے دے کر صرف آشرم سے نکل دیا جاتا بلکہ ہیٹھ کے لئے داخلہ ممنوع قرار پاتا تھا۔ سوائی دواندہ کے تمام بیروکار "چیک" کھاتے تھے۔ اس کے خصوصی سیوا داروں میں بنی مشکل سے کسی کو جگہ ملتی تھی۔ یہاں خاصی تعداد میں وہ نوجوان لڑکیاں لور لڑکے قیام پذیر تھے جنہیں ان کے والدین نے جھون کے دروازہ کھٹھانے کے بعد بذریعہ پولیس یہاں سے واپس لے جانا چاہا، لیکن وہ اپنا سامنے لے کے وہ کہتے کہ کچھ عداوتی، یہاں تول تو آشرم کے نزدیک چھٹنے کی جرأت ہی نہیں کرنا تھا لور اگر کوئی قانونی کارروائی پوری کرنے وہاں آ بھی جاتے تو نوجوان لڑکے لور لڑکیاں انہیں تحریری بیان دے دیتے کہ وہ اپنی مرضی سے یہاں قیام پذیر ہیں لور ساری زندگی اپنے خود سامنے جگہوں کے چہروں میں گزار دیں گے۔ اس کے بعد قانونی طور پر ان کو واپس لے جانے کا کوئی جواز باقی نہ رہتا تھا۔

اس شیطان کے پاس دو زبردست ہتھیار موجود تھے جن کے ذریعے وہ نوجوان لڑکیوں لور لڑکیوں کو جھوٹ میں رکھتا تھا۔ وہ تھے نہ لور مکمل جھٹکے کے ساتھ جنسی آزادی۔ بھارتی نوجوان کرنا نسل کو انہی دونوں چیزوں کی تلاش رہتی ہے۔ جن کے لئے وہ دواغ اندہ وار اس کے آشرم

کھلا لیکن جتنی تیزی سے میں اندر مگرا تھا اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ مجھے باہر نکال دیا۔ اندر کا منظر دیکھنے کی تاب بھی آتھیں نہیں لاسکتی تھیں۔ ”ہوگ آسن“ کے نام پر بے حیائی کا غلط عروج میرے سامنے تھا۔ میرے اندر گرنے اور تیزی سے باہر پھٹنے کا کمرے کے کینوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ میں نے انہیں چمکے ہوئے بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اطمینان سے اپنی ”ہوگ“ پر جاتے رہے۔ اب مجھے ابھی طرح سمجھ آچکی تھی کہ جتنی کروں میں کیا ہو رہا ہے۔

دو تین ماہ بعد اس کے آشرم میں رہنے والی کسی لڑکی یا لڑکے کی لاش شھر کے کسی دھڑان کوٹے میں پڑی مل جاتی تھی جس پر اکثر حسینی تشدد کے نشانات بھی ملتے تھے لیکن آج تک پولیس یہ بھی ثابت نہ کر سکی کہ وہاں سے کسی کا تعلق کبھی سوامی وانند کے آشرم سے رہا بھی تھا یا نہیں۔؟ ضلع بھر کے تمام اعلیٰ المروہوں کی تحقیقات ہن کے ٹورے چلتی چرتی تھیں۔ یہی علل المروہ کا قتل ————— لدھیانہ' جانورو حتی کہ فیروزپور تک کے اعلیٰ المروہ اس کی نگاہ کرم کے محتاج رہتے تھے۔ بعض لوگوں کا تو یہاں تک وشواس تھا کہ اسے ملکوت سبحانی تک دستی حاصل ہے۔ بدیا گنج نا اور غلط فاک جبل بجھا رکھا تھا اس نے۔؟؟

میں نے جن بوجھ کو اپنے لئے کمروں کی صفائی کی سیوا حاصل کی تھی۔ اس طرح مجھے وہاں ہونے والے گھمٹے کھیل کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل سکا۔ قلعہ لوگوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اس پاپی کے پاؤں ہل خواتین جھڑپے لیکن حیرت رہ گیا کہ اس کی آنکھوں میں ہیرے کے شیشے کی لاکڑی تازہ نہ ابھرا جب کہ میرا خیال یہ تھا کہ اس نے مجھے بھلا یا نہیں ہو گا قصہ صاف پوچھ کے حوالے سے یہ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ جن بوجھ کو انجمن بنا رہا یا واقعی اس نے مجھے یاد نہیں رکھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد ہی اپنے خاص کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ایک بجائے مجھے فراہم کر دی گئی تھی۔ میں بہن بوجھ کر اس مخصوص حصے کی طرف نکل گیا جہاں سواری و جاندار کے مسئلہ پہلے جاننے قیام پذیر تھے۔ ہر کمرے سے الگ الگ قسم کے مجبزی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ یہ کمرے خاصے کشادہ نور لالچے بنے ہوئے تھے۔ کمزکیں اتنی بلند تھیں کہ برآمدے میں کمرے ہو کر ان کے اندر جھانکنا ناممکن تھا۔ برآمدے میں سواری کے سیدھا دار لڑکے، لڑکیاں سرشار کی کیفیت میں لڑھ لڑھ و ڈنگتے پھرتے تھے۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر دو تین مرد عورتیں بھی موجود تھیں۔ یہ لوگ بھی ہاتھوں میں بھانڈا پکڑے "کمرے" کر رہے تھے۔

تمام سید لار ہدایت کے مطابق برآمدے ہی میں منقلب کر کے تھک کر وہی مسجد
مدرج کے بالیکوں کی عبادت میں غفل ڈالنے کی اجازت کسی کو نہیں تھی۔ میرا تخیل بڑھتا جا
رہا تھا اب میں ایک کونے والے کمرے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اپنی طرف کسی کو متوجہ نہ پا کر
میں جلد بڑھا اور میں لڑکھانے کی ایک ٹنگ کرتا ہوا کمرے کے دروازے سے جا نکلایا۔ دروازہ

سوائی ویاختہ کے کمرہ خاص کے نزدیک جہاں وہ خود رہتا تھا سوائے اس کی سیدہ نوار کنچلی یا پھر اس کے خصوصی محافظوں کے لود کسی کو پھرکنے کی اجازت نہیں تھی۔ میرا ذاتی اندازہ تھا کہ بھارتی پولیس کی گرفت سے بچنے کے لئے کئی قاتلوں لود ڈاکوؤں نے بھی یہاں پناہ لے رکھی تھی۔ یہ لوگ ہر وقت مسلح رچے تھے کہ لہنا اسٹریٹوں نے لے لے پے پے خوں میں پھیلا ہوا تھا لیکن اس کی تلاش سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ایک مرتبہ سوائی ویاختہ کا کلانڈر حملہ ہو چکا تھا جس کے بعد حکومت نے اس کے محافظوں کو لائسنس یافتہ اسٹریٹ رکشے کی اجازت دے رکھی تھی۔

رہی تھی۔ اس کا حالہ جسے کی رد و لا بھی دلچسپی سے غلط نہیں۔ دلی پر غدار شی کا ایک لوح و قلم امرتھ
 ہی اپنا محبوب کے ساتھ ایک مرتبہ اس سے ٹکرا گیا۔ سواری واپس نہ جانے کے بعد اس کی
 محبوبہ کو پیشے میں اندر لیا اور وہ آتما کی کتنی کے لئے ایک ہند تک آشرم میں مقیم رہی۔ ایک ہفتے
 کے بعد جب اس کا دوست اسے واپس بلانے آیا تو اس نے جانے سے انکار کر دیا اور اپنی ہائی مبر
 مدارج کے چٹوڑی میں گزارنے کا ذکر کیا۔ امرتھ نے اپنی محبوبہ کو سمجھایا بھلیا اور سواری کی
 چلتی گاڑیوں سے آگے کیا لیکن اس کی محبوبہ کے بھن پر جوں تک نہ رہ سکی۔ اس کے پاس بہت
 میں بائبل لکھتے تھے۔ آئی کہ تو تک ایک مرتبہ مدارج کا امرت۔ جل پی لینے کے بعد کوئی ہاش کج کر
 نہیں جاسکتا تھا۔ امرتھ نے پولیس کی مدد حاصل کی، اس کا باپ دلی میں پولیس پر شیڈز قتل
 جناب کی بیسلیٹر اسٹیبل میں اس کے قتل کے کی بازگشت کو بھی لیکن کوئی اس کی محبوبہ کو واپس نہ
 لاسکا۔ اس بات سے ملش کما کر اس نے ایک روز چھپنے چھپاتے مدارج واپس سواری پر سنبھلے
 حملہ کیا لیکن قتل کی "معدن قتل" کے آگے کسی کاغذ رکب چلا تھا۔ مدارج نے نظر بھر کر دیکھا
 ہی تھا کہ سنبھلے اس کے ہاتھ سے بچے جا کر۔ مزید فراغ و قتل کا مظاہرہ کرتے ہوئے مدارج نے نہ
 صرف یہ کہ اسے معاف کر دیا بلکہ پولیس کو سرے سے اس کے خلاف کوئی بیان قیام نہ دیا۔
 اس واقعے نے جابل بندوں میں اس کی حقیقت و جدت کو دیکھ کر دلی تھی اور اس کے بچہ کاروں

نے اپنے گرد بھگون کی حفاظت کے لئے اس کے گرد مسلح سپاہیوں کے لئے اس کے گرد مقرر کر دیئے تھے۔
میں نے اس امر پر نگاہ رکھی تھی کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا اور مقام شکر تھا کہ کسی نے میری اس حرکت کا نوٹس نہ لیا، پھر بھی میں نے وہاں سے فوراً ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا اور دوسری طرف چل دیا۔ ابھی تک مجھے وہ کچھ نہیں ملا تھا جس کی تلاش میں میں یہاں آیا تھا۔ شام تک یہی شروع ہو رہا تھا۔ شام کو پھر گرجی بھانسنے آئے تھے۔ اس مرتبہ لوگوں کی تعداد صبح سے بھی زیادہ تھی اور ”امرت جیل“ بھی صبح سے بہت زیادہ چلایا جا رہا تھا۔ مرد عورتیں وحشیانہ انداز میں اٹھ اٹھ کر رقص کرنے لگتے اور لڑکھاتے ایک دوسرے سے پلٹ جاتے۔ شیطان کی روح بھی اس شرمناک درے کو دیکھ کر شرمای تھی۔

میں زیادہ دیر اس منظر کی نگاہ نہ لاسکا اور اس کمرے میں چلا آیا جہاں بھوجن پر شلوں رہا تھا۔ دال اور پھلکے ذہرا کر کے میں آشرم سے باہر نکل آیا۔ میرا ارادہ اس وقت یہاں سے واپس چلے جانے کا تھا۔ اندھیرا اب گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سواری واندہ اپنا بھانسنے ختم کر کے دوبارہ اپنے کمرہ خاص میں واپس جا چکا تھا جب کہ اس کے بیروں کا مختلف نالیوں میں بھجن گاتے اور گانہ اور بھنگ پینے کے بعد آشرم کے کونوں کھدروں میں لڑکھاتے پھرتے تھے۔ آشرم کے باہر ایک وسیع قطعہ اراضی کار پارکنگ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں اس طرف جا رہا تھا تاکہ کسی عیسائی کے ذریعے گھر واپس جا سکوں کہ ایک کار وھول اڑاتی وہاں آ کر رکی اور شاندار سوٹ میں لباس ایک درمیانی عمر کا ہندو جو اسے خود ہی چلاتا ہوا آیا تھا۔ اُس میں سے اُتر کر باہر آیا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا اور میں نے لاشعوری طور پر اُس کی طرف دیکھا تو میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگ شکل کچھ جلتی پھلتی سی دکھائی دے رہی تھی۔

”کون ہو سکتا ہے یہ؟“ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور دو تین کاروں کا چکر لٹ کر دوبارہ ایسا راستہ اختیار کیا کہ جس سے میرا اور اس کا آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔ اس مرتبہ نووارد خاصی روشنی کی زد میں آچکا تھا اور جیسے ہی اس کے نعوش نمایاں ہوئے ”میرا خون کھولنے لگا۔ میرے سامنے بھارتی انٹیلی جنس ”را“ کا مقامی آپریشن کمانڈر کھڑا تھا۔۔۔۔۔! میجر بھاسکر۔ جسے عرف عام میں چاکلیہ جی کہا جاتا تھا۔ یہ شخص چاکلیہ کی طرح مکار اور خوشخوار تھا۔ آج تک اس کے ایریا میں گرفتار ہونے والا غیر ملکی جس پر اسے جہاد کا شک ہو جاتا تھا اس کے ہاتھوں سے صحیح سلامت بچ کر نہیں جاسکا تھا۔ وہ اپنے گرفتار شدہ گن کو ازیتیں دے دے کر پاگل ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اکثر وہ سرحدی علاقوں سے جہاد میں آنے والے بے گنہ دہشتاؤں کو جو بے چارے اکثر راستہ بھٹک کر بھارتی علاقے میں داخل ہو جاتے تھے، پانچ کر دیا کرتا تھا کیونکہ اس

کے نزدیک وہ تمام لوگ پاکستانی ہوتے تھے۔۔۔۔۔! جلی ہی میں اس نے ہمارے ایک ”دوست“ کو جس نے جیل سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ تفتیش کے بہانے انٹرو گیشن سنٹر میں طلب کیا اور ساتھ سے ڈسوا کر شہید کروا دیا۔ کٹھنی کارروائی میں لکھ دیا گیا کہ وہ طبی موت مرا ہے!! میرا جی چاہتا تھا اسی وقت اسے جیل سے مار ڈالوں۔ اس کی موت جہاں میرے لئے اعزاز تھا وہاں ان درجنوں بے گنہ سرحدی دہشتاؤں کی روحانی تسکین کا باعث بھی بن سکتا تھا جو اس کی خلائفہ تفتیش کی سمیٹ چڑھ گئے تھے۔

ایک مرتبہ پھر میں آشرم کی طرف جا رہا تھا۔ میجر بھاسکر کو ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد اب میری گھر واپسی کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ آشرم کے دروازے پر وہ آنے جانے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ میں بھی اس کی نظروں میں آئے بغیر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ جب وہ آشرم میں داخل ہوا تو میں نے سواری واندہ کے خاص سیولاروں کو اس کا خصوصی احترام کرتے دیکھا۔ وہ سیدھا صابراج کے کمرہ خاص کی طرف گیا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی ایک محفوظ اندر چلا گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی وہ باہر نکل آیا اور اس نے میجر بھاسکر کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اب سواری واندہ کے متعلق مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ صرف بھارتی راسپیڈ میں ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ میں ان لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا جو اس کے کمرہ خاص کے باہر ”بھجن گاتا“ کر رہے تھے۔

بھنگی صورت حال سے نمٹنے والا مخصوص چھوٹا سا زہر آلود خنجر نما چاقو میرا واحد ہتھیار تھا جو اکثر خطرناک مقلات پر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ ایک کاری دار اس بھجڑے کے لئے کافی ہے لیکن اتنے بھرے مجمع میں یہ کیسے ہو گا؟

میجر بھاسکر کو دیکھ لینے کے بعد اس کے خلاف میرے دل میں پہلے سے موجود نفرت دوچند ہو گئی تھی۔ ”قربا“ میں منٹ کے بعد وہ باہر نکلا۔ اس کے انتہائی شدت سے میرے اعصاب ترخنے لگے تھے اور یہ میں منٹ میرے لئے بیس صدیاں بن گئے تھے۔ میں جلد از جلد کچھ کر گزرنے کے لئے بے تاب ہوا جاتا تھا۔ حسب روایت باہر نکلتے اور اندر داخل ہوتے وقت گردنی کی داسیوں نے اس کے ماتھے پر چند را اور تنگ لگایا تھا جس نے اس کے چہرے کی خوشخواری اور بدنمائی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے صدیوں پرانے دور کا کوئی شاہی جلاز قبر سے اٹھ کر واپس چلا آیا ہو۔۔۔۔۔ وہ آشرم سے باہر نکل رہا تھا اور میں وہ قدموں اس کے تعاقب میں تھا۔

اس اثناء میں میں نے اپنا منصوبہ ترتیب دے لیا تھا اور فرار کے امکانات کا جائزہ بھی لے لیا تھا۔ جیسے جیسے وہ باہری برآمدے کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ خنجر پر میری گرفت مضبوط ہوتی جا

○○○

000

اشمیلی جس نے بڑی چالاکی و کھلائی تھی اور میجر بھاسکر کو عام شہری ظاہر کیا تھا لیکن یہ خبر جھپ نہیں سکتی تھی کیونکہ اسی رات سیکورٹی حکام نے ضلع بھر کے سمنگروں کے گھروں پر چھاپے

میں لدھیانہ چلا آیا اور پرکاش کے ساتھ رہنے لگا۔ اسے میں نے یہی بتایا تھا کہ ماتا جی کے حکم پر میں نے فی الحال ”سرد سیاحت“ بند کر دی ہے۔ پرکاش نے اس بات پر ہلکوں کا شکر ادا کیا کیونکہ عرصے سے اسے میری ضرورت لاحق تھی اور اس کی وجہ تھی مالک مکان کی وہ لڑکی جس سے اس کا عشق زوروں پر تھا۔

سدرشا کو پہلی نظر دیکھنے کے بعد ہی اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی لڑکی ہے اور عموماً ”بھارتی نوجوان ایسی ہی لڑکیوں کی فکر میں رہا کرتے ہیں“ لیکن پرکاش میں ایسی کیا غیر معمولی بات تھی جو وہ خود اس پر فدا ہو گئی۔ اس کا مجھے کبھی علم نہ ہو سکا۔ پہلی مرتبہ جب وہ پرکاش کے ہمراہ مجھ سے ملی تو میں نے اس کی آنکھوں میں احرام کے جذبیت موجزن دیکھے جو پرکاش کی ”برین واشک“ کا واضح ثبوت تھا۔ ظاہر ہے اس نے میرا عقائد تعارف سدرشا سے بڑے بھرپور انداز میں کافی تعریف و توصیف کے ساتھ کروایا تھا۔ اسے پرکاش سے محبت تھی لیکن اس بات کا بھی اسے علم تھا کہ یہ نکل کبھی مندر سے نہیں چڑھے گی کیونکہ اس کے والد کا سماجی رتبہ پرکاش کے گھروالوں سے کافی بلند تھا۔ وہ خوشحال کھتری گھرانے کی سپری تھی اور لدھیانہ میں اس کے والد کے درجنوں مکانات کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ چند دنوں کی ملاقات نے ہی اسے میری غیر معمولی صلاحیتوں کا معترف بنا دیا اور جب ایک روز اس نے مجھے اپنے گھر ملاقات بتائے اور اپنی تشویش ظاہر کی تو میں نے اسے یقین دلایا کہ میرے ہوتے ہوئے دنیا کی کوئی طاقت فن دونوں کے ملاپ کو ناممکن نہیں بنا سکتی۔

پرکاش کی تو بات ہی اور تھی۔ سدرشا کو بھی میری یقین دہانی پر اعتماد ہو گیا تھا، جس کا ثبوت اس کی آنکھوں سے جھلکتا تھا۔ اس کا خوبصورت چہرہ میری یقین دہانی سے کھل اٹھا۔ اور اس نے خاصے جذباتی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ”بھیا“ کہہ کر میرا ہاتھ مضبوطی سے دھریا۔

انسان لاکھ وحشی بن جائے، اپنی بھلوری پر اپنے فہم پر جتنا جی چاہے گھمنڈ کرنا پھرے لیکن اپنی فطرت کے کمزور پہلو چھپائے نہیں چھتے۔ قدرت کے سامنے بندہ مجبور محض ہے اور کچھ بھی نہیں۔ دست خفیب موم کی گڑیا کی طرح بڑے بڑے شہ زوروں کو جس طرف چاہے پکڑ کر کھما دے۔ میں نے ہندو معاشرے میں خود کو دیکھتے کا ڈھونگ رکھ لیا تھا لیکن نئے نئے تجربات مجھ پر ہونے لگے تھے۔ میں لاکھ پہلو بچاتا مگر کب تک؟ فطرت سے فرار میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ فن مراحل پر مجھے اپنی ٹریننگ میں سکھائے سارے اصول بے سود کھلی دیئے۔ بس میرا اعتقاد تھا اور اپنے مشن پر ایمان جو سارا دیئے رکھتا تھا اور میرے قدم مضبوطی سے اس ریل پر تھے ہوئے تھے۔

پونم سے دوسرے تیسرے روز ملاقات ہو جاتی تھی۔ ہم نے لدھیانہ کی تفریح گاہوں کے درجنوں درختوں پر اپنی مہرجت ثبت کر دی تھی۔ درختوں کے سیلے تھوں میں کئی دل تراشے تھے اور ان میں پرکاش اور پونم کو سویا تھا۔ اپنی محبت کی المیت کتنی مرتبہ قدیم عمارت کی فن بوسیدہ دیواروں کو سوئی تھی جو پہلے ہی کشمکش محبت کے تھموں سے الٹی پڑی تھیں۔ شاید اس طرح ہم لاشعوری طور پر اپنی چاہت کو امر روپ دے رہے تھے۔ بظاہر پتروں کے سنگھار سینوں میں اپنی محبت محفوظ کر کے ہم مستقبل میں نوٹس والی اس قیامت سے لاشعوری طور پر مطمئن ہو بیٹھے تھے جو اپنے دامن میں جلیلی سینے ہمارے خرمین پر لپکنے کو بے تاب تھیں۔ جہلی پونم کو یہ وشاش تھا کہ کئی جنموں کے بعد ہماری آتما کا لاپ ہوا ہے وہیں مجھے علم تھا کہ ایسے کئی جنم لینے کے بعد بھی پونم مجھ سے کبھی نہیں مل پائے گی، لیکن میں نے اپنے تئیں اپنے آپ کو وقت کے تیز و ہارے کو سوچ دیا تھا جو محبت کی طغائیوں میں مجھے بہائے لئے جا رہا تھا۔ بیاس کے ساحلوں پر بنے فن بانوں میں گھومتے ہوئے جہلی کو نیلیں سندھیا کے گیت گاتی ہیں ہم نے اپنی محبت کی شدت کو محسوس کیا تھا۔ کئی جذباتی لمحے گزرے جب اپنی دھڑکنیں ایک دوسرے میں سوئی تھیں۔ وقت، ملات اور مستقبل سے بے نیاز ہو کر ہم دونوں ایک دوسرے کے سنگ سنگ فضائے بیکراں کی دھتوں میں اڑے چلے جا رہے تھے۔

اور پھر۔۔۔ ایک روز پونم نے پرکاش کو راکھی باندھی تو سدرشا نے بھی میرے ہاتھ میں راکھی کی زنجیر پستا کر مجھے بھائی بن کے مقدس رشتے میں جکڑ کر گویا مجھ پر ایک اور گرہ لگا دی۔۔۔ مجھ پر فن سب لوگوں کی محبت کی گرفت بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر نئی گرہ میرے فرار کو ناممکن بناتی جا رہی تھی۔ پونم، پرکاش، موسیٰ، مانا، پوجی اور اب سدرشا۔۔۔ میں کمالی کمال سے بچ کر نکل سکتا تھا۔ ننڈو اور سالک رام مجھے پونم سوچ کر کتنے مطمئن تھے، اس کا اندازہ کچھ میں ہی لگا سکتا تھا۔

تلوار کی دھار

قرباً" میں چھبیس روز چھٹی منانے کے بعد مجھے ایک مرتبہ پھر میدانِ عمل میں کوونے کا حکم ملا، اس مرتبہ میں گورداسپور جا رہا تھا۔۔۔۔۔ پر کاش کو حسب سابق میں نے "بزنس ٹور" کا بہانہ تراشا تھا۔

گورداسپور اور پٹالہ کے درمیان دریائے بیاس کے کنارے دشمن نئی مورچہ بندیاں ترتیب دے رہا تھا جہاں انتہائی اہم نوعیت کے خطرناک ہتھیار نصب کئے جا رہے تھے۔۔۔۔۔ مغربی سرحدوں پر بھارت کا پنجاب میں یہ پہلا دفاعی حصار تھا کیونکہ راوی عبور کرنے کے بعد بیاس تک کا علاقہ میدانِ بی ہے اور کسی بھی تربیت یافتہ فوج کے لئے کھلی شکار گاہ کا کام دے سکتا تھا۔

دشمن کی منصوبہ بندی اچانک عمل میں آئی تھی اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے انتظار کیا جائے کیونکہ سرحدی اضلاع میں فوجوں کی حمزہ سے بڑھتی ہوئی نقل و حرکت کسی بھی لمحے جنگ کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔

سرحد جنگ عروج پر تھی اور ان حالات میں لمحہ لمحہ کی خبر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ دشمن کی جنگی حکمت عملی پر کڑی نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ خاص طور سے وہ شکاف ڈھونڈنے پڑتے ہیں جن کے ذریعے دشمن کے اندر گھسنے کے مواقع میسر آسکیں۔

مشرقی پنجاب کے دفاع میں دریائے بیاس کو ریزہ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس پہل کی جہتی بھارتی دفاع کی دھجیاں بکھیر سکتی تھی۔ دشمن نے دریائے بیاس پر "سری ہرگو بند پور" کے نزدیک ساحل کے ساتھ ساتھ میلوں تک اینٹی ایئر کرائٹ گنز کا سلسلہ پھیلا دیا تھا۔ ان کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ حملے کے سائنز پر چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی اور دریائے بیاس کے پہل پر ایسا خطرناک "چھتا" ترن جاتا جس میں سے کسی ماہر ترین ہوا باز کا گزر بھی ممکن نہ ہو سکے۔ محاذ آکر طیارہ شکن (اینٹی ایئر کرائٹ) توپوں کا ہی ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ ہمارے جیالے ہولباؤوں کے لئے بھارتی دفاع کا غرور توڑنا کوئی مشکل بات نہیں تھی، لیکن بھارت نے حل ہی میں روس سے حاصل شدہ آٹو جیک میزائل سسٹم بھی ہمیں کہیں چھپا رکھا

تھل جسے فوراً ڈھونڈ نکالنا ضروری تھا۔

گورداسپور سے میں نے دو تین مرتبہ کپور تھل وغیرہ کی طرف بذریعہ بس اور ٹرین سفر کے ایک نظر طیارہ شکن توپوں کا جائزہ تو لے لیا تھا لیکن ابھی تک مجھے وہ میزائل کیس نظر نہیں آئے تھے اور آخر ایک دن قریباً شام کا وقت تھا جب میں ”سری ہرگوند پور“ اتر گیا۔ جہاں یہ چھوٹا سا قصبہ نما شہر ہے وہاں اپنی مذہبی اہمیت کے پیش نظر جو اسے سکھوں کے ایک گرو کی نسبت سے حاصل ہے، یہاں کے مشہور گرو دارے میں لوگوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ واحد قتل ذکر مقام یہاں کی غلہ منڈی تھی جہاں نزدیکی دیہات کے لوگ اجناس کی خرید و فروخت کے لئے آتے تھے۔

شام سے رات تک میں اپنے برنس کے بنائے سارے شہر میں گھومتا رہا لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ملی۔ مختلف مقامات پر لوگ جنگ سے متعلق باتیں تو کر رہے تھے، لیکن ان کی معلومات عام نوعیت کی ہی تھیں۔ انیس اس حد تک ہی علم تھا کہ دریائے بیاس کے کنارے کنارے ہل کے دونوں اطراف میلوں تک بھارتی فوج نے ڈیرے ڈال دیے ہیں اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ جنگ ہونے والی ہے یا پھر وہی گھسا پٹا موضوع کہ: آج فلاں جگہ سے جاسوس پکڑا گیا ہے جو کہیتوں میں چھپاواڑ لیس کر رہا تھا۔۔۔ مگر ابھی تک میزائلوں سے متعلق گفتگو سننے کو نہیں ملی تھی۔

رات کو میں ٹاکم و ٹاشلا اس گرو دارے میں سونے کے لئے چلا آیا جہاں مجھے ایک دکاندار کی مہربانی سے کمرہ مل گیا تھا۔ بذلِ خواستہ مجھے ”پنہ“ میں شرکت کرنا پڑی۔ رات کو مجھے کافی دیر گئے تک نیند نہ آئی۔ میرے ذہن پر ساری رات ”میزائل سسٹم“ سوار رہا۔ بڑی عجیب و غریب صورت حال پیش آگئی تھی۔ ابھی تک مجھے ان کا کوئی سرچر نہیں ملا تھا جسے میں اپنی مسم کا غلط آغاز قرار دیتا۔ آدھی رات تک میں سر پر کرہ نہیں بدلتا رہا۔ اچانک امید کی ایک کرن چمکی۔ میں نے سوچا کیوں نہ دریائے بیاس کے کنارے کشتی رانی سے لطف اندوز ہوا جائے، قسمت آزمائی کرنے میں آخر حرج ہی کیا ہے، میں مطمئن ہو کر سو گیا۔

صبح گرو دارے سے ہی ”کڑھا رہا شاد“ کھا کے میں سیدھا مقامی مارکیٹ پہنچا۔ یہاں ایک دکاندار کچھ زیادہ ہی صبر نواز قسم کا مل گیا تھا۔

”ست سری اکل“ میں نے دونوں باپ بیٹے کو دیکھتے ہی دانت ٹکل کر پتھر کیا۔

جواب میں انہوں نے بھی فتح ہلائی۔ میرا حال دریافت کیا اور رات کے قیام کے متعلق اپنی

تشفی کی۔

”مہاراج جی یہاں میرا کام تو ختم ہو گیا ہے لیکن آپ کے سلوک نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ آپ سے ملنے چلا آیا ورنہ میں تو دلہن لدھیانہ جا رہا تھا۔“ میں نے ہن میں ہوا بھرنی شروع کی۔ ”دھن بھاگ، دھن بھاگ؟“ دونوں باپ بیٹا اٹھاری سے بولے۔

انہوں نے فوراً ”چائے منگوائی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں لیکن اب انوس ہو رہا ہے کہ آج سے پہلے آپ ایسے اچھے لوگوں کے درشن کیوں نہ ہوئے۔ میری تعریف پر وہ دونوں پھولے نہیں سارے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں، میں نے دریا میں کشتی رانی کرنے کی خواہش ظاہر کی اور انہیں بتایا کہ یہ میرا بہترین مشغلہ ہے۔ فوراً بیٹا جس کام بکندر لکھ تھا تیار ہو گیا۔

”لیکن سنا ہے مہاراج جی آج کل اس طرف فوج نہیں جانے دیتی۔“ میں نے اپنی تشویش ظاہر کی۔

”اجی سینا کی.....“ بکندر لکھ نے کھل سکھ بننے کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوج کو موٹی سی گلی سے نوازا۔

”بڑی اچھا تھی مہاراج آپ نے پوری کر دی۔“ میں نے اٹھاری سے جھکتے ہوئے کہا۔ ”لالہ جی آپ تو بڑے بزدل لوگ ہیں۔ خولہ خولہ ڈر جاتے ہیں سینا سے۔“ اس نے میرے ہندو ہونے پر چوٹ کی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی ہم لوگ ایک بس کے ذریعے بیاس کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں تقریبی مقام ہونے کی وجہ سے کالوں کی کشتیاں بندھی تھیں۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ کشتیاں بھی موجود تھیں۔ ایک کشتی ہم نے کرائے پر حاصل کی اور ایک بوڑھے سے مالچ کو بھی اپنے ساتھ ہی بٹھالیا۔ میں نے جان بوجھ کر جنگ کے موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ دو تین منٹ تو بوڑھا مالچ ہماری گفتگو سناتا رہا۔ میں بھارتی سینا کی حمایت کر رہا تھا اور بکندر لکھ سے مخالفت کر رہا تھا۔ جو اپنی مخصوص سکھوں والی زبان میں ہر فقرے کا اختتام کسی گلی سے کرنا تھا۔ اس کی باتوں سے طیش کھا کر بوڑھا مالچ بھی ہماری گفتگو میں شامل ہو گیا۔ بکندر لکھ نے پاکستانی فضائیہ کے ہاتھوں ۱۵۵ میں اپنی فوج کی درگت بتی دیکھی تھی۔ وہ طریقہ انداز میں اسی کا تذکرہ کر رہا تھا جب مالچ نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

”سردار جی وہ اور وقت تھا اس سبب مختلف ہے۔“

”کیا ہے مہاشے جی۔“ بکندر لکھ نے اسے بھی چڑایا۔

جواب میں اس نے ان ہتھیاروں کی تفصیل بتائی شروع کر دی جن سے لیس بھارتی فوج کو

اس نے پیاس کے کنارے ڈیپلائے ہوتے دیکھا تھا۔۔۔ ہتھیاروں کی ساخت وہ ہاتھوں کی مدد سے سمجھا رہا تھا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر جب اس نے بڑے بڑے ٹریلوں پر لدے مختلف ساز و سامان کے متعلق بتانا شروع کیا اور یہ بھی اطلاع دی کہ وہ سامان اس نے دوسرے کنارے پر واقع ایک گھوٹ کے نزدیک اترتے دیکھا ہے تو میں نے دو تین فکروں سے ہی ایسی فضا پیدا کر دی کہ گنبد سنگھ اس پر ہاتھ دھرج کرنے لگا۔

جواب میں ملحق نے بتایا کہ اس گھوٹ میں اس کی لڑکی فلاں کے گھریباں ہے۔ سرخ بھی اس کا واقف کار ہے۔ قدرت خود بخود میرے لئے رلو ہموار کر رہی تھی۔

”قربا“ پندرہ منٹ تک گنبد سنگھ کی بحث کے بعد جب میں نے اندازہ لگایا کہ اب گنبد سنگھ سکھ پن کا مظاہرہ کرنے لگا ہے تو میں نے ملحق کو کنارے پر اتار دیا اور خود کشتی چلانے لگا۔ اب ہم نے موضوع بدل دیا تھا۔ مزید بحث گنبد سنگھ کے ساتھ خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھی۔ وہ ہر حال سکھ تھا کسی بھی لمحے اس کا دماغ خراب ہو سکتا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کشتی چلانے کے بعد ہم واپس کنارے پر چلے آئے۔ گنبد سنگھ کو میں نے یہاں سے رخصت کر دیا کیونکہ ہم نے دو مختلف سمتوں میں سفر کرنا تھا۔ جیسے ہی وہ دُفع ہوا میں فوراً اسی ملحق کی طرف پلٹا۔

○○○

ملحق ابھی دریا کے کنارے کھڑا تھا۔

”شکر کرتا چاہتا ہوں۔“ میں نے گنبد سنگھ کے روپے کی معلانی مانگتے ہوئے اس کے سامنے سکھوں کی روایتی کم مقل کا رونا دینا۔ ملحق میرے اس حیران کن روپے سے بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے زبردستی پلور شپ دس روپے دے دیئے اور ساتھ ہی ایک کھلی بھی سدا دی۔

میں نے اسے بتایا کہ میرا ایک بھائی گھر سے اپنے ایک دوست کے ساتھ پانچ ہزار روپے لے کر بھاگ آیا ہے۔ ہم لوگ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ اس کا دوست جس نے اسے درغلا یا تھا بھائی ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ یہاں گرد و نواح کے رہائوں میں ہی کہیں ان دونوں کو دونوں یعنی میرا بھائی اور اسے درغلا کر بھاگنے والا اس کا دوست موجود ہیں۔ ظاہر ہے جب تک پیسے موجود ہیں وہ گھرے اڑائیں گے۔ اس کے بعد جو میرے بھائی کا مشر ہو گا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اگر نزدیکی دیرت میں مجھے کچھ واقف کار مل جائیں اور میری مدد ہو جائے تو میں انہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ ساتھ ہی میں نے یہ درخواست بھی کر دی تھی کہ اس معاملے کو وہ لوگ

اپنے تک محدود رکھیں۔

”یہ تو کوئی بات ہی نہیں ملراج جی“ آپ جو جی چاہے اس مسئلے میں کریں۔ یہ تو وعدہ میرا فضل ہے۔ میں زمیندار ہوں۔ نزدیکی گھوٹوں میں میری زمین بھی ہے۔ اس نے اپنی نارت مجھ پر جتاتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی اسے خوب خوب کھن لگایا اور اس سے کہا کہ مجھے تو دیکھتے ہی دشواش ہو چلا تھا کہ میں اس کی مدد سے ضرور اپنے بھائی کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے دہلی آنے کی دعوت بھی دے دی اور اس وقت تک ہند رہا جب تک کہ اس سے ”ہاں“ نہ سہلوائی۔

بوڑھا ملحق مجھ پر توقع سے زیادہ ہی مہولن جیت ہوا۔ اس کی ایک کشتی میں بیٹھ کر ہم دوسرے کنارے کی طرف چل دیئے۔ جہاں ہم نگر انداز ہوئے وہاں ان حالات میں کسی کو دم مارنے کی جہل نہیں تھی لیکن فوجی شاید اسے جانتے تھے اس لئے انہوں نے اس سے ”رعایت“ برتی۔ ”کون اسی چاہتا ہے“ (کون ہے چاہتا تھا) ایک سکھ حوالدار نے لوہی آواز دے کر اس سے دوری سے پوچھا۔

”پروہتا اے اپنا سردار جی۔“ ملحق نے مختصر سا جواب دیا۔

میری توقع سے بڑھ کر تیاریاں یہاں دیکھنے کو ملی تھیں۔ طیارہ شکن توپیں پہلے سے تیار شدہ کنکریٹ کے زیر زمین محفوظ جگہوں میں چھپی ہوئی تھیں، صرف ان کی گردنیں باہر جھانکتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہم دونوں ان کے بچوں چچ چلنے نزدیکی گھوٹوں کی طرف جا رہے تھے۔ میں کن انہیوں سے صورت مل کا بھرپور جائزہ لے رہا تھا۔ راستے سے ملنے والے اکثر فوجی ملحق کے واقف تھے۔ جب وہ انہیں پرہم کرتا تو میں بھی فوراً ”جے ہند“ کہہ کر ہاتھ اٹھا دیتا۔ ”قربا“ ڈیڑھ دو فرلانگ چلنے کے بعد ایک جگہ کھیتوں کے کنارے کچھ لڑکے لڑکیاں کھل کرتے دکھائے دیئے۔

ملحق نے ان میں سے ایک کو چُٹنی لال کے نام سے پکارا اور ایک نوجوان اس کی آواز پہچان کر آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچ کر اس نے جھکتے ہوئے بوڑھے کے پاؤں چھو کر پرہم کیا اور حیرانگی سے مجھے دیکھا کیونکہ میں نے بغیر ہلن پہچان کے بڑی گر بخوشی سے اسے گلے لگا لیا تھا۔

”پروہتا ہے اپنا بیٹا دلی سے آیا ہے۔“ چاہا بولا۔

”پرکاش نام ہے میرا۔“ میں نے اپنا تعارف بظاہر مکمل کر دیا۔

ہم تینوں کھیتوں کے ایک کونے پر گلے رہٹ پر جا پہنچے جہاں بہت سی لڑکیاں کپڑے دھو رہی تھیں۔ سب نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا۔ ملحق کو دیکھتے ہی سب نے ”چاہا“ کہتے ”

”چاہا رام رام“ کتنا شروع کر دیا تھا۔ یوں حال سب کے سلام کے جواب میں ہادی ہادی ہن کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ میں بھی اس نے میرا تعارف بطور ”پردہ“ ہی کر دیا تھا۔ سب لڑکیوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے بھی ہادی ہادی ”نہتے“ کھد میرے قیمتی لباس اور ہر کشش شخصیت ”کو“ میں سے اکثر نے لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ لیکن یہ کوئی نئی یا چونکا دینی دلی بات نہیں تھی۔ لب میں بھارتی مسلاؤں کی دگ دگ سے واقف ہو چکا تھا۔

روست پر بنے ایک کمرے میں بیٹھ کر چاہا نے پہلے تو مجھے چائے پلائی، پھر کھانا ہی ایک لڑکی کو میرے لئے ”جل بھوجن“ کا حکم دیا۔ جس نے آگ لوائے اور ہاتھ سے میری سمت دیکھتے ہوئے قبیل میں گردن ہلائی اور اپنی بے چارہ بھولی سنبھالی ”مستقلی“ چال سے قیامت ڈھاتی تیز تیز قدموں سے گھڑوں کی طرف چل دی۔ چاہا نے چوٹی کو جو اس کا دلہا تھا، میری کٹائی صرف اسے سے اٹھانے کے ساتھ سنا دی کہ میں اس کے ایک دوست کا بیٹا ہوں۔ شاید اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے یہ اضافہ کیا تھا۔ ہر مل مجھے اس سے خوش ہوئی۔ سارے بھارت میں میں نے ابھی تک ایسا فرما ہوا دار والد نہیں دیکھا تھا جیسا چاہا ملحق کو لیب ہوا تھا اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بظاہر تو میں اس کوئی جسمانی نقص نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن محض بھی ٹھیک ہی تھے۔ ہر جلد ہی مجھے سمجھ آ گئی۔ اس کی دھرم جی کو شلیا سرے لسی کا منکا لور ہاتھوں میں دوٹیاں پکڑے وہی آئی تھی۔

الزنیادوں کی طرح اس کے ایک ایک سے نص پھوٹا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی اسے شادی شدہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اتنی خوبصورت بیٹی پیدا کرنے پر یقیناً ہندو ملحق کو فکر کرنا چاہیے تھا اور ایسی دہری کے دام اللہ میں پہننے والا اس کا ”واس“ کیسے نہ بنے۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا اور کپڑے سنبھالے باہر چلی گئی۔ اس نے مج سے دھوپ میں کھانے کے لئے پہلا رکھے تھے۔

من کی مزید توجہ حاصل کرنے کے لئے میں نے بھی وہی کھانا کھانے کی خواہش کی جو کو شلیا چوٹی لال کے لئے لے کر آئی تھی لیکن چاہا نے مجھے شدت سے منع کر دیا۔ وہ کوئی پرانے دور کا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ روایت کی جس کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ چاہا تھوڑی دیر کے بعد معذرت کر کے چلا گیا کیونکہ کتھیں اکیلی تھیں۔ چوٹی لال کو اس کے جانے کے بعد میں نے بھکا دیا۔

”دہری بی آپ کام کیجئے میری وجہ سے.....“ میں نے فحشہ لومہرا چھوڑ دیا۔

”یار کچھ اچھا نہیں لگتا“ اس نے ہچکچاہٹ نکال کر۔

میں نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ ”کسکھن کے لئے وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم تو شہری لوگ ہیں۔ چائے کا کپ پینے ہوئے چلے جائیں تو آوہاوان گزار دیتے ہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کھد۔

جواب میں وہ ہنس دیا اور میرا ”دھنلو“ کرنا ہوا دونوں لور لسی اٹھا کر دوبارہ کتھیں کو چل دیا جہاں اس کے ساتھی اس کے خنجر تھے۔ لب تھلی میر تھی لیکن سوچنے کے مواقع حاصل نہیں تھے کیونکہ گھوڑوں بھری خیابوں نے میرا گھیر لیا کر رکھا تھا۔ من کی ”تکت بازی“ (ڈنڈ میں من کے ہتھیاروں کی مدد سے جتنی جا رہی ہے) نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ میں من کے مختلف دھارکس کے جواب میں مسکراتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں کو شلیا کپڑے سمیٹ رہی تھی۔ مجھے نزدیک آئے دیکھ کر اس نے آگ لوائے خاص سے مسکراتے ہوئے کمرے ہو کر مجھے خوش آمدید کھد۔

”بہت خوبصورت زندگی ہے آپ لوگوں کی۔ میں نے دہرائی مائل پہلی بار دیکھا ہے۔“ میں نے محسوس شروع کرنے کے لئے فحشہ اس کی طرف اچھل دیا۔

”بس جی میا ہی ہے“ اب تو شہروں لور دھنلوں میں کوئی زیادہ فرق باقی نہیں رہا۔ ”اس نے زمین پر بھٹکتے ہوئے پکڑا اٹھا کر اسے بھٹکا دیا جس نے اس کے جسمانی زلوچوں کو بڑے خوبصورت انداز سے اچھا دیا۔ میرے دل و دماغ میں آگ چھٹکا سا ہوا کو شلیا میں جا کی جیسی کشش تھی۔ میں نے وہاں سے ہٹ چٹائی منسوب کھد۔

”کیا کرتے ہیں آپ۔“ اس نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”پرنس“ کا دوبارہ۔ ”میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اس اٹھام میں کھلا اس طرف آئی دکھائی دی۔

”اچھا آپ چل کر جل بھوجن کیجئے“ کسی شے کی ضرورت ہو تو کھلا موجود ہے“ اسے کہہ دیجئے۔ ”اس نے مجھ سے کھد۔

”شکریہ!“ میں نے جڑتے ہوئے کھد۔

”آپ صدارت جی بھوجن کیجئے“ کو شلیا نے جو میرے قریب ہی آ گئی تھی۔ بڑے تازہ لوا سے مسکراتے ہوئے کھد۔

”چلے“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ میرے آگے چل دی۔ کیا قیامت کی چال تھی عالم کی۔ ہر قدم ایک نیا انداز لئے ہوئے تھا۔ بچے تھے قدموں سے وہ میری راہنمائی کرتی ہوئی مجھے اس کمرے میں لے آئی جو شاید

مٹانے جاری تھی۔ مجھے اس بد نصیب بڑھیا پر بڑا ترس آیا۔ شام کے بعد کوشلیا بھی آگئی۔ چوٹی لال نے معذرت کر دی تھی کیونکہ آج اس کی ”پلی کی ہاری“ تھی البتہ اس نے یہ ضرور کھلا سمجھا تھا کہ کل وہ میرے ساتھ بھلی کی تلاش میں دو تین مشتبہ نزدیکی رسالت میں ضرور جائے گا اور پتا تھا کہ کیا ہے ہم دو تین روز میں اسے ڈھونڈ کر رہیں گے۔

کوشلیا کے دو بچے تھے۔ دونوں اس کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے جاتے تھے۔ ابھی وہ سکول جانے کے قتل نہیں ہوئے تھے۔ نہ اور بھلی دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر میری خدمت کر رہی تھیں۔ کھلا سے اگر میں نے تعلقات استوار کر لئے تھے تو کوشلیا نے میری دلچسپی اپنی ذات کے متعلق محسوس کر لی تھی اور وہ اپنے گرفتار محبت سے بطور ہمدردی کم از کم اس کی خدمت تو جی بھر کے کر سکتی تھی۔ میں نے بھی دوسرے اب تک دو تین مرتبہ اس سے ”دیر سے ملاقات“ ہونے پر اپنی قسمت کو کوسا تھا۔ جس کے جواب میں وہ مسکرا کر رہ جاتی اور مجھے دینے کے لئے اس کے پاس لور تھا ہی کیا؟

کھلا البتہ قاتل داد تھی کہ اس نے اپنی بھلی کو کسی حرکت پر شک کرنے کا موقعہ نہیں دیا تھا۔ میری طرف سے وہ پہلے ہی مطمئن تھی کیونکہ جس انداز میں مجھے اس سے مشق ہوا تھا۔ اس کے بعد کسی اور لڑکی پر میرا دل آجانے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی۔

○○○

رات کے پچھلے پہر جب جھڑکے کسی نزدیکی کھیت پر کوئی لوہے کے سروں میں بانسری پر ”مرزا صاحب“ الپ رہا تھا میں اس وقت کھلانے مجھے قریباً جھنجھوڑتے ہوئے بیدار کیا۔ میرے منہ سے لاشعوری طور پر نکلنے والی ممکنہ جی یا آواز کے جوش نظر اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا تھا۔ میں چوٹی لال کے کمرے میں سو رہا تھا جب کہ وہ دوسرے کمرے میں اپنی ماں کے قریب سوئی تھی۔ تیسرے اور مکان کے آخری کمرے میں کوشلیا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ محو استراحت تھی۔ اصولاً مجھے اس وقت طے شدہ مقام پر ہونا چاہیے تھا جس نے کاددہ کھلا سے میں نے کیا تھا۔ وہ اس جگہ قریباً دس پندرہ منٹ میرا انتظار کرنے کے بعد یہاں چلی آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں دبے قدموں باہر جا رہے تھے۔

کھلا آگے آگے تھی اور میں پیچھے پیچھے۔ ہم دونوں خوفزدہ چوروں کی طرح چھپتے چھپاتے باغیچوں کے باہر آ گئے۔ یہ جگہ خاصی محفوظ تھی۔ خدا کا شکر گزار کہ اس گاؤں میں کتے نہیں تھے۔ حال ہی میں محکمہ صحت نے ان کا مہلایا تھا ورنہ کوئی نئی مصیبت بھی پیش آ سکتی تھی۔ کھیت جن کا ذکر کھلانے کیا تھا گاؤں سے قریباً دو تین فرلانگ دور تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ

رک گئی۔ مجھے بھی رکتا پڑا کیونکہ قریبی کھیتوں سے روشنی کا ایک منبع چھوٹ رہا تھا شاید کوئی جیپ سٹارٹ ہو کر باہر نکل رہی تھی۔ کھلا سم کا بچہ سے بیٹ گئی اور میرے جسم میں چوینیل رینگنے لگیں۔ خیریت گزری کہ جیپ کا رخ ہمارے مخالف سمت تھا۔

جس میں ہم کھڑے تھے وہ کوئی گزرگاہ تھی جس کے محفوظ ہونے کی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی۔ اپنے منہ زور گھوڑے کی طرح لگام تروانے کے لئے بے ہمت جذبہ کو قابو کرتے ہوئے میں نے کھلا کو وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ اب ہم کھیتوں میں بی کسی جھوپڑی کی تلاش میں تھے۔ میں نے کھلا کو وہیں بٹھایا اور خود آگے چلا گیا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں کچھ دور تک دیکھنے کے قاتل ہو گئی تھیں لیکن یہاں سے سوائے بڑے بڑے ویکل اور عیارہ شکن توپوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ابھی مجھے بمشکل تین منٹ ہی گزرے تھے جب میں نے اپنے کندھے پر کسی ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ مڑ کر دیکھا تو مصیبت سر پر سوار تھی۔

”کیا ہے یہاں؟“ اس نے تجسس ہوتے ہوئے پتھاری سے پوچھا۔

”شش.....“ میں نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے واپس کھینچنا شروع کیا۔ قریباً پندرہ بیس گز چلنے کے بعد ہم رک گئے۔

”اپنی دال تو گھٹنے سے رہی۔ یہاں تو پہلے سے تھی.....“ میں نے فقرہ ادا ہو کر چھوڑ دیا۔

”کیا مطلب؟ کون ہے؟“ اس کا تجسس بڑھ گیا۔

”ایک کو میں نے پہچان لیا ہے۔ یہ وہی دیوی جی ہیں جو کنویں پر کچھ زیادہ ہی باتیں کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ وہ کل قیس شلوار والی۔“

”جیتو۔“ اس نے فوراً کہا۔

”ہم تو مجھے آتا نہیں، صبح پہچان کر بتا دوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو اس کا مطلب ہے یہ سب۔“ اس نے اپنی سکھیں کے لئے انتہائی نازیب الفاظ استعمال کئے اور ایک مرتبہ پھر میری جان کو آگئی۔ اب میں سب کچھ بھول بھلا کر اس سے جان پہچانے کی فکر میں تھا۔ بمشکل تمام کلنی خطرناک مراحل طے کرنے کے بعد میں اگلی رات تک چھٹی لینے میں کامیاب ہو سکا۔ اس اثنا میں اس کے والدین اس نے میری رگوں میں شرارے بھر دیئے تھے۔ میں کھل جاتا اگر میری مضبوط قوت ارادی ایک مضبوط چٹن کی طرح اس کے اور میرے درمیان دیوار نہ بن گئی ہوتی۔ ایمان اور جان بچ جانے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

گھر واپس پہنچ کر چارپائی پر لیٹ گیا، لیکن نیند کہاں؟ آج کی رات کے خیال کا وہ گھر افسوس ہو رہا تھا۔ کم از کم اس گاؤں کی کسی لڑکی کے ذریعے مقصد کا حصول ناممکن دکھائی دیتا تھا۔

چاہتا تھا۔ واپسی پر جب وہ خلاصہ طور چلا گیا تو میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا کیونکہ اس پر لوگوں کی آمدورفت تھی۔ ایک ذیلی راستے سے میں گلوں کی طرف چل دیا۔ ”پرکاش اینڈ پرکاش اینڈ سٹری“ کے تمام کلائنڈرات میں نے پہلے ہی جلا کر رکھ کر دیئے تھے اب میرے پاس قتل شناخت کوئی چیز باقی نہیں تھی۔۔۔۔۔ میرا مشن شروع ہو چکا تھا۔

گلوں کے ایک کونے میں بنے سانیوں کے اڑے سے میں نے ایک ربڑ کا بلنڈر شراب سے بھر دیا، اسے اپنے کپڑے کے قہیلے میں ڈالا۔ اب میں ایک غیر قانونی حرکت کا مرتکب تھا اور ناجائز طریقے سے ایک خفیہ اڑے سے شراب خرید کر دوسرے کسی گلوں یا شہر میں فروخت کرنے جا رہا تھا۔ دن کو ممکنہ تلاشی کے پیش نظر میں نے رات کے وقت سفر اختیار کیا تھا۔ یہ تھا میرا نیا جیس۔۔۔۔۔!

شام ڈھلے میں گلوں کے پرلی طرف واقع ان کھیتوں کے نزدیک کھڑا حالات کا جائزہ لے رہا تھا جن سے کچھ فاصلے پر یہ موہجہ بندیاں کی گئی تھیں۔ اس سے آگے جانا فی الحال ناممکن تھا۔ وہیں ایک کلو کے کھیت میں میں نے ڈیرے ڈال دیئے اور رات کی تاریکی کا خضر ہو گیا۔

تقریباً ”دو گھنٹے میں وہیں چھپا رہا۔ میرا ذہن اس دوران میں مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ کبھی پونم، کبھی سدرشا اور کبھی اپنا پارا ملک جہاں عزیز واقارب ویدہ دل فرش راہ کیے میرے خضر تھے۔ ان کے دعاؤں کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ مجھے یہاں بخوبی دکھائی دے رہے تھے۔ میرا ایمان تھا کہ جب تک میری قوم اپنے سپاہیوں کے لئے دعا گو ہے، ”مُن“ پر آنچ نہیں آئے گی۔ دشمن کا بے شمار اسلحہ اور بے تحاشہ جنگی جنون میں نے اپنی آنکھوں سے نظارہ کیا تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنی دانت میں میرے پاکستان کو مٹانے کے وہم میں مبتلا تھا۔

ہم ہتھ کی جنگ لڑ رہے تھے اور ہتھ کی جنگ لڑنے والے ہمارا نہیں کرتے!!

مختلف جیسوں کی جلتی جھتی روٹھیاں مجھے وہیں ہونے والی نقل و حرکت کا احساس دلا رہی تھیں۔ جب چاروں طرف سناٹا چھا گیا اور کٹنی دیر تک کسی جیپ کی ہیڈ لائٹس اندھیرے میں نہ چمکیں تو میں نے بھی اللہ کا نام لے کر قدم اس طرف بڑھا دیئے۔ میں بڑی احتیاط سے کھیتوں کے بچوں بچ سنبل سنبل کر پاؤں رکھتا اس طرف گامزن تھا کیونکہ یہ خطرہ کھوار کی طرح ہر وقت میرے سر پر لٹک رہا تھا کہ دشمن نے یہاں ”ماننز“ یعنی بارودی سرنگیں بچھا رکھی ہوں گی۔ جن پر کسی بھی وقت میرا انجیلنے میں پڑنے والا قدم کوئی قیامت ڈھا سکتا تھا۔ ذرا سا دباؤ کسی بارودی سرنگ پر پڑنا اور میرے پر لپٹے اڑ جاتے۔

پھر تک پھر تک کر قدم اٹھانا میں کچھوے کی رفتار سے اپنے ہدف کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے

میں نے آنے والی رات تک کچھ نہ ہو سکتے پر اکیلے ہی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور نیند کی آغوش میں ہلنے لے لی۔

صبح مجھے کوشلیا نے بیدار کیا۔

”بہت گہری نیند آگئی تھی؟“ اس نے چائے کا ایک کپ میرے سرہانے رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں رات کو تارے گھٹتے رہیں تو صبح نیند ہی آئے گی۔“ میرے جواب سے وہ جھینپ سی گئی اور مجھے ”جنگل اسٹین“ کا کہہ کر باہر چلی گئی۔ ناشتہ کر کے میں بھی ان کے ساتھ ہی کھیتوں میں چلا آیا۔ چوٹی لال جو صبح صادق کے وقت کنویں پر سویا تھا اسے بیدار کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا اور کھلا اور کوشلیا کے نزدیک کنویں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ دونوں حسب سابق کپڑے دھونے میں لگ گئی تھیں۔ پھر کوشلیا اور اس کے بچے تو ”ناک“ دیکھنے کھیتوں میں چلے گئے اور وہ بلائے جان وہیں رہ گئی۔

○○○

دس گیارہ بجے کے قریب چوٹی لال بیدار ہو گیا۔ اس نے رات گھر نہ آنے پر اپنے ”پروہنے“ سے محنتی مانگی اور اسٹین کرنے چلا گیا۔ کھلا اور کوشلیا کا لایا ہوا ناشتہ کرنے کے بعد وہ تیار ہو گیا اور ہم دونوں اپنے جملی بھائی اور اس کے آوارہ دوست کی تلاش میں قریبی دیہات کی طرف چل دیئے۔ شام گئے تک ہم مختلف دیہاتوں کی خاک چھاننے رہے لیکن گم شدہ افراد کو نہ ملتا تھا نہ ملے۔ اس اثناء میں چوٹی لال میری امید بندھاتا رہا کہ جلد یا بدیر بلا آخر ہم انہیں ڈھونڈھ نکالیں گے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اس کے ایک دوست کے ڈیرے پر کھلیا جہاں مجھے ”ماتا دیشنو کے دشمن کی اٹی“ دکھانے پر شراب سے نجات مل سکی ورنہ تو وہ لوگ مجھے ناکر چلانے پر قتل گئے تھے۔

واپسی پر میں نے چوٹی لال سے گوروا سپور جانے اور وہیں قسمت آزمائی کرنے کی اجازت طلب کی۔ وہ بھند تھا کہ میں دو چار روز اذیر قیام کروں۔ کم از کم چاچا سے ملے بغیر تو نہ جاؤں لیکن میں نے اسے یقین دلایا کہ میں دو ایک روز میں واپس آؤں گا اور اس کے ہاں قیام کروں گا اور وہی سے خود آکر اسے اور بچوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ایسے محسن کی سیوا نہ کرنے سے میرا دھرم بھرشت ہو سکتا تھا۔

واپسی پر ہم کھیتوں کے بجائے سیدھے گھر چلے آئے۔ خیریت گزری کھلا ابھی تک کھیتوں سے واپس نہیں آئی تھی۔ غالباً ”میری آمد کی خضر تھی۔“ میں نے چوٹی لال کو گلوں کے باہر بڑی مشکل سے واپس جانے پر مجبور کیا ورنہ وہ تو مجھے کم از کم نہبہ چڑھانے تک میرے ساتھ رہنا

جیسے میں اس کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا میرے خون کی گردش میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ ایسے مواقع پر وہ کہ میرے دل میں خیال آتا۔ کاش میں کمناؤ ہوتا اور دشمن کو تس تس کر کے رکھ دیتا اور اپنے دل کی بھراس نکال لیتا۔ مجھے اندھیرے میں دو تین لائٹیں جلتی نظر آ رہی تھیں۔ جو مختلف خیموں کے باہر لگی تھیں۔ ان خیموں میں ان اسلحہ جات سے متعلق عملے کا قیام تھا یا پھر وہ کیو فلاح کرنے کے لئے گازے کئے تھے۔

میں اب منزل پر پہنچ چکا تھا۔ مختلف نصب شدہ آلات نے ایک خطرناک اسلحہ کی موجودگی کا انکشاف مجھ پر کر دیا تھا۔ جدید ترین اور انتہائی موثر آٹومٹک میزائل سسٹم یہیں نصب تھا۔ یہ وہ روسی میزائل تھے جو دشمن نے حال ہی میں حاصل کئے تھے اور جن کے خود کار نظام فائرنگ سے کسی حملہ آور طیارے کے بچ نکلنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہی رہ جاتے تھے۔ جیسے ہی حملہ آور طیارہ ریڈار کے مخصوص علاقے میں داخل ہوتا وہ ایک خود کار نظام کے ذریعے اس کی اطلاع فوراً میزائل کے فائرنگ سرکٹ کو کر دیتا تھا جو طیارے کو فائرنگ ریج میں لے آتا۔ جیسے ہی طیارہ فائرنگ کی حدود میں آتا ایک اور خود کار نظام کے ذریعے خود بخود فائرنگ پش پش حرکت میں آ جاتا۔ نصب شدہ میزائل اپنے ٹیگر سے نکل کر اس کے تعاقب میں لپکتا اور چند لمحوں میں طیارے کو جا لیتا۔ یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں مکمل ہو جاتا اور پائلٹ کو اس کی اطلاع اس وقت ہوتی تھی جب اس کا طیارہ نشانہ بن چکا ہوتا۔

میں رہنمائی ہوا اپنے ہدف کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا۔ قریباً دس پندرہ منٹ تک میں وہیں موجود مختلف چیزوں کا جائزہ لیتا رہا۔ اپنے مطلب کی تمام اطلاعات مجھے حاصل ہو چکی تھیں۔ اب میں مختلف سمت میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کامیابی پر خوشی کے مارے میرا دل جلیوں اچھل رہا تھا اور میں کافی حد تک لاپرواہ سا اس پگڑتڑی پر رواں دواں تھا جو مجھے پکی سڑک تک لے جاتی۔

ابھی بمشکل ایک ڈیڑھ فرلانگ ہی چل پایا تھا جب اچانک "ہٹ" کی دو تین آوازیں دھتے دھتے سے گونجیں۔ میں گشتی پارٹی کے جو رات کو ایسے علاقوں میں ہنر کے لئے نکلتی ہیں ہتے چڑھ گیا تھا۔ چاروں طرف سے آنے والی آوازوں نے مجھے گھیرے میں پھنس جانے کا یقین دلا دیا تھا۔ اگر میں ایک قدم بھی آگے بڑھتا تو درجنوں گولیاں میرے جسم میں پیوست ہو جاتیں سوائے ہتھیار ڈالنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا اور فوراً ہاتھ اٹھا دیئے۔

"کون ہے؟" گور کھا لہجے میں کسی نے چلاتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی مارچ کی تیز روشنی نے میری آنکھیں چند حیا دیں 'تھیلا میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑا۔

"کیا ہے یہ؟" دوسری آواز سنائی دی اور آنے والے نے مجھے زوردار لات رسید کر دی۔ بے خیالی میں 'میں الٹ کر پرے جا کر آئے والے نے تھیلے میں سے شراب کا بھرا ہوا بلیڈر نکال لیا۔ اس اثنا میں تین چار مسلح فوجیوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا تھا۔

"کدھر جاتا تھا؟" اس گور کے والد ار نے پوچھا جس نے مجھے ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ "صلب گریب آدمی ہے" بل بچوں کی روٹی کے لئے ذرا سادہ انداز کرتے ہیں۔ شراب جا رہا تھا۔ میں نے شراب سے بھرے بلیڈر کی طرف اشارہ کیا کیونکہ تھیلا اٹھانے والے نے اسے سوگھ کر اس میں شراب کی موجودگی کی اطلاع کر دی تھی۔

"ابے تیرے غریب کی ایسی کی تھی۔" خوالدار نے میری پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔ "اٹھ سارے ابھی تیرا دھندہ کرتے ہیں۔" اس نے حکم دیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبل کر کھڑا ہو سکوں ایک اور زوردار لات میری پیٹھ پر پڑی اور میں منہ کے بل پرے جا کر۔

"سٹری کرتا ہے سلا۔" ایک نائیک بولا اور اس نے بھی میرے پہلو میں لات جمادی۔ دوسرے سپاہیوں نے بھی اس کار خیر سے محروم رہنے میں عار سمجھتے ہوئے مجھے ٹھوکر دیں پر رکھ لیا۔ میں نے اپنا سر کنیوں میں چھپا لیا۔ قریباً پانچ چھ منٹ بعد جب میں مار کھاتے کھاتے لوہ موہا ہو چکا تو انہوں نے میرے بازو کدھے پر رکھی چادر سے پیچھے کی طرف باندھ دیئے اور مجھے دھکے دھکے دھکے اپنے کیمپ کی طرف چل دیئے۔

○○○

اچانک پیش آنے والی صورت حال نے مجھے چکر دیا تھا۔ فرار کی راہیں مسدود اور دشمن سر پر مسلط۔ غلاموں نے اس بیدردی سے چپا تھا کہ بدن کا رواں رواں فریادی بن گیا۔ خصوصاً پسلیوں پر پڑنے والی ضربات سے اٹھنے والی۔ کس تو جان نکالے دیتی تھیں لیکن سوائے مبر کے اور چارہ تھا ہی کیا؟

مجھے وہ دھکے دیتے ہوئے اپنے کیمپ کی طرف لے جا رہے تھے اور جیسے ہی میں چلتے چلتے ننگرا آتا ایک زوردار لات ان میں سے کوئی نہ کوئی مجھے رسید کر دیتا۔ تکلیف اور فحش کی ملی جلی کیفیت سے میرا خون کھولنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا ان میں سے ایک آدھ کو تو مار ڈالوں خواہ اپنی جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھوئے پڑیں، لیکن یہ سب کچھ جذبات کی حد تک ہی صحیح دکھائی دیتا

چننا چلانا میرے منصب کو زیب نہیں دیتا تھا، لیکن مجھے خود کو ایک گھنیا درجے کا جرائم پیشہ شخص ثابت کرنے کے لئے یہ سب کچھ کرنا بہرحال ضروری تھا۔ یہ میرے صبر کے امتحان کا بہترین وقت تھا اور مجھے خود ہی اپنا امتحان بنانا تھا۔ میری آزمائش کی گزری آگئی تھی اور اب یہ میری اداکارانہ صلاحیتوں پر ہی منحصر تھا کہ میں ان لوگوں کو اپنے متعلق مزید سوچنے کا موقع دوں یا وہ مجھے معمولی سا جرائم پیشہ شخص ہی جانیں۔

کرب و لذت کے ایک لامتناہی سلسلے سے گزار کر بالآخر وہ موڑی مجھے اپنے کانیزنگ افسر کے پاس لے آئے۔ اس دورن میں پل بھر کے لئے بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں رہا تھا اور ”ہائے ہائے“ کا درد کرنے کے ساتھ ساتھ میری نظرس مسلسل وہیں موجود اسلحہ جات پر لگی ہوئی تھیں۔ تمام جزئیات میرے ذہن میں نقش ہوتی جا رہی تھیں۔

ابھی رات کے بمشکل بارہ بجے تھے۔ خیریت گزری کہ کانیزنگ افسر کو سوتے سے نہیں جگانا پڑا اور نہ وہ بھی اپنی نیند میں خلل پڑنے کا قصہ مجھ ہی پر نکالتا۔ میرے بازو کھول دیئے گئے تھے۔ ”کون ہے یہ؟“ اس نے کڑکدار آواز میں میری بجائے ان موڑیوں سے پوچھا جو مجھے پہل تک کھینچے ہوئے لائے تھے۔ خیریت یہ گزری کہ وہ پنجابی تھا ورنہ اس سوال کی لوٹ کافی دیر بعد آتی۔

بجائے میرے صبا دوں کے اس کا جواب میں نے دیا اور اپنی تمام تر اداکارانہ صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے ”گڑگڑا کر اس کے پاؤں پکڑ لئے۔“ ”ممداراج جی دیا کرو“ ممداراج جی دیا کرو۔“ میں نے اس کے پاؤں سے لپٹتے ہوئے کھکھکیاتا شروع کر دیا۔

”سرا یہ کہیتوں میں گھوم رہا تھا۔“ ایک حوالدار بولا۔

اس کے ساتھ ہی مجھ سے برآمد شدہ شراب کا بلیڈر انہوں نے سامنے رکھ دیا۔

”لوہ شٹ اپ۔ یہ تمہارا کام ہے یا پولیس کا۔“ اس نے انہیں انگریزی میں ڈانٹ پلانے کے علاوہ دو تین مذہب گلیوں سے بھی نوازا دیا۔

”اٹھو، اٹھو! کھڑے ہو جاؤ۔“ اس نے مجھے ٹھوکر مارے بغیر حکم دیا۔

میں ڈرنا ڈرنا کھڑا ہوا۔

چند لمحوں تک وہ مجھے گھورتا رہا۔ شاید وہ میری Face Reading کر رہا تھا مگر اسے یہاں سوائے خوف، گھبراہٹ اور بزدلی کے اور کیا مل سکتا تھا۔ ”کیا نام ہے تمہارا۔“ اس نے مجھے پارل لہجے میں پوچھا۔

”میکو، ممداراج جی۔“ میں نے ہاتھ پاندھتے ہوئے کہا۔

”کیا کام کرتے ہو؟“ اس نے میری رہائش گاہ کے متعلق پوچھنے کے بعد کہا۔

”مکلی باپ چھوٹا موٹا دھندلا کر لیتے ہیں۔“ میں نے بدستور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

ایک بھر پور نظر اس نے پھر مجھ پر ڈالی اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد اس نے اسی حوالدار کو حکم دیا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت پولیس کو سوپ آئے۔ میری جیب سے نکلنے والے پیسے اس نے مجھے لوٹنے کا حکم دیا تھا اور بلیڈر بھی پولیس کے حوالے کرنے کو کہا گیا۔ میں نے ہیرے ہاتھ جوڑے، احتجاجیں کیں کہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے لیکن اس نے میری کسی بات پر تکی نہ دھرے اور حوالدار کو مجھے لپیٹنے کا حکم دیا۔ حوالدار آہستگی سے میرا بازو پکڑ کر باہر لے آیا۔

ایک بلا تو مل گئی تھی اب دوسری مصیبت کا سامنا تھا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا، مجھے یہ تو اطمینان ہو چکا تھا کہ اب پولیس مجھے جاسوس نہیں سمجھے گی، کیونکہ میں آری تفتیش بھگت کر ان کے پاس آ رہا تھا۔ ”یہاں تو بھوت بولنے سے جان بچ گئی تھی پولیس کو اپنی شناخت کیسے کرواؤں گا؟“ پوچھتی کانیزنگ افسر تو ہٹنے سے رہا۔ ”یہ تھے وہ خیالات جو رہ رہ کر مجھے پریشان کر رہے تھے پھر دوسری بات یہ بھی تھی کہ پولیس کے چکر میں پڑ کر پندرہ بیس دن اور ضائع ہو جاتے، جب کہ یہ اطلاعات جو میں نے حاصل کی تھیں اتنی اہم نوعیت کی تھیں کہ ان کا فوراً محفوظ ہاتھوں میں پنچنا ضروری تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میرا جسم بھاگنے کے قتل رہ ہی نہیں گیا تھا لیکن بھاگنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اگر پولیس کو ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ میں ڈانچ کر رہا ہوں تو وہ میری اصلیت تک پہنچ سکتے تھے، پھر یہ بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ بھارتی پولیس ہر نئے ملزم کا مستقبل کپڑے اتار کر کرتی ہے اور یہ صورت میری شناخت کرنے میں کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہنے دیتی۔

○○○

تھوڑی دیر بعد حوالدار ایک ڈرائیور کے ساتھ مجھے جیب میں قتل کی طرف لے جا رہا تھا۔ یہاں سے نزدیکی تھا۔ سری ہرگوند پور کا ہی ہو سکتا تھا جو کم از کم پندرہ بیس کلومیٹر دور تھا اور رات کے پچھلے پراس لسانیات فصلوں سے بھرپور علاقے میں بھاگنے کے کئی مواقع میسر آ سکتے تھے۔ حوالدار کو شاید میری بزدلی کا یقین ہو چکا تھا، کیونکہ اس مرتبہ اس نے میرے ہاتھ نہیں پھیرے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ اس نے مجھے اس قتل جانا ہی نہیں تھا، کیونکہ

جب سے گرفتار ہوا تھا میں مسلسل "ہائے ہائے" اور "شکر و سراج جی" کی گردن مارتا تھا۔ میری جیب میں قہار دھنکی سو روپے کیش موجود تھا جو اس نے مجھے واپس لوٹا دیا تھا۔ ڈرائیور تو غیر مسلح تھا لیکن حوالدار کے پاس ضرور آٹومٹک رائفل تھی۔ یہ انگ بات کر وہ نوڈ نہیں تھی اور ہوتی بھی کیسے وہ کسی جاسوس یا فوجی ہنگوڑے کو نہیں ایک تھوڑا کاس بجرم کو پولیس کے حوالے کرنے لے جا رہا تھا۔

جیب ابھی کیسپ سے تھوڑے فاصلے پر ہی پہنچی تھی کہ ایک ترکیب سوچیں: حوالدار اور میں پچھل میٹ پر بیٹھے تھے۔ جیب پر ہمت نہیں تھی اور میدان جنگ میں استعمال ہونے والی بیچوں کی طرح یہ چاروں طرف سے کھلی تھی۔ حوالدار نے سکرینٹ ملگ لیا تھا۔ وہ سکرینٹ کے کش لگا لکھی بھی مڑ کر دیکھ لیتا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑا کر رہ جاتا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو سو روپے نکال لئے اور اس کی طرف بڑھا دیے۔

"سراج جی اگر آپ نے ضروری مجھے پولیس کے حوالے کرنا ہے تو یہ رکھ لیجئے۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میری رقم سینا کے کام آتی ہے۔ پولیس تو فوراً میرے پیسے جھین لے گی۔" یہ فقرہ میں نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں بولا تھا تاکہ ڈرائیور بھی سن لے۔ اس نے جیب چلاتے چلاتے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ حوالدار شش درج میں پڑ گیا تھا۔ "رشتہ دتا ہے سارے۔" اس نے مجھے ڈانٹ پلائی۔

"سراج جی رشتہ دو سو روپے کی تو ہوتی نہیں۔" میں نے ہاتھ بدلتے ہوئے کہا۔ "چار فٹروں کے بدلے کے بعد حوالدار بالکل ہی پکسل میل۔" "بھئی" ہماری تساری کوئی دشمنی تو ہے نہیں۔ میں تو تمہیں پھوڑ دیتا لیکن اب تو بات انہوں کے علم میں آچکی ہے۔"

"کوئی بات نہیں سراج جی،" ابھی ہمارے ڈیرے پہ آئے، آپ کی لور سیوا بھی کریں گے۔" میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔

ڈرائیور اس اثناء میں مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھتا رہا تھا۔ "رکھ لیجئے حوالدار صاحب بے چارے کا سن خوش ہو جائے گا۔" اس نے حوالدار کے تہمت میں آخری کیل ٹھوٹک دی اور اس نے ایک نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے دوسرا نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

پہلا مرحلہ تو بخیر و خوبی طے پا گیا اب شراب کی باری تھی۔ میں نے ان سے صرف دو ٹھوٹ پینے کی درخواست کی تھی جو انہوں نے مان لی۔ لیکن جب بلینڈر کا منہ کھلا اور اس کی منک نعتوں میں تھمتی تو ان کے منہ میں بھی پانی آگیا۔ وہاں کوئی برتن تو تھا نہیں۔ میری منت

مہمت پر پہلے حوالدار نے دو تین لمبے لمبے ٹھوٹ بھرتے بھرتے "بھرا ڈرائیور نے اپنی باری آنے سے پہلے میں نے ایک مرتبہ پھر بلینڈر حوالدار کی طرف بڑھا دیا اور دوبارہ دونوں نے یہی عمل دہرایا۔ جب میں نے اندازہ لگا لیا کہ کام ہو چلا ہے تو بلینڈر خود تمام لیا اور منہ دوسری طرف کر کے نیچے جھکے ہوئے کچھ شراب بھا کر ہلتی بلینڈر پھر انہیں تھما دیا۔

سانہیوں کے گھر کی نقل پہلے توڑی شراب نے چھ منٹ کے اندر ہی ان کے دماغ گرم کر دیے۔ وہی سہی سر ہوانے پوری کر دی اور دونوں اب ہاتھ نہٹے میں جمونے لگے تھے۔ ڈرائیور نے تو اونچی آواز سے گٹا شروع کر دیا تھا۔۔۔ ابھی تک ہم کھیتوں کے سلسلے میں ہی سفر کر رہے تھے اور اس سڑک تک نہیں پہنچے تھے جو سری ہرگوبند پور کو جاتی ہے۔

دوسرا مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے پا گیا۔ بھر میں نے ایک خاصے لمبے کھیتوں کے سلسلے کے نزدیک پہنچ کر ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے رکنے کو کہا۔

"سراج جی ذرا پیٹاب کر دوں گا۔" میں نے شرابیوں کے سے لمبے میں بات کی۔ "میں بھی کروں گا۔" ڈرائیور کو مکمل چم گئی تھی۔ وہ میرا انتظار کے بغیر جموت ہوا نیچے اتر گیا۔ حوالدار جس نے اس اثناء میں قہار "دس بارہ جلیاں چوبک ڈالی تھیں" لاکھڑائی زبان سے بولا۔

"اے بھگ نہ جانے۔"

"کیا بات کرتے ہو حوالدار جی۔ اب تو یہ اپن کا بار ہے اور بھگے تو کوئی مار دیتا سارے کو۔" میری بجائے ڈرائیور نے منہ سے لاکھڑائی ہونے جواب دیا اور میرا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ بھر ہم دونوں بدست شرابیوں کی طرح جموتے گاتے قریبی کھیت میں جا ٹھسے۔ حوالدار نے موقع خیمت جان کر نیچے کچے بلینڈر سے منہ لگا لیا۔۔۔ اسے کچھ زیادہ ہی مڑا آنے لگا تھا۔

○○○

کھیت کے ایک کونے پر تو ڈرائیور بیٹھ گیا اور دوسرے سرے سے میں اندر جا کھلا۔ پھر اندر ہی اندر ملی کی طرح بچوں کے ٹپ ٹپ چلتے چلتے میں کھیت کے دوسری طرف جا کھلا اور اس کے بعد تو جیسے مجھے پہ لگ گئے۔۔۔ کھیتوں کے بچوں بیچ میں نے قہار "تین چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا۔" نہانے اس وقت اتنی طاقت مجھ میں کہیں سے عود کر آئی تھی کہ یا تو یہ جلی تھا کہ درد اور تھکوت نے مجھے بڑھال کر رکھا تھا یا اب یہ عالم تھا کہ اپنی جسمانی تکلیف سے بے نیاز ہو کر میں پوری طرح مائل بہ پرواز تھا۔۔۔ اس اثناء میں البتہ میں نے اس بات کا ضرور خیال رکھا کہ میری سمت درست رہے۔ میں کھیتوں کے اندر ہی اندر کس طرف جا رہا ہوں "اس کا مجھے علم

اپنے کندھے پر رکھی چادر کو میں نے مضبوطی سے کس کر دھاتیوں کی مانند باندھ لیا تھا۔ خیریت یہ گزری کہ راستے میں کسی سے ٹکرائے نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ میں نے اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ دھاتیوں سے بچ کر سفر کروں کیونکہ کسی دہشت کے نزدیک چادر آنے کی صورت میں مجھے چور سمجھا جاتا اور قتل دھاتیوں کی روایت تھی کہ وہ چور کی ٹانگ یا بازو توڑنے کے بعد پولیس کے حوالے کرتے تھے اس سے پہلے نہیں۔

ذرا سکون میرا ہوا تو زخم ہرے ہونے لگے۔ چپے کرب نے سر اٹھایا اور میں ٹوٹے ٹکڑے ہونے لگا تھا جیسے کسی ماہر لوہار نے میرے جسم پر ہتھوڑے برسائے ہوں۔ خصوصاً پبلیوں کی تکلیف تو بے حد تھی۔ دھاتیوں سے۔ کس اٹھیں تو یوں لگتا جیسے اب جان گئی کہ گئی۔ ہر محل میں نے جب کاوا میں تھا تو رکھا اور بغیر رکے اپنا سفر بھی جاری رکھا۔ راستے میں آنے والے ایک خوب دہل پر کسی نے گاڑی سکلے کے لئے ڈال رکھی تھی اسے میں نے گلے میں ڈال لیا اور طلوع صبح کے قریب سر پر باندھ لیا۔ اب میں محل تک نظر آ رہا تھا کیونکہ پچھلے آٹھ دس دن سے میں نے داڑھی نہیں منڈوائی تھی۔

خدا کا شکر یہ ہوا کہ میرے چہرے پر ماریٹھ لاکوئی نشان نہیں تھا۔ جسم کے گرد میں نے چادر لپیٹ رکھی تھی اس کے علاوہ بھی قمیص پر پٹی جرسی نے میلے کپڑوں کو کسی حد تک چھپا لیا تھا۔ ایک کتوں سے میں نے منہ ہاتھ دھوئے اپنے کپڑوں پر تنقیدی نظر دوڑائی اور اطمینان کر لینے کے بعد نزدیکی گھڑوں کے گردوارے کی سمت چل دیا جس سے گرنجی کے ہاتھ کی تواڑ آنے لگی تھی۔

گردوارے میں حسب توقع بہت سی سبوتاہ نظروں نے میرا خیر مقدم کیا۔ کڑھا پر ٹپو "جھکے" ہوئے ایک دو سرداروں نے میرا جھانپنا بھی پوچھا جو میں نے انہیں مطمئن کرنے کی حد تک بتا دیا۔ زیادہ دیر میں ٹھہرا میں نے مناسب نہ سمجھا اور گردوارے کے نگر سے چائے پی کر چل دیا۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا تھا کہ یہ کون سا گھوڑا ہے نہ ہی دار کے بارے ابھی تک کسی سے گھڑوں کا نام پوچھا تھا۔ بجائے عام راستوں کے میں نے پگڈنڈیوں پر سفر کرنا مناسب جانا تھا۔

ایک مرتبہ پھر کچھوں کے لاتعلقی سلسلے میں کم ہو کر باآخر میں دوپہر کے وقت ایک سڑک پر جا پہنچا۔ اپنے صبر و ضبط کا میں نے خوب خوب امتحان لیا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک کونے میں ایک سائیکس ٹھیک کرنے والے اور غلی نے مل کر ایک درخت کے نیچے ڈیرہ بچھا رکھا تھا۔ سوتھ

مناسب چلن کر میں نے پہلی داڑھی سے نہایت حاصل کی کیونکہ اس سلسلے میں گھر جا کر میں خود قتل ہون لوگوں کو شک میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ غلی کو تھیش کا سوتھ دینے بغیر میں اس کے ہاتھ پر روپے کا نوٹ رکھ کر آگے روانہ ہو گیا۔

سڑک پر گلے ایک سنگ میل سے مجھے علم ہوا کہ یہ سڑک ٹالے کو جاتی تھی۔ قریب ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر میں ایک جگہ بس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ پگڑی کو اب پچکے کی شکل میں میں نے گلے میں لٹکالیا تھا اور ہڈی انکس میں کوئی براہمن زمیندار دیکھائی دے رہا تھا۔ قریب پندرہ منٹ کے چلن لیا انتظار کے بعد ایک لاری کی شکل دیکھائی دی جو مختلف سمت سے آ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ دیا لاری قریب آ کر رک گئی۔ میں نے ٹالے کا ٹکٹ لیا اور کونے والی ایک سیٹ پر ٹک گیا۔ ذرا سکون میرا آیا تو کئی سوئے تھے جاگ اٹھے۔ دھاتیوں کی تکلیف تو تھی ہی اب بھوک پیاس بھی چلن کو آگئے۔ فضاہت کا یہ عالم تھا کہ لاکھ ضبط کے باوجود پائیس خود بخود جھکی جاتی تھیں۔ اپنی ٹکٹ ہسٹری گزوریوں پر چھوڑنے کے لئے مجھے خود سے لڑائی لڑنا پڑی اور ذہن و جسم کی اس شکل میں ٹالے بس سینڈ قریب آ گیا۔

بس کے رکتے ہی میں نے قریبی میڈیکل سٹور کا رخ کیا اور اسپرین کی گولیاں خرید کر نزدیکی ہوئی میں جا کھڑا۔ جب چائے کے ساتھ گولیاں اور بند ذہرا کیا تو کسی حد تک میرے دھاتیوں بھلی ہوئے اور گرد کے باجول کا جائزہ لیا تو چھٹی حس بھی جاگ اٹھی اور میری پھسلتی ہوئے نگاہیں پچھلے اس "ذات شریف" پر مرکوز ہو گئیں جو ٹھنکی ہاتھ سے جانے کب سے مجھ پر نظریں جمائے قریبی میں براہمن تھا۔

شاید بس میں ہی اس نے میری حالت کا اندازہ لگا لیا تھا اور اب کسی "کاروبار" کی امید لئے میرے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ اس کی خشک نظریں ہی اس کی پہچان کے لئے کافی تھیں۔ ذرا دم کو ہسٹری لور ذہنی توجہ سے نہایت ملی تھی کہ اب ہی اٹھو آن پڑی۔



بات یہ نہیں تھی کہ میری گرفتاری کا خطرہ تھا کیونکہ پوچھ گچھ پر میں کسی کو بھی اپنے نام اور ایڈریس سے مطمئن کر سکتا تھا لیکن ایرضی ہونے کی وجہ سے اور خصوصاً ایسے سرحدی اضلاع میں اس کے بعد جو حالات کا لبا سلسلہ شروع ہوتا تھا شام میں کس کے پاس آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ کوئی مقامی شناخت؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ میرے لئے تکلیف دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ میں ہر محل قریب کو دھوکہ دے کر بھاگا تھا اور دشمن کو کمزور جانا میرے پیچھے کے اصولوں کی نفی کرنے کے مترادف تھا۔

”یار ذرا جلدی لڑے تک چلتا میرا بیگ رہ گیا ہے۔“ میں نے سائیکل رکشہ کے ڈرائیور کو کچھ پوچھنے کا موقع دینے بغیر بڑی پریشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
میرے چہرے پر اڑنے والی ہوائیں اور تیز رفتاری سے بھاگ کر رکشہ میں بیٹھنے کی وجہ سے رکشہ ڈرائیور کو بھی میری حالت کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے اپنی ٹانگیں زیادہ تیزی سے چلاتا شروع کر دیں۔ — صرف ایک دلدہ گردن سوڑ کر میں نے دیکھ لیا کہ بس رکی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ گلدھا منہ اٹھائے چاروں طرف دیکھ رہا ہو گا۔

اس مرتبہ مجھے اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ میرا اہم کام یہ تھا کہ میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان اختلافی کو شش نہ کر گزارے۔ ”میرے ایک شفیق استاد کا دہرایا یہ فقرہ میرے لاشعور میں پیش کے لئے محفوظ ہو چکا تھا۔

لڑے کے باہر ہی اس کے ہاتھ پر دو روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے میں اسے سوچتے سمجھتے کا موقع دینے بغیر پیچھے اتر گیا۔ اس دفعہ میں لڑے میں داخل نہیں ہوا بلکہ لڑے سے باہر ہی امرتسر کی طرف چلنے والی ایک بس میں سوار ہو گیا۔ ایک سکھوں والی کنگھی، نیم برہنہ بدن والی ایک لڑکی کی تصویر اور پچاس روپے۔ یہ تھا وہ ۱۹۵۵ء جو اس اپ نوڈیٹ سکھ فوجیوں کے ہونے سے برآمد ہوا تھا۔ ہونے سے میں نے سائیکل رکشہ میں ہی نجات حاصل کر لی تھی اور کنگھی اور تصویر کو جوں کا توں اسی میں رہنے دیا تھا۔

مستطیل بھاگ دوڑ، ذہنی پریشانی اور رات والی مارنے مجھے جسطائی طور پر بری طرح تھکا دیا تھا لیکن میری قوت ارادی اور اپنے مشن کی صداقت پر یقین نے عزم و عمل کا ایک ایسا حصار میرے گرد و بدن دیا تھا جس سے اندر گھسنا کسی بھی ذہنی یا جسمانی کمزوری کے لئے ناممکن تھا۔

میں ایسے حالات ہی کیوں پیدا ہونے دوں کہ کوئی میرے متعلق چھان بین کرنا چہرے؟ یہ تھی اصل میں وہ سوچ جس نے مجھے یہاں سے بھاگنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں ہوٹل سے باہر دس منٹ کے بعد ہی باہر چلا آیا۔

اب مزید درد سہل لینے کے لئے میں تیار نہیں تھا۔ فوراً ”بھانگوت والی بس کا ٹکٹ خرید کر میں اس میں سوار ہو گیا کیونکہ بھانگوت سے مجھے ذرا زور و مل مل سکا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے معلومات بھی جلد از جلد منتقل کرنا تھیں۔ — اس مرتبہ مجھے اگلے دروازے کے قریب ہی جگہ ملی تھی۔

جیسے ہی بس سٹارت ہوئی اور میرے منہ سے — بے ہوشی والی ملتی دی۔ کے الفاظ ہی بمشکل نکل پائے تھے جب وہی منٹوں صورت ڈرائیور کے سر پر گئے شیشے میں ابھری۔ شاید بے چارہ باؤس ہو کر گودا سپور لائنیں دالیں جا رہا تھا۔ اس اچانک صورت حال سے خواہ مخواہ میری ہنسی نکل گئی۔ شاید اس نے بھی مجھے بس میں دیکھ لیا تھا کیونکہ حیرت اور خوشی کے لئے بے جا تاثرات جو اس کے چہرے پر اچانک ملاقات سے ابھرے تھے، ان کی ایک جھلک تو میں نے بھی دیکھ لی تھی۔

مجھے فوری فیصلہ کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اب میرے پاس پیسے بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے اور بھانگوت جانا بھی ممکن نہیں رہا تھا کیونکہ اب تو اس کا میرے متعلق شک یقین میں بدل چکا ہو گا۔ مجھے نہ صرف اس سے بچنا پڑا تھا بلکہ پیسے بھی حاصل کرنے تھے۔ ہمارے سی کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی تھی اور نہ میان پہنچنے سے پہلے میں تیار ہونے کا خطرہ سہل نہیں لیتا تھا۔ کئی کئی سیٹ کھول کر وہ اس پر بیٹھ گیا۔ بس اور نوڈی تھی۔ اس کے اور میرے درمیان آٹھ دس سواریاں کھڑی تھیں۔

جیسے ہی بس لڑے سے نکل کر سائے والی ٹریک سے بھری پری سڑک پر پہنچی، میں چلا یا۔ ”اوہ میرا بیگ رہ گیا۔“ اور اپنے آگے کھڑی سواریوں میں سے تیزی سے جگہ بنانا دروازے تک جا پہنچا۔ بس ٹریک میں اختلافی کم رفتار سے چل رہی تھی، میں بھرتی سے نیچے اتر گیا لیکن غلطی ہاتھ نہیں۔

دروازے پر لٹکے ہوئے ایک اپ نوڈیٹ سردار کی جٹوں کی پچھل جیب سے ایک بڑا بھی ساتھ لیتا گیا تھا۔ —

جیسے ہی میں نیچے اتر، لڑے کی طرف جانے والے ایک غلطی سائیکل رکشہ کو پکڑنے کے لئے مجھے غصی دوڑ لگنی پڑی۔ میں اچھل کر پچھل سیٹ پر جا بیٹھا۔

ٹھنڈی چھایا

سہ پہر کے وقت میں امرتسر میں موجود تھا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی اطلاعات منتقل کیں، پھر ایک ہوٹل میں کھانا کھا کر لدھیانہ کے لئے بجائے کسی بس کے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ جہاں ایک قہقی کی مہربانی سے مجھے قمرؤ کللاس کا ایک برتھ لوگھنے کے لئے مل گیا۔

— رات کے قریب ”مگیارہ“ بجے جب میں لدھیانہ پہنچا تو بخار سے میرا جسم پتک رہا تھا۔ ورد کے مارے آنگ آنگ ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ جیسے ہی گاڑی میں دوڑ بن سفر میں نے ذرا سی کمزوری دکھائی، بخار نے آن دو چلا۔ اب ہر طرح کا خطرہ قریب ”ٹل چکا تھا۔“

ایک رکشہ کے ذریعے میں گرتا پڑتا پرکاش کے پاس پہنچا۔ اسے خیند سے بیدار کیا اور بے جاں سا ہو کر اسی کے بستر پر گر گیا۔ ”قربا“ نیم بے ہوشی کے عالم میں عین نے اسے یہ قصہ سنایا تھا کہ ”دورین سفر رات کے وقت ہماری بس کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا کیونکہ میں نے کچھ ”بہلوری“ کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا۔ اس لئے مار مار کر انہوں نے میرا بھر کس ٹکڑا دیا۔“

لبے روٹ پر چلنے والی بسوں کا لٹ جانا کوئی اچھبے والی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے واقعات اخبارات میں پڑھنے کو اکثر مل جاتے تھے اور ان دنوں تو گورداسپور کے گرد و نواح میں ”شرمیاں“ ڈاکو کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ آئے روز وہ کسی نہ کسی بس کی ساریوں کو اپنا نشانہ بنائے رکھتا تھا۔ اس کی غنڈہ گردی کا یہ عالم تھا کہ اس کے ہاتھوں لٹنے کے بعد لوگ اس کے خلاف پولیس میں رپٹ لکھوانے سے بھی ڈرتے تھے۔

ظاہر ہے میں بھی اسی کا شکار بنا ہوں گا۔۔۔!

میں ساری زندگی بھی چاہوں تو پرکشش کا اس رات کا قرض نہیں چکا پاؤں مگر رات کو بارہ بجے کسی ڈاکٹر کی خدمت حاصل کر لیتا اسی کا کام تھا۔ نچانے آدمی رات کے وقت وہ کسی میڈیکل سنٹر والے کو جگا کر دوایں لے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے دو تین انجکشن لگا دیے۔ جن کی وجہ سے میں چونوں کے زہریلے اثرات سے بچ گیا۔ میری آنکھ تو رات کے آخری پہر لگ گئی تھی لیکن پرکشش نے ساری رات آنکھ نہیں جھپکی۔ میں اُسے سوئے کی درخواست کرتا رہا لیکن

میرے ضد کرنے کے بلوجود وہ ساری رات ایک کرسی میرے سرہانے بچا کر میری چارواری میں مصروف رہا۔

صبح میں جب نیند سے بیدار ہوا تو خلصا لفظ محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کی دولتی کھلنے سے بے تماشہ بہینہ آگیا تھا جس سے بدن کللی ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ جسم پر مختلف جگہ البتہ تشدد کے نشانات لیے پڑ گئے تھے۔ خیریت یہ گزری کہ سوجن نہیں آئی تھی ورنہ بیماری کا وقفہ خلصا طویل ہو سکتا تھا۔ مجھے لفظ ہوتے دیکھ کر پرکاش کے چہرے پر ہشاشت دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم ٹلٹے سے فارغ ہو گئے وہ نیچے کارخانے میں چلا گیا جب کہ میں اوپر والی منزل کے واحد رہائشی کمرے کے باہر دھوپ میں آرام وہ کرسی پر بیٹھ کر گزرے واقعات کا تجزیہ کرنے لگا۔

اور پھر گزشتہ چند روز کے اخبارات میرے ہاتھ میں آ گئے۔

میرج بھاسکر کے قتل نے ”را“ کے ہیروئن میں زلزلہ پھا کر دیا تھا۔ بھارتی سیکورٹی نظام سے متعلق قریباً ساری ایجنسیاں جو خصوصاً پنجاب میں کلام کر رہی تھیں انہیں یقیناً اپنے غیر محفوظ اور بوڑھے پن کا احساس ہونے لگا ہو گا کیونکہ سرحدوں کے اتنے اندر اگر ایک اہم آفیسر کا قتل کوئی معمولی بات نہیں۔

عام اطلاعات کے مطابق بھارتی سیکورٹی افسران یہ بات تو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ یہ کسی غیر ملکی جاسوس یا کمانڈو کا کارنامہ ہے۔ ان کے خیال میں یہ تو ممکن تھا کہ پلاننگ پاکستانی انٹیلی جنس نے تیار کی ہو لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے مقامی ”ہمدردوں“ کی خدمت حاصل کی گئی تھیں۔ اب ان ہمدردوں کا سراغ لگایا ہی انہوں نے اپنی عزت کا مسئلہ بنالیا تھا اور اس سلسلے میں پنجاب بھر میں ڈیفنس آف انڈیا روڈز کو بروئے کار لاتے ہوئے مشرقی پنجاب کی پولیس نے قریباً سارے ہی ہمسور سنگڑوں کو نظر بند کر دیا تھا۔ سرحدوں پر ”بی۔ ایس۔ ایف“ (ہارڈر سیکورٹی فورسز) کی گشت بڑھ گئی تھی اور کہنی بیڑ کو اردوں سے محفوظ دستانے کلنی تھوڑوں میں سرحدوں پر پھیلا دیئے گئے تھے۔ ”ہوم گارڈز“ جو سرحدی رسالت کے تربیت یافتہ نوجوانوں پر مشتمل تھے۔ اسے بھی جدید اسلحہ سے لیس کر دیا گیا تھا۔ سرشام ہی یہ لوگ اپنی مقرر کردہ ڈیوٹیوں پر پہنچ جاتے۔ ہوم گارڈز زیادہ تر اپنے اپنے دھاتوں کے ارد گرد ہی گشت لگایا کرتے تھے۔ مقامی باشندے ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے دھاتوں کو سرحد کی طرف سے آنے والے خفیہ راستوں کا علم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کم از کم ان کے رسالت کی حد تک سرحدوں کے آر پار آنے والوں کی محفوظ پناہ گاہیں کونسی ہو سکتی ہیں۔

ان اقدامات کے نتیجے میں اور تو کیا فائدہ پہنچا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سرحدوں کے آر پار

موشیوں کی چوری اور سنگٹ کی وارداتوں میں خاصی کمی واقع ہو گئی۔ سوائے ان لوگوں کے جو سرحدی محافظوں سے ساز باز کر کے ان کی خدمت میں شروع سے خطرہ نذرانہ پیش کرتے آ رہے تھے اور کسی کو سرحدوں کے نزدیک پھنکنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ دشمن کے بنے ہوئے جیل میں نقب لگانے کی بجائے ہم نے اسے بیس مصروف رکھا اور اپنے ”لانچنگ پیڈ“ تبدیل کر لئے۔ دشمن تھلا کر رہ گیا۔

میرج بھاسکر کے قتل کے بعد سے میں نے مہاراج یا کلب کے نزدیک پھنکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ابھی تک اس سلسلے میں بیوٹی کی طرف سے کسی کا متوجہ نہ ہونا اس بات کا واضع ثبوت تھا کہ سوامی جی نے مجھے آشرم میں واقعی نہیں پہچانا تھا یا اگر انہوں نے مجھے پہچان بھی لیا تھا تو ان کا ذہن اس طرف نہیں گیا ہو گا۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا۔ ”کیوں نہ بھارتی انٹیلی جنس کو اس شک میں مبتلا کر دیا جائے کہ میرج بھاسکر کے قتل میں سوامی داند کا ہاتھ بھی تو ہو سکتا ہے؟“ ایک مسکراہٹ خود بخود میرے ہونٹوں پر پھسلتی چلی گئی۔ اس طرح وہ شیطان ہمارے خلاف بچھائے ہوئے جیل میں خود پھنس سکتا تھا اور ایک مرتبہ مشتبہ ہونے کے بعد کم از کم یہ ضرور ہوتا کہ بھارتی انٹیلی جنس کے سوامی کے ساتھ ”دوستانہ“ مراسم ختم ہو جاتے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ایک خامسے بڑے ”حساس علاقے“ میں ہمیں کھل کر کلام کرنے کا موقع مل سکتا تھا کیونکہ جاسوس ہر حال انسان ہوتا ہے۔ حکومتی اداروں کے بچھائے ہوئے خطرات سے بچ لکنا تو اس کے لئے ممکن ہو سکتا ہے لیکن اتنی معصومیت اور مکاری سے پھیلانے ”پھندے“ سے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

اپنے ان دوستوں کے ذریعے جن کی رسائی متعلقہ افسران تک ممکن ہو سکتی تھی میں نے تفتیش پر ہمسور افسران کے کھن میں یہ بات پہنچانے کے طریق کار پر غور کرنا شروع کیا اور میرا ذہن کڑی سے کڑی ملاتا بالآخر زنجیر کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔

بے چارہ سوامی!۔۔۔

○○○

ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے قریب دھرا اخبار دوبارہ اٹھالیا اور اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ ابھی اخبار آنکھوں سے لگایا ہی تھا جب اوپر والی میز میوں سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے یہی سمجھا کہ پرکاش ہو گا کیونکہ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میری خیریت دریافت کرنے اوپر آ جاتا تھا بلکہ کارخانے کے بلٹی ملازمین بھی جلوس کی محل میں کچھ دیر پہلے مجھے ”شہ

”جنگوں نہ کرے۔“

”پرمانہ نہ کرے۔“ بے ساختہ دونوں کے منہ سے باری باری نکلا۔

میں نے قریباً سارے جسم پر کسل لوڑھ رکھا تھا۔ چہرہ چونکہ ڈاکٹری مہربانی سے سوجن سے محفوظ رہا تھا اس لئے دونوں کو صورت حل کی یقینی کا احساس نہ ہو سکا لیکن جتنی دیر وہیں سدرشا اور پرکاش بیٹھے رہے، پونم کو ایک پل قرار نہ آیا۔

اصل میں وہ دونوں ہمیں اپنے کالج کے بیٹا بازار میں لے جانے کے لئے آئی تھیں۔ میں نے تو تینوں کو بھیجتا چلا لیکن سدرشا اور پرکاش بھی ہلن خواستہ میرے ضد کرنے پر گئے تھے جب کہ پونم وہیں رہ گئی تھی۔

”ایک بات پوچھوں پرکاش بھو؟“ پونم نے جھکی پلکیں اٹھائیں۔

”ہوں۔“ میں نے حسب معمول کہا۔

”آپ یہ لابیلی زندگی آخر کیوں گزارتے ہیں۔ جو کلم پرکاش بھیجا کرتے ہیں، وہ آپ کیوں نہیں کرتے؟ انہیں باہر شہروں میں جانے دیا کیجئے۔ آپ یہاں کے محلات سنبھال لیجئے۔ بھوجی بھی آپ کی ہمت ماننے ہیں اور کسی کی تو سننے نہیں۔ ان کے قریب رہنے سے ممکن ہے وہی اب سیاست سے باز آجائیں ورنہ تو حکومت اب خاصی سختی کرنے لگی ہے۔ آپ کم از کم میرا نہیں تو ماتامی کا ہی خیال کیجئے۔“ اس نے قریباً روہانسی آواز میں کہا۔

”اگر تمہیں اس واقعے نے زیادہ متاثر کر دیا ہے تو میں بھاگ کر دکھا سکتا ہوں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ معمولی سا حادثہ تھا جس مجھ سے برداشت نہ ہوا کہ کوئی مجھے کمزور جان کر میرے پیسے چھین لے۔ پھر یوں بزدلوں کی طرح زندگی گزارنا مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے اپنی جذباتی کیفیت دہانے کے لئے لفظوں کی آڑ لیتا چلا لیکن بے سود۔۔۔۔۔ اس کے لہجے میں کتنی اپناہیت نے مجھے کھٹکا دیا۔

پونم نے اس مرتبہ پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو ٹپ رہے تھے اور میں نہیں پہچانتا تھا کہ یہ انمول موتی یوں لٹا دیئے جائیں۔ شاید لاشعوری طور پر میری خواہش یہ رہی تھی کہ پونم اس وقت تک انہیں محفوظ رکھے جب یہ سوتے خشک پڑ جائیں گے۔ وہ روٹا چاہے گی اور رو نہ پائے گی۔ وہ میری چارپائی پر بیٹھی تھی، میں بے اختیار ہو کر اٹھا۔ اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے اسے مخاطب کیا لیکن میری اس حرکت کا رد عمل شدید تھا۔ پونم نے آنسوؤں سے بھیجی لاچار سی مسکراہٹ سے میری سمت دیکھا اور مجھ میں ساگنی۔ آنسوؤں کا سیل رواں اس کی چھٹی آنکھوں سے بہ نکلا۔ میں نے اسے تشفی دینا مناسب نہ جانا کیونکہ ان لمحوں

کھنکھیں ارہن“ کر چکے تھے، لیکن یہ کیا! ایک سے زیادہ قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ چور کی داڑھی میں ننگے کے صداقت میں چونکا ہو گیا لیکن آنے والوں کی شکلوں پر نظر پڑتے ہی سکھ کا ایک لمبا سانس میرے منہ سے خارج ہوا۔ آگے پرکاش تھا اور اس کے پیچھے پونم اور سدرشا۔ دونوں شاید کالج سے آرہی تھیں۔

سفید ساڑھی پر پونم نے سرخ سوئیر پن رکھا تھا۔ ناگن زلفیں بل کھا کر شانوں پر پھیل چلی گئی تھیں۔ وہ روایتی ہندو ملبوس کی طرح جوڑا کم ہی ہتھ دھارتی تھی۔ دھوپ کی تہاڑت سے اس کے ہاتھوں کا رنگ تپ کر گلابی ہو رہا تھا۔ اس کی چلوں کے ابلے گندے آنکھوں کی جوت جگا رہے تھے۔ وہ اس پر جس نے اہلیہ کے دامن میں بیٹھے تیاگی کی مدد ملے جیسا کہ ایک ہی جھٹک دکھا کر غارت کر دیا تھا، شاید دوسرا جنم لے کر میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی پردہ دار چال میں قرون پرانی کسی حسن کی ملکہ کا وقار سمٹ آیا تھا، وہ پارٹی تھی جو آکھش سے دھڑکتی پر گھٹ ہو کر اپنے پریم بھاری کو اپنے درشن دینے آن براتی تھی۔ میرا رواں روہاں مسرت سے ملیج اٹھا۔ اسے دیکھتے ہی میری شریالوں میں انہیلا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اک وجدانی کیفیت، اک فن دیکھنا نہ مجھ پر طاری ہو گیا۔ میں نے اپنا دامن دل داکیا اور وہ میری دھڑکتوں پر چلتی چلی آئی۔

”کیا ہو گیا؟“ اس نے پریشانی سے کہا۔

”ویرجی؟“ سدرشا کے لہجے میں چھپی محبت کا ایک اپنا انداز تھا۔

”کچھ نہیں، بس یونہی۔“ میں نے دونوں کو مختصر جواب دیتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

پرکاش کو پونم کی مجھ سے محبت کی گہرائی کا کسی حد تک ضرور احساس تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پونم کو مطمئن کرنے کے بعد میرے پاس لایا ہو گا۔ پھر بھی ہم دونوں ہی کچھ پریشان سے ہو گئے۔ ”ذرا مادیر بننے لگے تھے بھائی صاحب۔“ اس نے مذاق میں پونم اور سدرشا کا استفسار بلانا

چلا۔

”اصل میں ہمت یہ ہے بھی کہ تھیں دیکھ کر اپن پر بھی بیرو کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔“ میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا اور ایک مرتبہ پھر انہیں مطمئن کرنے کے لئے وہی کھلی دہرا دی۔

”زیادہ چونٹیں تو نہیں لگیں۔“ دونوں نے ایک سواں مختلف کیفیتوں کے ساتھ بیتراری سے پوچھا۔

”اگر ایسا ہوتا تو آپ کو درشن دینے کے لئے یہاں نہیں ہسپتال آنا پڑتا۔“ میں نے فضا کو حتی المقدور سنجیدہ ہانے سے گریز کیا۔

کا قضا بھی تھا کہ وہ اپنا غبار نکل لے۔ جانے کب تک وہ مجھ سے لپٹی میری دھڑکنوں میں سلٹی رہی۔ مٹی تو چاہتا تھا یہ لے امر ہو جائیں لیکن ہائے رے مجبوری! میں نے اسے خود سے علیحدہ کر کے اس کے چاند چہرے کو اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں رکھ کر اونچا کیا۔

”ایک بات کموں پونم۔“ میں نے اس کے مخصوص لہجے میں اسی کو مخاطب کیا لیکن وہ خاموش رہی۔

”تم کبھی کبھی اس طرح آنسو ضرور بہلیا کرو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں تیرنے والے گلابی ڈوروں میں سے ابھرتے ہوئے کہا۔

”جسماری آنکھوں کی قطبیت کی بوجھ جاتی ہے۔“ میں اس کی استفسارانہ نظروں میں پھر ڈوب گیا اور اس کے لہلہنے کی لوانے مجھے مار ڈالا۔

”اچھا اپنی آنکھیں پونچھ ڈالو، کیسے چلتے ہیں۔“

”کلی۔۔۔؟“ اس کی آنکھوں نے فتنے جگاتے ہوئے پوچھا۔

”جس دل دھرتی اور آکاش گالے ملتے ہیں۔“ میں نے غمی لہجے میں کہا اور پونم کی ہنسی نے فضا میں نقرئی گھنٹیں بجا دیں۔

”لیکن یہ ٹھیک نہیں“ آپ آرام کیجئے؟“ اس نے ہنسی روک کر کہا۔

”ہے بھگوان، یہ خوبصورت کیا ہم سے پیچھا چھڑانے کے لئے کیسے چھل کرتی ہے۔“ میں نے دونوں آنکھیں بند کرتے ہوئے پنڈتوں کے سے لہجے میں کہا۔ ایک مرتبہ پھر پونم کھٹکھٹلا اٹھی۔

○○○

میری صحت تو اس بات کی اجازت نہیں دے رہی تھی کہ میں چل تدری کرتا پھوں لیکن چارپائی کا ہو کر رہتا بھی مجھے منظور نہیں تھا۔ کپڑے بدل کر میں پونم کے ساتھ آہستہ آہستہ نیچے چلا آیا اور ہم دونوں رکشہ میں بیٹھ کر ایک خوبصورت سنیک بار میں جا پہنچے۔ سنیک بار کے ردبانک ماحول میں بیٹھے میرا ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ مختلف میزوں کے گرد بیٹھے نوجوانوں کے جو اپنی اپنی ”پونم“ کے ساتھ اس گوشہ عافیت میں چلے آئے تھے، سگریٹوں کے اٹھتے دھوئیں کے مرغولوں میں کہیں کھو گیا تھا۔ یہاں صرف میں تھا اور پونم کے سنیک کی خوبصورت منک، جس نے میرے گرد حصار تین کر سارے رنج اور کلفتیں بھاگ دی تھیں۔

میرے پہلو میں برگہ کی وہ گھنٹی چھلیا جیٹی تھی جس کے دامن میں پنہ لے کر درمائدہ فکروں کے راہرو اپنی ترشا بھلتے تھے۔ اس کا قرب کھٹوں کا یا مہر تھا۔ وہ محبت کی ”گیتا“ تھی جس کے

لئے رام نے بن ہاں لیا تھا۔ اس کی تلاش میں صدیوں سے نبھتے کتنے ”تپ دھاری“ ہماری کی ترانہوں میں بھٹک رہے تھے۔ وہ تبت کی دیو داسیوں کا حسین گیت تھی جسے آنے والے مسافروں کی یاد میں گایا جاتا تھا۔ راجہ اندر کے دربار کی وہ حسین لکھ سلون کی چاتنی بن کر میرے من میں اتر گئی تھی۔ خیام کی اس حسین ربائی کے ساتھ بیٹھ کر پی جانے والی کلفی جام حیات بن جاتی تھی، وقت کا احساس مٹ جاتا تھا اور گھڑیوں کی گردش رک جاتی تھی۔

”بست وقت ہو گیا، مگر بھی جانا ہے۔“ مانا جی پریشان نہ ہوں۔ میں نے انہیں کلج سے سیدھے گھر آنے کو کہا تھا۔ ”ہلا خروہ مجھے مرنی مارتی دنیا میں دلہن لے آئی۔“

ہم دونوں اٹھے، بس لڑے تک میں اسے رکشے میں چھوڑ آیا۔ میں نے اس سے ”بیٹی“ کی تھی کہ وہ گھر میں کسی کو میری حالت سے آگاہ نہ کرے، پھر پونم اپنی خوشبوئیں ہمراہ لئے رائے کوٹ چلی گئی اور میں اسی رکشہ میں پرکاش کے پاس آگیا۔

پرکاش اور سدرشا بیٹا بازار سے دلہن آچکے تھے اور میرے ہی شکر تھے۔ دونوں اوپر کمرے میں بیٹھے ایک دوسرے کو ”داد عشق“ دے رہے تھے۔

”آپ کا تو شریلین جی سیدھا سا علاج تھا۔ میں نے تو جب تک ہی ماری۔“ پرکاش نے میز پر رکھی جوں کی توں دوائیوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”کیا مسراج جی۔“ میں نے مودب لہجے میں پوچھا۔

”پونم دیدی!“ بجائے اس کے سدرشا نے کہا اور ہم تینوں قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔ دونوں تھوڑی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے، پھر پرکاش اسے چھوڑنے چلا گیا۔

تین چار روز تک میں نے صرف آرام کیا۔ روزانہ پونم اور سدرشا آجاتیں اور ہم دونوں پرکاش اپنی اپنی دنیاؤں میں کھوئے رہتے۔

○○○

میرے بھاسکر کے قتل کے متعلق ہماری سکیم کا سیلاب رہی اور تقیثی الزمرین کو یقین کی حد تک اس بات کا گمان گزرنے لگا کہ ضرور اس سواری کے بچے کا بھاسکر کے قتل میں کوئی ہاتھ ہے۔ اپنے مقامی دوستوں کی مدد سے ہم نے ایسا جمل پھیلایا کہ جس سے بھارتی سیکورٹی کے ہاتھ ایسے شاہد آگئے جن کی رو سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سواری دیانند کا ہاتھ سیکورٹی کے ساتھ ضرور کوئی خفیہ رابطہ ہے۔ اس کے علاوہ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ انہیں سواری دیانند اور میرے بھاسکر کے درمیان لڑکیوں کے معاملے میں چلنے والی خفیہ رقابت کا علم ہو جائے۔ جب یہ باتیں اعلیٰ الزمرین کے کلاں تک پہنچیں تو انہوں نے فوری اقدام کے طور پر اپنا ”دست شفقت“

سوائی بکا بکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہو گیا؟
 ہماری پلاننگ دراصل اتنی بے دخل تھی اور منصوبہ بندی اتنی شاندار کہ دور دور کی کوڑی
 لانے والے تجربہ بھی بھونچکے رہ گئے اور حالات کا علم ”جھگولن“ کو اس وقت ہوا جب وہ ہاتھ سے
 نکل گئے۔ سیکورٹی والوں نے اسے وارننگ دیئے بغیر اس سے رابطہ ختم کر لیا اور مدارج دیانند
 سوائی زخمی ناگ کی طرح سر پٹتا رہ گیا۔

کھیل اب صحیح معنوں میں دلچسپ ہو گیا تھا۔ بھارتی اٹھیلی جنس اور سوائی دیانند کے آپس
 میں الجھ جلتے کا مطلب یہ تھا کہ میدان ہمارے لئے کافی حد تک صاف ہے! میری ذمہ داریاں
 بھی ساتھ ہی بڑھ گئیں۔ اب مجھے اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتیں بروئے کار لانا کر دو محاذوں کو بیک
 وقت سنبھالنا تھا۔ ایک طرف تو مجھے ایسے حالات پیدا کرتے رہنا تھا کہ بھارتی کلکٹر اٹھیلی جنس
 سوائی دیانند کے خفیہ محلات اور بیجر ہاسکر کے قتل میں ابھی رہے، دوسری طرف اس علاقے
 میں کام کرنے والے ایجنٹوں کی راہنمائی اور ممکن حد تک حفاظت بھی میرے ذمے آن پڑی
 تھی۔ میرا زیادہ وقت لدھیانہ کے گرد و نواح اور رائے کوٹ وغیرہ میں ہی گزرتا تھا۔

اپنے زخمی ہونے کے قریب ”پندرہ بیس روز بعد میں راجبھار سے ملنے اس کے میس پیج کیا
 کیونکہ اس کی ”پُر خلوص اور پُر اصرار“ دعوت مجھے اچھی طرح یاد تھی اور ایسے دوستوں کی تو
 ہمیں اکثر ضرورت رہا کرتی تھی۔ ہوائی لڑے کے نزدیک میں کافی دیر بعد پھٹکا تھا کیونکہ اس اثناء
 میں پے در پے ایسے واقعات پیش آچکے تھے جنہوں نے میری آمدورفت اس طرح خاصی کم کر
 دی تھی۔

میں جان بوجھ کر لوقات کار میں ہوائی لڑے پر پونچھ گھر ڈوم پر میں نے فلائٹ لینٹینٹ
 راجبھار کا نام بمعہ فریڈ لکھوایا اور ملاقاتی کے خانے میں دوست کی بجائے رشتے دار کا اندراج کروا
 دیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی گارڈ روم کے فون پر اس سے میرا رابطہ ہو چکا تھا۔ اتفاق سے وہ اپنے آفس
 میں ہی موجود تھا۔ اس نے مجھے بھلایا نہیں تھا۔ شاید اسی لئے مجھے اپنے نام کے ساتھ اپنا تعارف
 نہیں کروانا پڑا۔ میرا نام سننے ہی اس کی ہاچیں کھل گئیں۔

”لوہ تھینک یو۔۔۔۔۔۔“ اس نے فون پر ہی میری آمد پر میرا مشکور ہونا شروع کر دیا۔

”ارے ارے یہ کیل۔۔۔ اتنی دور سے شکریہ وصول ہونے سے رہا۔“

”لوہ سوری! اچھا میں اردلی بھیج رہا ہوں۔“

”لو۔۔۔“ میں نے اگلی بات سننے بغیر فون بند کر دیا اور گارڈ روم کے ایک کونے میں سلیپے

سے چلے ایک صوفے میں دھن کر اس کے اردلی کا کھڑ ہو گیا۔ اس کا آفس یہاں سے دو
 تین فرلانگ دور تھا کیونکہ مجھے لینے کے لئے اس نے ایک جیب بھیجی تھی۔ جیب سے ایک سکھ
 کارپورل اتر کر اندر آیا۔ اس نے میرا نام پکار کر میری بابت دریافت کیا اور تھوڑی دیر کے بعد
 میں ایئر میں کے رن وے کے نزدیک سڑک پر آ کر اس برانچ کی طرف جا رہا تھا جہاں ”کزن“
 فلائٹ لینٹینٹ راجبھار ”آن ڈیوٹی“ تھا۔۔۔۔۔۔ جیب اس کے آفس سے جو ہوائی لڑے کے
 ایک کونے میں بنا ہوا تھا کچھ فاصلے پر جا کر رک گئی۔ اپنے دفتر کے باہر وہ میرا کھڑ تھا۔ مجھے دیکھتے
 ہی وہ مسکراتا ہوا میری طرف پوچھا اور ”ہیلو“ کا نعرہ لگاتے ہوئے مجھ سے بغلیں ہو گیا۔ میں نے
 بھی اس سے کچھ کم گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

”کیسے بھول پڑے اس طرف شریمان جی۔“ اس نے دفتر میں ایک کرسی پر مجھے بیٹھنے کو کہنے
 ہوئے بے تکلفی سے پوچھا۔

”اس طرف ”بھول“ کر کون آ سکتا ہے۔ گارڈ روم والے مٹھنے دیں گے کیل۔“ میری بات پر
 اس نے قہقہہ لگا کر دلدی۔

”میں تو سمجھا تھا آپ لوگ شاید مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ وہ کیا نام تھا ان شریستی جی
 کل۔۔۔۔۔۔؟“

”پونم!“

”ہاں ہاں وہ دیوی جی تو شاید براہن گئی تھیں۔“ بھلا پونم کے حوالے کے بغیر ہماری دوستی
 ہی کیا تھی۔

”ارے نہیں مدارج ایسی بھی کیا بات۔ بس عورتیں ذرا ایسی ہی ہوتی ہیں۔“ ہم دونوں
 نے خولہ کھولہ دانت نکل دیئے۔

راجبھار نے اپنے اردلی کو کنٹینر سے چائے لانے کا حکم دے دیا اور دوبارہ میری طرف متوجہ
 ہو گیا۔

”آپ بڑے خوش قسمت ہیں جو ایسی خوبصورت لڑکی آپ کی بچی بننے والی ہے۔“

”تھینک یو۔“ سوائے اس کے اور میں کیا کہہ سکتا تھا۔

بشکل میں نے کنگھو کا رخ بدلا ورنہ اس کے تولد و دہلخ پر پونم ہی چھائی ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ میں اسے مطلب کی بات کی طرف لے آیا لیکن اتنی مصوبیت سے کہ اسے بظاہر

یہی احساس ہو رہا تھا کہ وہ میرے استفسار کے بغیر سب کچھ بولنا چلا جا رہا ہے۔

فلائٹ لینٹینٹ راجبھار کا تعلق گر لویئر شاف سے تھا اور وہ ٹیکنیکل شاف کا آفیسر تھا۔ جس

ایک ہفتے سے شروع ہو چکی تھیں لیکن اپنے جوش پر وہ آج پہنچی تھیں کیونکہ اگلے روز ہارات آنے والی تھی۔ یہ لڑکی جس کا نام شوبھا تھا، بھوجی کے ساتھ والے گھر میں رہتی تھی اور ایک کلرک کی بیٹی تھی۔ شوبھا چونکہ پونم کی بچپن کی سہیلی تھی اس لئے اس کی شادی میں بھی پونم کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا تھا۔ اس کے شدید اصرار پر میں بھی آج ہی آگیا تھا ورنہ تو مجھے شور شرابہ سے ”دھشت“ ہوتی تھی۔

گھر پر بھوجی اور ماتامی حسب معمول بحث میں مصروف تھے۔ بھوجی ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے تھے جب انہیں ہندو دھرم پر چوٹ کرنے کا موقع مل سکے اور خوش قسمتی سے انہیں یہ مواقع میسر آتے رہتے تھے، چونکہ میرے مطالبے اور مشاہدے کی حد تک تو میرے علم میں یہی بات آئی تھی کہ ہندو ازم کسی باقاعدہ نظام حیات کا نہیں بلکہ بے شمار اور انتہائی فضول رسومات کے ایک مجموعہ کی شکل ہے۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے کوئی نہ کوئی تہوار اور اس کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی ”پوجا“ دیکھنے کو ملتی تھی۔ شادی بیاہ کی تو اتنی بے شمار اور انہی عجیب و غریب رسمیں دیکھنے کو آتی تھیں کہ بے اختیار ان لوگوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ یہ تمام فضولی رسومات جو ان موقعوں پر انجام پاتی تھیں وہ ہندو دھرم کا باقاعدہ حصہ تھیں اور ان سے دامن بچانے والا ”ہتک“ اور دھرم کا باقی کھانا تھا۔ اگر یہ رسومات صرف معاشرے کا حصہ ہی ہوتیں تو ممکن ہے ”ساج سدھار“ قسم کے پروگراموں کی آڑ لے کر کوئی غریب آدمی ان سے جان چھڑوا سکتا لیکن ”وچارک“ کا لیبل چسپاں ہونے کے بعد کسی کا ان سے بچ لکنا ممکن نہیں تھا۔

ہندو دھرم جہاں بھوجی کی کمزوری تھا وہیں ماتامی کی چڑ اور اب تو بھوجی کے ہاتھ یہ دلچسپ مشغلہ آگیا تھا کہ وہ ایسے کسی نہ کسی موقع کے ختم رہتے، پھر ماتامی کے سامنے چھوٹی سی بات کہہ کر جواب میں ان کی لمبی چوڑی تقریر سن لیتے۔ دونوں بوزحوں کی ایک بات قتل ستائش تھی کی طبیعتوں میں اس قدر بُد المشرقیں رکھنے کے باوجود وہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے اکتائے نہیں تھے۔ کبھی ان کے درمیان تلخ کلامی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ بس یہی ہوتا کہ بھوجی کہتے اور ماتامی کی من بھی لیتے۔

”اچھا اچھا بلا جانے دو۔ جو تم کہتی ہو وہی صبح ہو گا۔“ بھوجی نے مجھے آتے دیکھ کر بحث ختم کرنا چاہی۔

ماتامی بھی میرے ”نمکار“ پر چونکیں اور آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ بھیرنے لگیں۔
”کیا بات ہے صاحبزادے کچھ کمزور دکھائی دے رہے ہو“ بھوجی نے میرا جائزہ لیتے ہوئے

کے ذمے جہازوں کی دیکھ بھل اور مرمت دفیوہ کے فرائض ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا آفس بھی دن دے سے کچھ فاصلے پر ایک ورکشاپ کے کونے میں بنا ہوا تھا۔ اس ورکشاپ میں عموماً جہازوں کو پرواز سے پہلے یا پرواز کے بعد چیکنگ وغیرہ کے مراحل سے گزارنے کے لئے لایا جاتا تھا۔ میں مکمل سلوکی سے رائجکار کے منہ سے جہازوں کی مختلف خصوصیات اگلا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ممکنہ حد تک کے پیش نظر اڑے کے دفاعی انتظامات، مختلف محکموں کی کارکردگی اور اپنے فائبرز کی قوت حملہ اور قوت دفاع سے مجھے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ ”قرباً“ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ میرے بڑھتے ہوئے اشتیاق کے پیش نظر مجھے اپنی ورکشاپ میں اپنے ہمرہ لے جا رہا تھا۔ اس نے اتنی تفصیل سے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ میری جگہ کوئی مبتدی بھی ہوتا تو بھارتی ایئر فورس کے کسی مقابلے کے امتحان میں ضرور بیٹھ جاتا۔

ورکشاپ کیا تھی؟ اچھی خاصی گراؤنڈ ہی کہہ لیجئے۔ جس پر لوہے کی چاروںوں کے شیڈ ڈال کر ان پر خاکی اور سبز رنگ کر کے انہیں کیونللاج کیا گیا تھا۔ ہوائی اڈے میں ”پلیٹ فارم“ کا جدید نظام کارفرما تھا اور دن دے سے اپنے ”ٹیکسٹریک“ پر سز کرتا ہوا ایئر کرافٹ مختلف مراحل سے گزر کر چند منٹ کے اندر اپنے مخصوص ڈیگر میں پہنچ جاتا تھا جس کے بعد مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے درجنوں ایئرمن اس کے مختلف حصوں سے چمٹ کر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔

”قرباً“ آدھ گھنٹے تک میں نے رائجکار کے ساتھ گھوم پھر کر ورکشاپ کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اس اثنا میں سوائے اس کے کہ میں خود ایئر کرافٹ میں داخل نہیں ہوا، شاید ہی کوئی ایسا مرحلہ رہ گیا تھا جس سے میں نہ گزر سکا۔ بلاوقت تو مجھے خود پر رشک آنے لگا تھا لیکن پھر میرا پر تشکر دل بارگاہ ایزدی میں جھک جھک جاتا، جس کی لاشعور کر مفرانیوں کے طفیل میرے راستے کی تمام مشکلات ایک ایک کر کے ہٹ جاتی تھیں اور بظاہر مشکل بلکہ ایک حد تک ناممکن کام میرے لئے آسان اور ممکن بن جاتا تھا۔

رائجکار ڈیوٹی سے آف ہو کر مجھے ساتھ لئے میس میں چلا آیا جہاں دوپہر کا کھانا میں نے اس کے ساتھ کھایا اور اگلے تین چار روز کے بعد اس سے کلب میں ملنے کا وعدہ کر کے واپس آگیا۔ واپسی پر میں سیدھا رانے کوٹ ہی چلا آیا تھا، چونکہ اگلے روز چھٹی تھی۔

اس روز پڑوس میں شادی تھی اور ان لوگوں نے جگہ کی بنگلی کے پیش نظر ہمارا گھر بھی مستعار لے رکھا تھا۔ ہارات کسی دوسرے شہر سے آنے والی تھی۔ شادی کی تقریبات تو پچھلے

کہا۔ لیکن کتا کسی حد تک بجا بھی تھا کیونکہ پچھلے حادثے کے بعد سے میں بھی نصیحت سی محسوس کرنے لگا اور علاج پر بھی خاص توجہ نہیں دی تھی اس لئے کچھ کمزوری باقی رہ گئی تھی۔

”فی الحال تو ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ آئندہ کے لئے البتہ۔۔۔۔۔“ میں نے غصہ اور حوراء ہی چھوڑا دیا۔ سامنے میزبھوں سے اجنبی کی صورت اس طرف آرہی تھی۔ آج اس نے اپنی زلفیں سلپتے سے ہاتھ کر ان میں شادی کی رسم کی مناسبت سے پنبیلی کے پھولوں کا کچرا ٹانگ رکھا تھا۔ سفید پھولوں کے حسن کو اس کی گھیری زلفوں نے چار چاند لگا دیئے تھے۔۔۔۔۔ اپنی نیلی ساڑھی کا پلو سنبھاتی وہ ”دش کنیوں“ کی طرح بچے تھے قدموں سے میری طرف بڑھتی چلی آئی۔ جب اس نے اک لوائے دار ہانڈ سے اپنے دونوں ہاتھ ہاتھ کر ”نستے“ پکارا تو مجھے ہنسل کی وہ جو تھیں یاد آگئیں جو صرف ”ٹانگ پوجا“ کے روز اپنا جین دکھاتی ہیں۔ ہنسل کی سارہ نے اپنی پٹوں کے ابلے مجھ پر بکھیرتے ہوئے میری خیریت دریافت کی اور جب گہری نظروں سے میرا جائزہ لے چکی تو اچانک اس کے خوبصورت چہرے پر تشویش کے آثار ابھرے۔ پلو اور ماتا جی اس اثناء میں روسی میں چلے گئے تھے ”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ”ابھی تک تو تھا لیکن شاید اب وہ نہ سکوں۔“ میں نے سمجیر لہجے میں اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا لیکن پھر سنبھل گیا کیونکہ دروازے سے اس کی سکھیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی نچلے حصے میں مسلمانوں کا قبضہ تھا۔

پونم نے میرے کمرے میں کسی کو داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ میرے آرام میں کسی کی خلل اندازی اسے کب گوارا تھی۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور پونم اندر چلی آئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتے آئی تھی لیکن میں نے معذرت کر دی اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے وہیں لیٹا رہا۔ پونم نے بھی زیادہ ٹکرائ نہ کی ”اسے میری ”علاوت“ کا احترام کرنا آگیا تھا۔ یہ بیوی اور پونم کے اختصار کا اثر تھا یا پھر میری حد سے بڑھتی ہوئی لاپرواہی کہ اب واقعی مجھے اپنا جسم ٹوٹنا محسوس ہو رہا تھا۔ اصل میں میں لہ میاں میں ہی ایک دو دن کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دولتی سے جان چھڑائی تھی جب کہ انہوں نے کم از کم دس روز تک لگا تار دولتی استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

پہلے سر بھاری بھاری سامعوس ہوا، پھر تپش کا احساس ہونے لگا اور قریباً ”ایک گھنٹے کے بعد بخار مجھ پر غالب آگیا۔ آہستہ آہستہ یہ نوبت آئی کہ میری کپٹیاں درد سے پھٹنے لگیں۔ گھر میں مسلمانوں کی چٹل پہل تھی۔ لڑکیوں ڈھولک پر شادی بیاہ کے گیت گارہی تھیں۔ اس سے پہلے پونم کی آواز لاگداز میں نے صبح پوجا کے وقت اس کی بھین کھتا میں دیکھا تھا لیکن اس کی

آواز کا لوج لور رہا جو آج محسوس ہو رہا تھا۔ گیت کے بول اس کے ہونٹوں سے پھسلے تو فحاشی سنکٹا اٹھیں۔ سر لور لے کا حسین عظم بنی وہ اپنی سکھوں کے عین درمیان دلہن کے سامنے ڈھولک کی تھپ پر جدائی کے گیت گارہی تھی۔ نول تو تمام بھارتی لڑکیوں ہی کا سیکل بیچ لور گانے بجلنے پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں، اگر نہیں تو کم از کم معمولی گانا بجاتا انہیں ضرور دیکھنا پڑتا ہے کیونکہ یہ ان کی روز مرہ کی مہلات میں شامل ہے۔

اگر میں پونم تک اپنی بیماری کی خبر پہنچاتا تو اس کے ”بیچ“ سے محروم ہو جانا جس کا مظاہرہ اس نے تھوڑی دیر بعد کرنا تھا۔ میں چپ چاپ اپنے کمرے سے نکلا اور بازار میں پہنچ گیا۔ ایک میڈیکل سٹور سے میں نے اپنی دانست کے مطابق کچھ دوائیں خرید کیں اور اپنے کمرے میں آکر انہیں نگل کر لیٹ گیا۔ دوائیں خاصی تیز لور زوداثر تھیں۔ مجھے کم از کم تھوڑی دیر کے لئے درد سے نجات مل گئی۔

○○○

شام ڈھلتے ہی پونم میرے کمرے میں دوبارہ آئی۔ اس نے ”کلاسیکل بیچ“ کے لئے مخصوص سنگھار کر رکھا تھا۔ میری کوئی بات سنے بغیر وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر نیچے لے آئی اور پہلے سے میرے لئے مخصوص کرسی پر مجھے بٹھا دیا۔ اس کا ”گرو“ جو شکل سے گدھا زیادہ لور گرو کم دکھائی دیتا تھا، اپنی اگر دلوں کے درمیان برآمدین تھا۔ پونم نے مجھے اس کسبت کے پاؤں چھوئے کو کہا جو یہاں کی روایت تھی۔ یہ تو ناممکن تھا کہ میں اس کے ”پاؤں لاگوں“ میں نے ”گرو مہاراج“ کہہ کر اسے نسکار ضرور کر دیا۔ اس سے زیادہ کی امید پونم کو بھی نہیں تھی، وہ بے چاری اسی پر خوش ہو گئی۔

وہاں موجود قریباً ”بسی لوگوں کی آنکھیں پونم پر مگی تھیں۔ بسی کسی وہ رشک لور حسد کی ملی جلی نگاہوں سے مجھے بھی دیکھنے لگتے کیونکہ میں اس کا سنگیتر تھا۔ پونم نے ہندو آداب مغل کے مطابق سب سے پہلے میرے پاؤں چھوئے، پھر بیوی، ماتا بی اور موسی کے۔ اس کے بعد ہاتھ ہاتھ کر ایک خاص لوا سے اپنے جسم کو مل دیا اور اپنے گرد مہاراج سے جھکتے ہوئے اجازت طلب کی۔ ”ہیما“ نے اس کی ایک سکھی نے اس کے پاؤں میں گھونگر ہاتھ۔ پونم نے جھک کر گرد کے پاؤں چھوئے۔ اب وہ بجلیں گرانے کے لئے تیار تھی۔ گرد نے بیچ کا ”توڑا“ کتا شروع کیا اور اس کی دوسری شاگردوں نے طبلے لور ہارمونیم سنبھل لئے۔ پونم نے تیزی سے ہاتھ ہاتھ سے ملے لکھیا لور طبلے کے بول اس کے ٹھنڈوں کی جھنکار میں تپتے لگے۔

”دھمک“ تھا ”بھرت ناٹیم“ اس کا تو مجھے علم نہیں، مجھے تو صرف یہ محسوس ہو رہا تھا

جیسے ساری دھرتی کلوچ لور دم اس میں سا گیا ہو۔ اس کے ہلکیلے بدن کا ایک ایک شاعری کر رہا تھا۔ فضا کو اس کے تباہ ہونے سے اسیر کر لیا تھا۔ سب کا ہنسی اس کے قدموں کی حرکت کے ساتھ ساتھ خود پرواز تھا۔ ہر طرف اک سناٹا، اک سکوت طاری تھا۔ سب لوگ مبسوت اس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ جب وہ ہتھکڑوں کی جھنکار کے ساتھ اپنے جسم کو بل دیتی تو سانس سینوں میں ایک ایک جاتیں۔ قریباً آدھ گھنٹہ تک ماحول اس کے طلسم کا شکار رہا۔ جب رقص ختم ہوا، چند مہینے تک تو یوں لگتا تھا جیسے سب کو سناپ سو گھم گیا ہو۔ پھر سب بے اختیار اسے داندینے لگے۔ اس کے گرد جی نے اٹھ کر اسے ”کیلن“ دیا۔ اس محفل کو تو رات ڈھلنے تک جاری رہتا تھا، میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور بڑھل سا بستر پر گر پڑا۔ میرا جسم بخار میں پھنسنے لگا تھا۔

خاصہ ایک میں اسی کیفیت کا شکار رہا۔ میری آنکھوں کی پتلیوں میں پونم چبھتی رہی۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب پونم میرے لئے کھانے کی ”تھلی“ لے کر آیا۔ میں نے اسے ”تھلی“ لے کر چلے اور چائے لانے کو کھلے کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پونم نے شاید پونم کو بتا دیا تھا، یونکہ اس کے جانے کے مشکل دو تین منٹ کے بعد ہی دروازے پر آہٹ ہوئی اور پونم اندر آگئی۔

”کیا ہوا“ کیا بات ہے آپ نے کھانا.....“ اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اوسے آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔“ وہ میری تکلیف پر تڑپ اٹھی۔

”تم جیسے میسا ہوں تو بخار کبھی۔“ میں نے اس کے مندی لگے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

پونم کی آنکھوں سے میری آنکھیں ٹکرائی اور مجھ پر سحر طاری ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے مجھے خود سے الگ کیا اور میرے جسم کے گرد کبل لپیٹ کر خود کچھ کے بغیر باہر چلی گئی۔ پونم کی واپسی پر کاش اور چائے کے ساتھ ہوئی تھی۔ پر کاش شادی میں شرکت کے لئے آیا تھا، دیسے بھی اگلے روز چھٹی تھی اور چھٹی دالادن وہ رائے کوٹ میں ہی گزارا کرتا تھا۔

”کیا حالت بنا دی ہے ان کی۔“ اس نے بجائے میرے کہنے کے برآوہ راست پونم سے پوچھا۔

”آپ ہی سمجھاؤ نا انیس۔“ پونم کی آنکھوں میں غمی تیرنے لگی۔

”اچھا! میں سمجھاؤں۔“ پر کاش نے کچھ اس انداز سے پونم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ بے اختیار میرے ساتھ اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں پر کاش لور پونم کے ساتھ ان کے ایک محلے دار ڈاکٹر کے گھر جا رہا تھا۔ مجھے وہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ ان کے رنگ میں بھگ ڈالی۔ ڈاکٹر نے جو ڈاکٹر کم اور قصائی زیادہ دکھائی دیتا تھا، لٹا کر مجھے ٹھونک بجا کر دیکھا۔ پھر انڈیوں کی طرح انجکشن بازو میں لگا دیا۔ کچھ کڑی کسلی دو ایلیں اور گولیاں میرے پلے پاندھیں اور نہایت انکساری اور احسان جتلاتے ہوئے کہہ دیا کہ وہ پانی گھر پر مریض نہیں دیکھتا تھا، ہمیں رخصت کر دیا۔

قصائی ڈاکٹر کی دولتی نے اثر دکھایا۔ مجھے خلاصا اتفاق محسوس ہونے لگا۔ پونم لور پر کاش نے شادی میں شرکت کم اور میری تمارداری زیادہ کی تھی۔ پونم تو خصوصاً سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہی۔

برآت آئی، ”ہون“ سلگایا گیا پنڈت نے دو چار اٹے سیدھے اشلوک پڑھے اور وداہ ہو گیا۔ پونم شوبھا سے یوں گلے مل کر روئی جیسے وہ اس کی سگی بہن ہو۔ کتنا فراخ دل تھا اس کا۔۔۔۔۔ جس میں ایک عالم کا درد سمایا تھا۔ اس نے غم دنیا کو غم ذات بنا لیا تھا۔ شوبھا کو رخصت کر کے وہ کچھ کھوٹی کھوٹی سی رہنے لگی۔ اصل میں یہ اس کا بہت بڑا المیہ تھا کہ جس سے وہ محبت کرتی، اسے نوٹ کر چاہنے لگتی تھی لور اس کی محبوب شخصیت خود پونم کے وجود کا حصہ بن کر رہ جاتی تھی۔

بالوچی

پانچ چھ روز کے بعد مجھے پیغام ملا کہ جسونت ایک مشن لے کر مجھے ملنے آرہا ہے۔ جسونت کو میں نے کبھی بھی بھلایا نہیں تھا۔۔۔ اس جیسے دلیر اور جانثار ساتھیوں کے ساتھ کام کرنے کا لطف کچھ میں ہی چل سکتا تھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ اس سے دوبارہ ملاقات ہو۔

موگا کے بس سینڈز پر میں اس کا مختصر قتلہ میں مقررہ وقت سے قریباً ”آدھ گھنٹہ پہلے موگا پہنچ گیا تھا۔ موگا سے میری بہت پیچ پادیں وابستہ تھیں لیکن فی الحال وہی ایک گوشہ عافیت ہمیں اس علاقہ میں میسر تھا ورنہ تو ہر جگہ شکاری کتے ہمارے تعاقب میں تھے۔ اس مرتبہ جس حیثیت میں میں یہاں آیا تھا کسی کی بھل تھی کہ مجھ پر شک کر سکے۔ کیونکہ اب میں ایک معزز ”بھارتی ٹاگر“ تھا۔ وقت مقررہ سے صرف تین چار منٹ قبل میں مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ گیارہ بج چکے تھے لیکن جسونت کا ہم دشمن نظر نہیں آرہا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خدشات سر اٹھنے لگے۔ تربیت کے مطابق جیسے ہی طے شدہ وقت ملاقات پورا ہوا میں نے فوراً اس جگہ سے پرے ہٹ جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس طرح میں کسی محفوظ گوشے میں کھڑا ہو کر مزید کچھ منٹ تک حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ابھی میں بمشکل اپنی جگہ سے گھوما ہی تھا جب اچانک کسی کے ہاتھ کا دھچکا مجھے اپنے کندھے پر محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کا خالص انگریزی لہجے میں فقرہ سنائی دیا۔

”ہائے پرکاش۔۔۔!“

میں یک لخت گھوما اور دوسرے ہی لمحے حیرانگی اور خوشی کے طے بٹے تاثرات لے کر نووارد سے ”ہائے جسونت“ کا نعرہ لگا کر لپٹ گیا۔ اس مرتبہ جسونت کا حلیہ دیکھ کر مجھے بھی اس کے جسونت ہونے پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے وحار یوال سونگ کا بہترین سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ چہرے پر سنہرے فریم کی گہرے شیشوں والی عینک اور سر کے بالوں کا رنگ سیاہ کے بجائے ہلکا سنہری۔ رانچہروں کے مخصوص انداز میں گھنی لور بل کھاتی موٹھیں۔ واڈمی کا ہم دشمن بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ انگلی میں اپنی سونے کی بھاری انگوٹھی اور اسی مناسبت سے ہاتھ پر بندھی

”نقشی“ کروا گیا ہوں۔

دو جاسوس جب مل کر کام کرتے ہیں تو اصل میں وہ اپنی زندگی کے خطرناک ترین مرحلے میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ ایک آدمی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے تئیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے گا اور لٹلٹی بھی ہوئی تو اس کا خیال وہ اسے اکیلے ہی بھگتا پڑے گا لیکن دونوں کے اکٹھے کام کرنے میں صورت حال ذرا نازک قسم کی ہو جاتی ہے۔ ایک ایجنٹ کی معمولی سی لٹلٹی دوسرے کو بھی اس کے ساتھ ہی لے ڈالتی ہے گو کہ ایک دوسرے پر اعتماد کئے بغیر اکٹھے کام کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود دونوں جاسوس اپنے ذاتی تحفظ کے لئے اور اپنی زندگی کے مطابق بھی اس بات کے پابند ہوتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو اپنے Safe House اور اپنے متعلق کسی بھی ایسی بات سے آگاہ نہیں کرتے جو ایک کی گرفتاری کی صورت میں دوسرے کے لئے پریشانی کا باعث بن سکے۔ حتیٰ کہ انہیں ایک دوسرے کو اپنا اصلی نام بتانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ دوران تربیت ہی جاسوس کا مزاج کچھ اس طرح کا بن جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے لاکھ محبت کرنے کے باوجود سوائے اپنی ضرورت کے اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں لیتے۔ اگر غما کر مجھے اپنی گرل فرینڈ کے گھر ”کارنلہ“ کرنے لے جا رہا تھا تو صرف اس لئے کہ اس کے بعد اسے پر وہ سکریں سے ہٹ جاتا تھا۔ ویسے بھی اس نے اپنا تعارف دنگ کمانڈر کی بیٹی سے ایک سیلانی آدمی کے روپ میں کروایا تھا۔ اس کا کوئی خاص ٹھکانہ نہیں تھا۔ آج یہاں کل دہلی۔ اگر دنگ کمانڈر کی سپری اس کی دوست بنی تھی تو صرف اس کی دولت اور خاندانی وجہت کی وجہ سے ”کیونکہ اعلیٰ سوسائٹی کی بھارتی ملاؤں کو ایسے ”پرنس“ کی تلاش رہتی تھی جن کی معیت میں کسی کلب میں بیٹھ کر وہ اپنی بھولیوں میں نہ صرف رعب گانٹھ سکیں بلکہ انہیں جلا کر خاک بھی کر سکیں۔ ظاہر ہے اس مقصد کے لئے اس کی فرینڈز کو غما کر رگمیر سنگھ سے زیادہ اہم شخصیت اور کون سی ملتی۔ مہاراجہ بیوہ تو اس کا دوست بننے سے رہا۔

○○○

تھوڑی دیر بعد ہی ہم واپس لدھیانہ جا رہے تھے جہاں سے ایئر انڈیا کے ایک نوکر فرینڈ شپ جہاز میں بنگالی ایئر ہوسٹس کی مہمانداری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم قریباً شام کے قریب دہلی ایئر پورٹ پر لینڈ کر گئے۔ اس اثناء میں میرے جسم پر بھی ایک قیمتی سوٹ منتقل ہو چکا تھا۔ غما کر تو پاپ سے جی بھلا رہا تھا جب کہ مجھے بالکل خواست ”قیمتی سگار“ کا سارا لینا پڑا۔ ایک ہی سگار نے چاروں طبق روشن کر دیئے تھے۔ میں نے غما کر سے معذرت کرنا چاہی تو اس نے صرف اتنا کہہ کر میری تسلی کر دی۔

قیمتی گھڑی۔ اس کے کسی ریاست کے دلی عہد ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔

اس کا یہ روپ میرے لئے حیران کن نہیں چونکا دینے والا بھی تھا۔ میرے پچھلے تمام اندازے جو اس کے متعلق میں نے لگائے تھے ’غلا ثابت ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے میں اسے ایک ان پڑھ اور محض سنگر نما جاسوس ہی جن کا تھا کیونکہ اس نے پچھلا مشن میرے زیرِ مکن کیا تھا لیکن اب اس کا یہ روپ دیکھ کر مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ یہ تو کوئی بہت ہی اعلیٰ پائے کی چیز ہے۔ کم از کم مجھ سے خلا سینئر ایجنٹ۔ بڑی بے تکلفی سے اس نے میرا حال دریافت کیا اور ہم دونوں اپنی دانست میں موگا کے سب سے بہترین ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

”شریمان جی میرا شبہ نام جسوت نہیں غما کر رگمیر سنگھ ہے۔ جسوت تو عزیز واقارب مجھے پیار سے کہتے ہیں‘ آپ چونکہ میرے بچپن کے دوست ہیں۔ بیکاتیر میں ہم اکٹھے ہی میٹرک تک پڑھے تھے‘ اس کے بعد میں تو یورپ چلا گیا جب کہ آپ انڈیا میں ہی دھکے کھاتے رہے۔ یہ الگ بات کہ آپ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اپنا کاروبار رکھتے ہیں۔“ اس نے ہوٹل میں بیٹھنے ہی اپنا تعارف کروا دیا۔ میں مگر نظر اس کے منہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

”وینڈر نل!“ میرے منہ سے بے اختیار اس کی توصیف میں نکلا۔

”مجھ سے کچھ کم!“ اس نے چائے پیالی میں انڈ ملے ہوئے پوچھا۔

”آپ تو مہاراج میری توقعات سے بھی زیادہ بڑے جاسوس نکلے۔“ جواب میں وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔

غما کر رگمیر سنگھ نے مجھے مشن کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ تیسرے روز اس کی دہلی میں موجود ”گرل فرینڈ“ کے پتا جو دنگ کمانڈر تھے اور ایک اہم نوعیت کی کانفرنس میں شرکت کرنے والے تھے۔ اس کانفرنس سے متعلق اہم فیصلوں کے انہوں نے نوٹس تیار کرنے تھے۔۔۔۔۔ یہ نوٹس غما کر کے خیال کے مطابق (چونکہ پچھلے بننے سے وہ دنگ کمانڈر اس کی زیرِ نگرانی تھا اور غما کر کی اس کے گھر میں آمد و رفت بھی تھی) اس کے بریف کیس میں ہوں گے۔ ہم نے ان کی نقل تیار کرنی تھی‘ وہ بھی اتنی ہوشیاری کے ساتھ کہ دشمن کو اس حرکت کا علم نہ ہونے پائے۔

دوسری صورت میں دشمن ہشیار ہو جاتا اور اپنے تمام منصوبے تبدیل کر دیتا۔ خواہ اس کے لئے اسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ برداشت کرنا پڑتا۔ میں چونکہ دستکریات کی فوٹو کالی کا ”ماہر“ تھا اس کے علاوہ غما کر رگمیر سنگھ کو جو حقیقتاً مجھ سے اعلیٰ درجے کا ایجنٹ تھا‘ میری صلاحیتوں پر اعتماد تھا اور بقول اس کے پچھلا مشن تو صرف ”ٹرائل مشن“ تھا جس میں اس نے مجھے ”پرکھنا“ تھا۔ چونکہ میں اس کے معیار پر پورا اتر چکا ہوں‘ اس لئے اس کی خواہش کے مطابق اس کے ساتھ

ڈرائنگ روم میں ہمارا استقبال مس چکدورتی اور ان کے چہلور ممانے کیا۔
 ”مسٹر کاش لموترہ اینڈ مسٹراونکار چکدورتی ملٹی انکل۔“ ٹھاکر رنجیر سنگھ نے ہم دونوں کا
 تعارف کروایا۔ تھوڑی دیر تک گپ شپ گفتی رہی اس اثنا میں ٹھاکر نور میری نظرس بے چینی
 سے اس بریف کیس کا جائزہ لیتی رہی تھیں جو ایک میز پر بڑے سلیٹے سے رکھا ہوا تھا۔ سز
 چکدورتی کو کلب جانا تھا وہ رخصت ہوئیں تو دنگ کمانڈر صاحب کو بھی ضروری کام یاد آگیا
 کیونکہ وہ ”بچوں“ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ٹھاکر نے اس دوران میں مجھے ٹارگٹ کی
 نشاندہی کر دی تھی۔ جو کچھ تھا اسی بریف کیس میں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے تاملے کھولنے کی
 خصوصی تربیت حاصل تھی لیکن کسی بریف کیس کو کھولنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا خدا کا شکر
 گزار کہ بریف کیس بھارتی تھا اور نمبر سسٹم کے بجائے لاک سسٹم اس میں نصب تھا۔ دنگ
 کمانڈر صاحب کی واپسی کسی بھی وقت متوقع تھی کیونکہ ٹھاکر کے اعزاز میں وہ خصوصی کاک
 ٹیل بیٹے تھے اور دونوں ذرا اکٹھے ہی کرتے تھے۔ آج تو ٹھاکر کا یار غار بھی اس کے ساتھ تھا۔
 اس لئے یہ خوشی دوچند ہو گئی تھی۔ میرے خیال میں وہ انتظامات کا جائزہ لینے ہی گئے تھے جب
 کہ حقیقی مقصد یہ تھا کہ ٹھاکر اور ان کی ساہزادی کو فرصت میرا آ سکے۔

سگار نے میرے گلے کا ستیا پس کر دیا تھا مجھے اپنا مشن آسان اور مزید سگارشوشی مشکل
 دکھائی دے رہی تھی۔ دنگ کمانڈر کے جاتے ہی ٹھاکر نے میرے کندھے کو چھو کر مخصوص اشارہ
 کیا اور خود مس چکدورتی کا ہاتھ تمام کر بڑے مستند انداز میں اپنے پسلو میں لئے باہر نکل گیا۔ میں
 نے اس سے پہلے ہی ٹھیکہ کھاسیکل میوزک سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا تھا جو ٹھاکر کی
 کمزوری تھی۔ اسی لئے وہ اپنی ڈرائنگ کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔

اس کے باہر نکلتے ہی میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ڈرائنگ روم کو دو دروازے آتے تھے
 ایک تو پہلے ہی لاک تھا دوسرا میں نے کر دیا۔ تمام پردوں اور کھڑکیوں کا میں نے چند سیکنڈ ہی
 میں پھرتی سے جائزہ لے لیا۔ اگلے ہی لمحے میرا کام شروع ہو چکا تھا۔ میری تمام حسیات سمٹ کر
 میرے ہاتھوں میں آگئی تھیں۔ ”قربا“ ایک منٹ کے بعد اپنی بے چہرہ دھڑکنوں کے ساتھ میں
 نے بریف کیس کھول لیا۔ ایک فائل جس پر ”ہیپ سیکرٹ“ کے بڑے بڑے حروف چھپ تھے
 میرے سامنے تھی۔ دوسرے ہی لمحے میرا انخاسا کیمرہ حرکت میں آگیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں
 ضرور بے چہرہ تھیں لیکن میرے کام کی تربیت اور تنظیم میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ جب ”قربا“ پانچ
 منٹ کے بعد میں نے فراغت پائی تو بریف کیس کی ہر چیز جوں کی توں اپنی جگہ موجود تھی۔ دنیا کا
 باہر ترین فکر پرنٹ ایکسپرنٹ بھی میری انگلیوں کے نشان وہیں نہیں پاسکتا تھا۔ کام مکمل ہوتے

ہی میں نے دروازے کا لاک کھول دیا۔ ابھی بمشکل سکھ کا لباس سس مکمل ہی ہوا تھا کہ ٹھاکر اور
 اس کی محبوبہ اندر آ گئے۔ اس نے اندر آتے ہی حسب توقع ٹیپ کا سوئچ آف کر دیا۔
 ”یار کبھی ان کو چھٹی بھی دے دیا کرو۔ دفتر گھر گاڑی ہر جگہ بھی تمہارے پیچھے لگے رہے
 ہیں۔“ اس نے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھا چکدورتی سمیت ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔
 ”ایک ہی شوق پالا ہے جیون میں اور وہ بھی آپ کو پسند نہیں۔ واہ ری قسمت۔“ میں نے
 بھی سرد آہ بھری۔

ابھی تک میں ٹارٹل نہیں ہوا تھا۔ خوشی کے مارے واقعی میرے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے
 تھے۔ ہمارا پروگرام کچھ دوسرا تھا۔ ٹھاکر نے رات کے پچھلے پروگرام کو اس کام کے لئے منتخب کیا تھا اور
 بالکل ایک سکیم ہم نے اس سلسلے میں کلنی بحث و تجویس کے بعد مرتب کی تھی۔ جیسے ہی بیٹا
 ایک فون اینڈ کرنے کے لئے اپنے بیڈ روم میں گئی۔ میں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے
 اسے اپنی کھسیابی سے مطلع کیا۔ ٹھاکر نے پھنی پھنی اور حیرت زدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔
 اس کے تو وہم گمن میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی۔ چند لمحے اس کے دل و دماغ میں مکمل
 جاری رہی۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے واضح آثار دیکھے جاسکتے تھے۔ پھر فرط محبت سے بے
 قابو ہو کر اس سے اور تو کچھ نہ بن پڑا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں قلم کر انیس
 چوم لیا۔

”پرکاش تم واقعی ایک عظیم انسان ہو۔“ اس کی جذبات سے بھری آواز سنائی دی۔
 ”آپ سے زیادہ نہیں۔“ میں نے اندر آتی مس چکدورتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس
 سے کہا۔
 ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ خوشی ہمارے انک انک سے پھوٹ رہی تھی۔ مس چکر
 ورتی حیرت سے ہمیں قہقہے لگاتے دیکھتی رہی۔



رات کو ڈنر سے کچھ ہی دیر قبل حسب پروگرام میری طبیعت گھڑنے لگی اور ٹھاکر رنجیر سنگھ
 نے اس اندیشے کے پیش نظر کہ میری موجودگی رنگ میں بھگ نہ ڈال دے مجھے ہونٹ پکڑا دیا۔
 دنگ کمانڈر مسٹراونکار چکدورتی کے دو تین اور دوست اپنی بیگمات کے ساتھ ٹھاکر رنجیر سنگھ کے
 اعزاز میں دی جانے والی پارٹی میں تشریف لے آئے تھے۔ میرے ہونٹ پچنے کے ”قربا“ میں
 منٹ بعد ہمارا تیسرا ساتھی مجھ سے فلم وصول کرنے ٹھاکر نے بھیج دیا تھا۔ مخصوص کوڈز کے
 تھولے اور اپنی شناخت کے بعد میں نے فلم اس کے حوالے کر دی اور سکھ کا سانس لیا۔ اب

مجھے شدت سے نتیجے کا انتظار تھا کیونکہ کیرے۔ کہ دھوکہ دینے کا خطرہ بھی موجود رہتا تھا۔
ٹھاکر کی واپسی گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ اس کے آنے کے چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی،
میں نے بے چینی سے فون اٹھا۔ دوسری طرف سے ہمارے ساتھی نے "او" کے "کہہ کر فون بند
کر دیا۔ میری منت رینگ لائی تھی۔ ٹھاکر نے گرجوٹی سے مجھے گلے لگالیا۔ ہم دونوں کی حالت
قریباً ایک جیسی تھی۔ صبح اس نے مجھے بڑی گرجوٹی سے رخصت کیا۔ جیتا چکروڑی اور ٹھاکر
دونوں ہی مجھے ہوائی اڈے پر رخصت کرنے آئے تھے۔ میں سارے راستے مس چکروڑی کی
مہلن نوازی سے محرومیت کا رونا روتا آیا تھا۔ جب کہ وہ خود ٹھاکر کے بہترین دوست کو "مس"
کرنے پر مجھ سے زیادہ متاسف تھی۔

لدھیانہ کے بجائے میں نے گھر جانا بستر سمجھا اور ہوائی اڈے سے سیدھا رائے کوٹ آ گیا۔
جہاں پونم بے چینی سے میری خنجر تھی۔
"کمل عاتب ہو گئے تھے شریہاں جی؟" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بڑے شکایت
آئیز لہجے میں پوچھا۔

"تم سے بچ کر کمل جا سکتا ہوں؟" میں نے اس کی جھیل جیسی آنکھوں کی گہرائیوں میں
ڈوبتے ہوئے جواب دیا اور پونم کے گلاں پر حیا کی سرفی بانی گئی۔ وہ دوپے کے پلو کو انگلی سے
مروڑتی میری طرف دیکھے بغیر دایں بھاگ گئی۔
بستر پر گرتے ہی میں نیند کی آغوش میں سا گیا۔

○○○

میری آنکھ تدموں کی دھڑدھڑکی آواز سے کھلی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے فوج کا پورا بریگڈ اندر
گھس آیا ہو۔ میرا ذہن فوراً کل کے واقعات کی طرف پلنڈ۔ یہاں ایسی کوئی شے جو موجود
نہیں تھی جو میری شناخت کروا سکے۔ نیچے صحن سے چچ دھار کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔
میں نے بستر سے اٹھنے میں چند ہی سیکنڈ لگائے تھے اور ابھی بمشکل کمر کی تک ہی پہنچا تھا کہ دروازہ
ٹوٹ کر اندر گرا۔ دوسرے ہی لمحے کسی نے مجھے گریبان سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا۔ میں نے
نظر اٹھا کر دیکھا وہ پولیس کا کڑی تھانیدار تھا۔

کمرے میں تین چار۔ ای، اس کے ساتھ ہی گھس آئے تھے۔ مجھے بیڑھیوں سے دھکیلتے
ہوئے وہ صحن میں لے آئے جہاں گھر کے تمام کینوں کے گرد پولیس کے جوان رانٹلیں تانے
کھڑے تھے۔

نیند میری آنکھوں سے یوں اڑی جیسے میں کبھی سویا ہی نہ تھا۔ یہی حال گھر کے دوسرے

لوگوں کا تھا، ان کے چروں پر بھی ہوائیں اڑ رہی تھیں۔ خوف اور دہشت کے مارے ان کے
منہ سے کوئی بات بھی ٹھیک سے نہیں نکل پاتی تھی۔ ہاں ایک بابو جی ایسے ضرور تھے جو بالکل
پر سکون نظر آ رہے تھے۔ میں نہ صرف ذہنی بلکہ جسمانی طور پر بھی حالات سے نمٹنے کے لئے تیار
تھا لیکن صورت حال چونکہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ اس لئے مجھے فی الحال
"خوفزدہ" ہی رہنا تھا۔

چھوٹے سے مکان سے پولیس جو کون کی طرح چنی ہوئی تھی۔ منڈیروں پر بھی گجڑی بردار
سپاہی رانٹلیں تانے نظر آ رہے تھے۔ چند ہی منٹ میں اڑوس پڑوس کے مکانوں سے بھی
روشنیاں باہر جھانکنے لگیں۔ اس طوفان بد تمیزی نے ہمایوں کو بھی جگا دیا تھا۔ یہ الگ بات
کہ ایک دفعہ پولیس کو دیکھ لینے کے بعد دوبارہ اس طرف دیکھنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی تھی۔
"کون ہو تم؟" اسی تھانیدار نے جو مجھے دھکے دیتا ہوا یہاں تک لایا تھا، خاموشی کا سکوت
توڑتے ہوئے بڑے درشت لہجے میں دریافت کیا۔

"میرا بیٹا ہے، مجھ سے بات کرو۔" میری بجائے بابو جی نے کڑکدار آواز سے تھانیدار کو اپنی
طرف مخاطب کیا۔

ابن کالب و لوبہ میرے لئے اچھے کی بات تھی۔ آج تک میں نے انہیں کبھی اس سوز میں
نہیں دیکھا تھا۔ میں خاموش رہا۔

"لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق تمہارا صرف ایک بیٹا ہے۔" تھانیدار کے عقب میں
کھڑے ایک سفید وردی پوش نے خفیہ پولیس کے مخصوص لہجے میں پرکاش پر نظریں جماتے
ہوئے کہا۔

"تمہاری اطلاعات کوئی آسانی سمجھ نہیں ہیں۔ زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں، اپنی آمد
کا مقصد بتاؤ۔" بابو جی کی آواز یقیناً سارے محلے میں گونج رہی ہوگی۔

"سٹرملو پرشلو ہم تمہیں ڈیفنس آف انڈیا روڈز کے تحت گرفتار کر رہے ہیں۔" اسی
تھانیدار نے بحث سے بچنے یا کسی مصلحت کے پیش نظر بابو جی سے کہا۔

"تم بہت بزدل ہو، مجھ سے بوڑھے آدمی کو پکڑنے کے لئے اتنے بنگالے کی کیا ضرورت
تھی؟" بابو جی کے طنز نے تھانیدار کو کانٹ کر رکھ دیا۔

"سٹرملو آپ ہمارے بجائے یہ بحث کورٹ میں کیجئے گا۔" اس نے یہ فقرہ مسکراتے
ہوئے شاید ماحول کی تنگی کو کم کرنے کے لئے کہا تھا۔

اس سے پہلے کہ بابو جی کوئی اور بات کریں۔ اس نے وارنٹ گرفتاری نکال کر انہیں دکھا

یہی مدت تھی کہ شاید ہی زندگی ان سے وفا کرتی۔ سلس کی وہ دور جو عرصے سے انکی ہوئی تھی اسے کوئی بھی جھٹکا چہرے میں توڑ سکتا تھا اور اس کے بعد شاید اس گھرانے کا تباہاں بکھر کر رہ جاتا کہ تکہ ایک بیوی کی ذات ہی تھی جس نے اب تک سب کو ایک محور پر جمع کر رکھا تھا۔ ان کی موجودگی میں کبھی موسیٰ جی کو اپنی بیوی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ گھر کا ہر فرد خود کو محفوظ سمجھتا تھا۔ لیکن اب کیا ہو گا۔۔۔؟

ہجو جی نے اپنی دانت میں تو مجھے اپنی جگہ دے کر بلا اپنے گلے سے اتار دی تھی لیکن میں کیا کر پاؤں گا!! یہی تھا وہ سہل جس نے مجھے فوراً "دُشنا شروع کر دیا۔"

دین کے نزدیک جا کر وہ مڑے۔ پونم پر شاید ان کی نظراب پڑی تھی۔ انہوں نے پونم کو دیکھتے ہی اپنی باتیں پھیلا دیں۔ پونم ”پیو جی“ کہہ کر ان سے لپٹ گئی۔ ہم دونوں سر جھکائے ان کے قریب کھڑے تھے۔ پیو جی نے مجھے اپنے نزدیک بلا کر اپنے ساتھ چنا لیا۔

”بیان تم میں حقائق کا سامنا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ مجھے یہ کتنا تو نہیں چاہیے لیکن اس بات کے امکانات کم ہی نظر آتے ہیں کہ میں تمہیں ”آشیر بلو“ دینے کے لئے تمہارے درمیان موجود رکھوں گا لیکن.....“

ہن کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے تڑپ کر کہا۔
 ”جو جی بھگوئن کے لئے ایسے شہدہ سے نہ نکالے۔ ہم آپ کی رہائی کے لئے آخر تک
 لڑیں گے جو جی۔“ میرے لہجے میں نجانے کیا بات تھی جو جوہی نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ
 سمجھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر ہم تینوں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتے ہوئے دین میں سوار
 ہو گئے۔

مجھے علم تھا کہ پولیس والے بھی یہ نہیں جانتے کہ انہیں کھلے لے جایا جائے گا۔ اس لئے گن سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم پڑھوہ والہں آگئے۔ ماما جی مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ بمشکل میں نے انہیں دلاسہ دے کر چپ کروایا۔ صبح تک ہم سب نچلے کمرے میں بیٹھے رہے۔

○○○

صبح ہوتے ہی محلے داروں کی آمد شروع ہو گئی۔ چوچی کے تعلقات عموماً ”محلے داروں سے خوشگوار“ رہا کرتے تھے۔ قریباً ”بسھی محلے دار“ لن کی گرفتاری پر اظہارِ انوس کر رہے تھے اور لن کی پہلی کے لئے کوششیں نظر آتے تھے۔ جس نے گھر کی فضا کو مزید سبکدوش رکھنا مناسب نہ سمجھا اور پراکش لور پونم کی مدد سے لوگوں کا شکریہ ادا کر کے واپس بھیج دیا۔ —————

۷۰۔ ”ٹھیک ہے لیکن اس بد تمیزی کے لئے تمہیں جواب دی کرنا پڑے گی۔“ انہوں نے پولیس کے سامہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پولیس کی اس طرح آمد نے ہاروں خلعاً خوفناک بنا دیا تھا۔ گھر میں کوئی بھی جاہلی کی اس طرح ڈر لٹکی انداز میں گرفتاری کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ ماما جی کی حالت تو خصوصاً بہت خراب ہو رہی تھی۔ جب انہوں نے جاہلی کی گرفتاری کا سنا تو اچانک صدمے سے لوکڑا گھس لیکن میں نے انہیں مضبوطی سے تھام لیا۔

ہو جی نے انہیں حوصلہ دیا۔ پونم ماما جی کو میرے اشارے پر اندر کمرے میں لے گئی۔ پرکش ابھی تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا اور مسکراتے ہوئے حوصلہ دینا چاہا۔ اس اثناء میں ہابو جی ہمارے نزدیک آ گئے، انہوں نے ہم دونوں کو سینے سے لگا لیا۔

”بہنا تمہارے ہوتے ہوئے مجھے اس بات کا بھی احساس نہیں ہوا کہ میرے بعد یہ گھر سونا رہے گا۔“ انہوں نے ہم سے الگ ہوتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

”ہوجی!“ میں بمشکل اتارے کہ پایا تھلہ میرا گلا رندہ گیلہ ہوجی کے بھرپور اٹھنے نے مجھے خلصا جذبائی کروا تھلہ

”پرکش اے میرے سہن جانے“ انہوں نے اس مرتبہ پرکش کو مطلب کیا جس کی آنکھوں سے آنسو کسی بھی لمحے چھٹک جانے کو تیار تھے۔

”چلئے۔“ انہوں نے پولیس والوں کو مخاطب کیا۔
 باورچی آگے آگے چل دیئے، ان کے پیچھے پیچھے پولیس والوں کے ساتھ میں، پرکش اور پونہ

بھی ایک جلوس کی شکل میں جا رہے تھے۔ پونم ماما کو موسیٰ جی کے حوالے کر کے خود باہر آنے لگی۔ دروازے کے باہر گلی کی ٹکڑی تک ہم پہونی کے ساتھ گئے جہاں پولیس کی ایک دین لن کی فکھر تھی۔ اس اثناء میں انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ لن کی چال میں ایک خودداری، ایک بھرپور احمد جھلکا تھا۔ ایسا بھرپور اعتماد جو کسی عظیم مقصد کے لئے جدوجہد کرنے والوں میں خود بخود دور آتا ہے۔ ونیس آف انڈیا رولز کے تحت حکومت کسی بھی شخص کو اپنی مرضی کے مطابق غیر حینہ مدت تک نظر بند رکھ سکتی تھی اور بھارتی جیلوں میں کئی ایسے نظر بند بھی موجود تھے جو ۱۹۴۳ء سے آج تک نظر بند چلے آ رہے تھے۔ خصوصاً کسی کے مکمل باڑی ثابت جانے کے بعد تو دس پندرہ سال سے پہلے اس کی راہلی کے امکانات بہت کم ہوتے تھے اور یہ آ

”پرکاش بیٹے میرا مقصد اتنا عظیم ہے کہ اس کے سامنے بڑی سے بڑی قربانی بھی بیچ نظر آتی ہے۔ تم میری توقعات سے بڑھ کر ذہین ثابت ہوئے ہو۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ تمہیں بھی اس آگ میں جھونک دوں جس کا ایندھن میں خود بن چکا ہوں، لیکن میرا من گواہی دیتا ہے کہ تم عظیم انقلاب کے لئے بہت کچھ کر سکو گے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس راز کو اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھنا میں تمہیں اپنی کونسل میں بھیج رہا ہوں اور خود مطمئن ہو کر جیل جا رہا ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ”سنگٹن“ کو بھلور کا مرید مہیا کر کے اپنا خلاء پورا ہی نہیں کیا بلکہ تحریک کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔“ ایک فون نمبر انہوں نے مجھے زبانی یاد کرنے کے لئے کہا۔ جس ایک مخصوص شخص کے بولنے پر ایک مخصوص ”کوڈ ورڈ“ دہرانے کے بعد مجھے اگلی ہدایات ملنی تھیں۔ بات مکمل کرنے کے بعد باجوہی نے سلاخوں میں سے دونوں ہاتھ باہر نکال کر میرا ہاتھ مضبوطی سے دباتے ہوئے کہا۔

پر کاش واپس آ گیا تھا۔ ہم دونوں بھی اسے دیکھتے ہی اپنی دنیا میں واپس آ گئے۔
تھانے سے واپس پر ہم نے کیونسٹ پارٹی کے مقامی دفتر کا رخ کیا، جہاں ایک ہنگامی اجلاس
بلوچی کی اچانک ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتاری کے سلسلے میں ہو رہا تھا۔ ہمارا خیر مقدم
بڑی گرمجوشی سے کیا گیا۔

میں اور پرکاش ایک کونے میں ان کے بھاشن سن رہے تھے۔ بلاخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سب لوگ مجھے بیوجی کے والد کی حیثیت سے جانتے تھے۔ بیوجی نے انہیں بتایا تھا کہ میں ان کے ایک انجمنی دوست کا بیٹا ہوں اور اکیلا ہونے کے کارن ان کے ہاں خصل ہو گیا ہوں۔ میں نے ان

”بیٹا وہ راز جو آج تک میں نے تمہاری ماما کو نہیں بتایا تھا، آج تمہیں بتانے لگا ہوں۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ مجھے تم پر اتنا اندھا دوشاں کیوں ہے حالانکہ میری سیاسی تربیت اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ میں کسی پر اس حد تک اعتماد کروں۔ بیٹا وقت بہت کم ہے اور باتیں بہت زیادہ، میں مختصر بات کروں گا۔ یہاں سب کی نظروں میں، میں ایک کمیونسٹ پارٹی کا ورکر ہوں۔ حقیقت میں میرا تعلق کنس بازیوں سے ہے.....“

”تم..... ہمیں یہ کیسے معلوم؟“ باوجہ حیرت سے میری طرف دیکھتے رہ گئے۔
 ”باوجہ مجھے شاکر دیجئے۔۔۔۔ میں نے اس روز آپ کی خفیہ میٹنگ سن لی تھی اور
 جہندہ میں امریکہ عہدے کے اہلکاروں کی موت کا نظارہ بھی کیا تھا۔“

”میں نہ کہتا تھا کہ ضرور تم میں کوئی ایسی چیز ہے جو مجھے تم پر.....“ انہوں نے میری طرف اس مرتبہ تحسین اور حیرت بھری ملی جلی نظروں سے دیکھا۔

”بیوی کا ش میں آپ کو بتا سکتا“ میں کہتا بیٹرا ہوں۔ کسلا بیڈز سے ملنے کے لئے۔۔۔۔۔

میں آپ کا مشن جاری رکھنا چاہتا ہوں بیوی۔“ میرے اٹھو بھرے لہجے نے ان کے چہرے پر

لوگوں سے درخواست کی کہ وہ خولہ خواہ بات کا بھٹو نہ بنائیں۔ ان کے جیسے جلوس سے اور تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا بلکہ پھوجی کی جیل یا تڑا ضرور لپی ہو جائے گی۔ اس طرح تو ممکن ہے وہ تین ماہ بعد واپس گھر لوٹ آئیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہنگامے کرنے کے بجائے ایک کمیٹی ترتیب دے کر اعلیٰ افسران سے ملیں اور پھوجی کی پراسن سرگرمیوں پر گرفتاری کی وجہ دریافت کریں۔ اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھایا جائے تو بہتر ہے۔ ابھی تو کسی کو اس بات کا بھی علم نہیں کہ انہیں کس الزام کے تحت نظر بند کیا گیا ہے۔ میری بات میں انہیں کچھ وزن محسوس ہوا اور تھوڑی سی رد و قد کے بعد وہ لوگ ایک کمیٹی ترتیب دینے پر آمادہ ہو گئے جس نے چندی گڑھ جاکر ہوم سیکرٹری سے ملاقات کرنا تھی۔

پھوجی گو کہ کیونٹ پارٹی کے متقابل لیڈر تھے لیکن رائے کوٹ میں موجود دوسری سیاسی جماعتوں کے ورکر بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ میں نے اس بات کو ان کے حق میں استعمال کرنے کے لئے دوسری جماعتوں کے پیچیدہ پیچیدہ درکوں سے بھی ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے کو خالص انسانی نقطہ نظر سے دیکھیں اور اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کریں۔ میری کوششوں سے بالآخر مختلف جماعتوں کے ملت سرکردہ افراد کی کمیٹی ترتیب پائی جس نے ہوم سیکرٹری اور پولیس جنرل سے مل کر اس معاملے میں ہماری ہر ممکن مدد کا وعدہ کر لیا۔

میں سے مطمئن ہو کر قریباً دوپہر کے وقت ہم گھر پہنچے۔ پرکاش پر میری شخصیت کا یہ پہلو آج پہلی مرتبہ کھلا تھا۔۔۔ میں نے جس چلائی اور ہوشیاری سے کام لے کر یہ سارا معاملہ طے کیا تھا اس پر وہ عیش عیش کر اٹھا۔ جب گھر پہنچ کر غم سے غڑھل مانا اور موسیٰ جی کو اس نے میرے تازہ کارنامے سے آگاہ کیا تو ان کے پڑمروہ چہرے کھل اٹھے اور باری باری مجھے گلے سے لگا کر انہوں نے میری درازی عمر کی دعا مانگی۔ میری فراست پر قریباً سارے ہی گھروالے میرے گردیدہ ہو رہے تھے۔۔۔ سالک رام کو نجلے کیسے پھوجی کی گرفتاری کی اطلاع ملی تھی۔ وہ بھی تین چار گھنٹے کی چھٹی لے کر آگیا تھا۔ جب پرکاش نے اسے صبح سے اب تک کی روداد پڑھا چڑھا کر بیان کی تو وہ بھی حیران رہ گیا۔ تھکنی میسر آتے ہی وہ مجھ سے گویا ہوا۔

”بھیا میں آپ کو اتنا بھی نہیں جانتا جتنا پھوجی جانتے ہیں۔۔۔ جب مجھے ماما جی سے پونم اور آپ کی نسبت کا علم ہوا تو میں خاموش رہا کہ ایک اجنبی کے ہاتھ اپنی بہن کا ہاتھ دے دینا کچھ عجیب سا لگتا ہے لیکن اب مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ بزرگوں کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہوئے۔ آپ ہمارے لئے جو کچھ کر رہے ہیں اس کا بدلہ اس جہنم میں تو شاید ہم میں سے کوئی نہ دے

پائے۔“

”چھوڑو یار تم کس پتھر میں پڑ گئے اپنی نوکری کی سزا۔“ میں نے اس کی تقریر کو درمیان سے اچک لیا اور اسے اپنے مطلب کی طرف لے آیا۔

اس کے بعد تقریباً دس چندہ منٹ کی گھنگو کے دوران سالک رام نے مجھے ہوائی لٹوے پر ہونے والی ایک ایک بات سے آگاہ کر دیا۔ وہ میرے بغیر پوچھے ہی مجھے سب کچھ بتاتا رہا اور میں بظاہر لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی معمولی سے معمولی بات کو بھی ذہن نشین کرتا چلا گیا۔ دراصل بھگی ملاقات کی وجہ سے افواج کی نقل و حرکت اتنی تیزی سے ہو رہی تھی اور مختلف تبدیلیاں اتنی جلدی عمل میں آرہی تھیں کہ آج کی اطلاع دو تین روز پرانی دکھائی پڑتی تھی۔ میرے لئے اپنے ٹارگٹ سے مسلسل ”ہن بج“ رہتا ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بھی تازہ ترین معلومات کی جستجو میں رہتا تھا جن کا ایک بہترین ذریعہ کارپورل سالک رام اور فلائٹ لیفٹیننٹ راجبھار تھے۔ بہت سی ایسی باتیں جنہیں جاننے کے لئے جاسوس کو سر دھڑکی بازی لگانا پڑتی تھی اور جنہیں دوسرے ایجنٹ جان جاکھوں کے بعد جان پاتے تھے وہ مجھے ”ہوٹس“ میں مل جاتی تھیں۔ ممکن ہے کسی حد تک اس بات میں میری تربیت اور چلائی کو مدد مل بھی ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت کے بغیر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟ ایسے مواقع پر میرا دل بے اختیار جذبہ تشکر سے بھر جاتا اور میرا ایمان اس پر اور پختہ ہونے لگتا کہ۔۔۔ اللہ تعالیٰ اپنے راستے پر چلنے والوں کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔

بچہ کو پھوجی سے کچھ زیادہ ہی انس تھا وہ بے چارہ خلاصہ پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے اسے بھی بھلایا اور وعدہ لیا کہ وہ کل سے ضرور سکول جائے گا۔ ماما اور موسیٰ جی اب کلنی مطمئن ہو گئی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے ہمارے ساتھ کھانا کھالیا۔ سالک رام کی چھٹی کا وقت ختم ہو رہا تھا وہ مجھ سے گرجوشتی سے بھنگیر ہو کر چلا گیا۔ میں نے اس سے درخواست کی تھی ایسے خطرناک حالات میں سے زیادہ ”قوم“ کو اس کی ضرورت ہے۔ وہ خولہ خواہ پریشان نہ ہو، میں خود اس سے وقتاً فوقتاً ملتا رہوں گا!

جواب میں وہ قوم کو بڑی نستعلیق قسم کی کھلی سے نواز کر مسکراتا ہوا اس میں سوار ہو گیا جو اسے ہوائی لٹوے تک لے جا رہی تھی۔

شام تک گھروالے قریباً نارمل ہو چکے تھے۔ پرکاش بھی میرے کہنے پر لدھیانہ چلا گیا۔ میں رائے کوٹ ہی رہ گیا کیونکہ مجھے ”رہائی کمیٹی“ کے ساتھ اگلے روز چندی گڑھ جانا تھا۔ پونم کو میں نے اس اثناء میں سب کچھ سمجھا دیا تھا اور اس سے وجہ لے لیا تھا کہ وہ نہ تو خود پریشان نظر

آئے گی اور نہ ہی ماما جی، موسیٰ اور نیو کو غمگین ہونے دے گی۔ رات تک میں نے گھر کی نفسیاتی فضا اتنی بدل دی کہ وہ لوگ باہر کی گرفتاری کو معمول کے واقعات کا ہی ایک حصہ سمجھنے لگے تھے۔

○○○

رات کلنی دیر گئے تک پونم میرے کمرے میں موجود رہی۔ ہم دونوں سب کچھ بھول کر مستقبل کے سنہرے خوابوں کے تسنے ہانے بنے رہے۔ پونم ان خاکوں میں ایسے ایسے حسین رنگ بھرتی تھی کہ ایک دلع تو سب کچھ بھول کر ان پر یقین کرنے کو جی چاہنے لگا تھا لیکن حقائق کی تمنیں مجھے ہر دلع ایسے حسین مواقع پر اپنی دنیا میں واپس لے آتیں اور مجھے یہ سب کچھ کسی اور ہی عالم کا حصہ دکھائی دینے لگتا۔۔۔ پونم، اس کے قرب کی ممک، مستقبل کے سنہرے سپنے، سب کچھ راکھ کی طرح یوں اڑ جاتے جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ میں حقائق کی دنیا میں لوٹ آتا جاں میرے پیارے ملک کی لاکھوں ساتھیوں پونم کا روپ دھار کر مجھے پوچھنے لگتیں کہ میں نے انہیں بھلا تو نہیں دیا؟

جاہلوں اپنے ملک کی آنکھیں ہوتا ہے اور جن کی سرحدوں کی تمکین آنکھیں جاگتی ہوں اس کے کینوں کو ہی سکھ کی نیند سونے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ میں ان کے اس سوال کا جواب اپنے ضمیر سے مانگتا تو ایک طمانیت اور قلبی اطمینان کی کیفیت مجھ پر چھا جاتی۔ میرا ضمیر مطمئن تھا، میں نے انہیں کبھی فراموش نہیں کیا تھا۔۔۔ میرے دیس کے پاس تو میرے وجود کا حصہ بن گئے تھے اور اپنے اہلکار کی حد تک میں ان کی حفاظت کرتا تھا۔ میرے جیتے جی ان پر آنچ آجائے، اس بات کا تصور ہی میرے لئے اندوہناک تھا۔

اگلے روز میں فوراً محلے کے دوسرے چھ سرکردہ افراد کو چندی گڑھ روانہ ہو گئے جہاں دوسرے روز بمشکل ہمیں ہوم سیکرٹری سے ملاقات کا سوتھ ملا۔ کلنی دیر تک سرکھپانے کے بعد اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ اگر باہر کی گرفتاری کے خلاف ایک زیر تفتیش اطلاع، جو اس نے ہمیں بتانے سے انکار کر دیا تھا صحیح ثابت نہ ہوئی تو انہیں تین ماہ کے بعد رہا کر دیا جائے گا لیکن تین ماہ سے پہلے ان کی رہائی ناممکن ہے۔ وہ زیر تفتیش اطلاع کیا تھی، مجھے اس کا علم پہلے ہی تھا لیکن کمیٹی کے دوسرے اراکین نے بالآخر سنٹرل انٹیلی جنس بیورو سے رابطہ قائم کر کے اس کا پتہ لگوا لیا۔۔۔۔

ی۔ آئی۔ بی کے مطابق باہر کی گرفتاری کا تعلق انتہا پسند کمنز باڑیوں سے ہے لیکن اطمینان بخش بات یہ تھی کہ ان کے خلاف ابھی تک کوئی بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی تھی۔ ان نے کسلا ہیڈ ہونے کی وجہ سے وہیں کمیٹی کے اراکین دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک نے ان کی حمایت سے

بالکل انکار کر دیا تھا لیکن جب میں نے انہیں اس بات کا یقین دلایا کہ کسی انٹیلی جنس کے ڈاؤٹ نے محض اپنے نمبر بتانے کے لئے باہر کی گرفتاری کے خلاف جعلی اطلاع دے دی ہے جو تفتیش کے بعد بھی کبھی جی ہاں نہیں ہوگی تو ان کا فصد ٹھنڈا ہوا۔

دو روز کے بعد ہم رائے کوٹ واپس آ گئے اور میں نے گھر والوں کو یقین دلایا کہ باہر کی تین ماہ کے بعد رہا ہو جائیں گے۔ انہیں لدھیانہ جیل میں رکھنے کی ہماری درخواست ہوم سیکرٹری نے منظور کر لی تھی اور پختے میں دو مرتبہ ملاقات کی اجازت بھی مل گئی تھی جو ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔

پہلی مرتبہ مجھے بھارتی اعلیٰ انتظامیہ کو قریب سے دیکھنے کا سوتھ ملا اور مجھے حیرانگی اس بات کی تھی کہ آخر یہ نظام چل رہا ہے تو کیسے؟ انتظامیہ کا کوئی اہل کار ایسا نہیں تھا جس کے متعلق ایماندار ہونے کی شہادت دی جاسکے۔ حتیٰ کہ انٹیلی جنس والوں نے محض دو سو روپے لے کر انتہائی خفیہ فائل کی نقل ہمیں فراہم کر دی تھی۔ تھوڑی تنخواہیں، بے تامل بڑھتی ہوئی منگوائی اور ہر روز گاری نے بھارتی عوام کا اخلاقی دیوالیہ نکل رکھا تھا۔ ان کا ایمان صرف اور صرف پیسہ تھا چاہے وہ کسی بھی طرح حاصل ہو۔

○○○

یہاں سے مطمئن ہو کر اب میں لدھیانہ جا رہا تھا جہاں مجھے باہر کی گرفتاری کے دوستوں سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ میری صلاحیتوں کا امتحان اصل میں اب ہونے والا تھا۔ وہ اس طرح کہ میں کمنز باڑیوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہوں یا وہ میرے ذریعے اپنا اوسیدھا کرتے ہیں۔ لدھیانہ میں، میں فوراً پونم آکھٹے ہی پہنچے تھے۔ وہ تو کالج چلی گئی، جب کہ میں اپنے مشن پر! ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ سے میں نے باہر کی گرفتاری کے لئے رابطہ دل سے گھمبیا۔ دوسری طرف سے فون اٹھانے والے نے ”ہیلو“ کہا اور میں نے اسے وہ نام بتایا جو باہر کی گرفتاری کے لئے مجھے بتایا تھا۔ چند لمحے توقف کرنے کے بعد دوسری طرف سے مجھے ”ہولڈ“ کرنے کے لئے کہا گیا۔ پھر ایک دوسری آواز فون پر سنائی دی۔ دریافت کرنے پر میں نے وہاں بھی وہی نام دہرایا۔ اس مرتبہ جواب صحیح موصول ہوا اور ہم نے اپنے کوڈ الفاظ کا تبادلہ کر لیا۔ فون موصول کرنے والے نے وہ جگہ دریافت کی جہاں سے میں بول رہا تھا اور مجھے اس کے قریب ہی ایک ہوٹل میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ آنے والے نے اپنی ایک مخصوص نشانی بھی بتا دی تھی۔

قریباً بیس منٹ بعد ایک سکھ نوجوان کو میں نے ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے رک کر ایک نظر ہل میں بیٹھنے والوں پر ڈالی اور سیدھا میری میز کی طرف آگیا۔ نشانی کے مطابق

ایک سرخ پھول اس نے نیلے رنگ کے کوٹ میں ٹانگ رکھا تھا اور سر پہ نیلے رنگ کی چڑی
بندھی ہوئی تھی۔

”ست سری اکل!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

جواب میں اس نے بھی ”فتح“ بلائی اور دونوں ایک دوسرے کے آنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے جان بوجھ کر ہل کے ایک کونے میں رکھی میز منتخب کی تھی تاکہ ہم اطمینان سے گفتگو کر سکیں۔ آنے والا جو کہ سکھ تھا لیکن اس کے ساتھ چند منٹ گفتگو کرنے کے بعد مجھے اس کے ”سکھ“ ہونے پر شک گزرنے لگا۔ وہ میری توقعات سے بڑھ کر ذہین ثابت ہوا۔ اقلہ بست نہی تلی گفتگو کر رہا تھا اور غصا سلجھا ہوا چہرہ دکھاتا تھا۔

نوادرو نے اپنا نام منور سنگھ بتایا تھا۔ اس نے قریباً ایک محضہ تک میرا انٹرویو لیا۔ میرا ماضی، محل اور مستقبل کے ارادے، تعلیم، تجربہ، مطالعہ، محبتیں، نفرتیں، کون سا ایسا موضوع تھا جس پر ہم نے بحث نہیں کی تھی۔ بعض دلدھ تو مجھے اس کے سوالات سے الجھن ہونے لگی تھی لیکن جس تنقید سے میرا واسطہ پڑنے والا تھا اس میں شمولیت کے بھی برہم کچھ تھائے تھے جنہیں پورا کرنا ضروری تھا۔

قرباً" آدھ مخمخہ بعد جب ہم الگ ہوئے تو اس نے بڑی گرجوخی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے "کامریڈ" کہہ کر الوداع کیا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مجھ سے مطمئن ہو کر جا رہا ہے۔ میں نے اسے یہ اطلاع دے دی تھی کہ مجھے ہسپتال لوور رائفل چلانا آتا ہے۔ اس نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ اگلے چند روز میں وہ لوگ خود مجھ سے رابطہ قائم کریں گے۔ یہاں سے فراغت پا کر میں پراکش کے پاس آگیا۔ جہاں سردار شاپوری کی گرفتاری کا افسوس کرنے آئی ہوئی تھی۔ دہرے کے بعد پونم بھی آگئی کیونکہ ہم نے اکٹھے ہی دلہن رائے کوٹ جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

○○○

سوائی دیانند کے محبوب ہوتے ہی مقامی اخبارات کو اپنا غبار نکالنے کا موقع مل گیا۔ اس سے پہلے تو کسی کو اس کے خلاف لکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی لیکن اب تمام اخبارات دل کھول کر اس کے خلاف زہر اگل رہے تھے۔ پانچ پانچ سال پہلے ہونے والے پراسرار قتل بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے لیکن اتنی ساکھ سرحال اس کی قائم تھی کہ ابھی تک پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا تھا۔ سوائی جی کی سرگرمیاں اب آشرم تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں اور وہ ”کلے درشن دیدار“ کم ہی دیا کرتے تھے۔

وہ سرد جنگ کے عروج کا زمانہ تھا۔ مشرقی پاکستان میں ہندو کی دیرینہ سازشیں رنگ لائی تھیں اور پورے پاکستان کے معصوم بنگالی ہندو چتر بازیوں کا شکار ہو کر بھارتی سرحدوں کا رخ کر رہے تھے۔ ”ایکنا“ اور ”اسنا“ کا بلبلہ لوڑھ کر خون آشام بھیلروں نے ان کے فنون پر نقب لگائی اور باہمی محبت اور احمد کو جس کی بنیاد پر احمد کی یہ عمارت تعمیر ہوئی تھی، اس میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ جب ایک دوسرے پر احمکی مضبوط بنیادیں ملیں تو محبت کے انہونوں میں جیسے زلزلہ طاری ہو گیا تب انہوں نے یوں آنکھیں پھیریں جیسے وہ کبھی سیاسی نہ تھے، جیسے انہوں نے کبھی ایک دوسرے کو چھانہ تھا۔ قتل لٹک لے ایسا نظارہ کب دیکھا تھا؟ دردمندوں کے کیچھے پھٹے گئے چاہتوں نے رسوائیوں کا روپ دھار لیا۔ اچکے جو چودھری بن بیٹھے تھے انہوں نے مجبوس میں کیزے لٹکانے شروع کر دیئے تھے۔ نقب زلوں نے اس طور سے سیدھے سلاے مامیوں کو درغلیا کہ اللہ! اللہ! ان کے جھوٹ سے ایک عالم نے ہنسا مانی، لیکن وہ مکمل ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ کے محلے پر سرگرم عمل رہے۔ بھارتی حکمرانوں نے اپنی تاحیر و اتالیکیاں فرسودہ پراپیگنڈے کے لئے وقف کر دی تھیں۔ ستم تو یہ تھا کہ شیرے ہی راہبری کے بھی ٹھیکیدار بن گئے تھے۔ یہ صورت حال ایسی تھی کہ سچائی پہ سکتہ طاری ہو گیا۔ حقیقت حال سے باخبر تھے ہی کتنے۔۔۔؟

لور جو تھے ان کی بے باکی کی تھی۔ دشمن نے ایسا کمزور جل پھیلایا تھا کہ وہ بے چارے اپنی صفائی میں ہی الجھے رہے لور زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔

ماساجلی لئیرے مکتی باہنی کے روپ میں مشرقی پاکستان کی مقدس خاک کو پائل کرنے لگے۔ وہ جہلی جہلی گئے دلوں میں زہر گھولنے لگے۔ انہوں نے جھوٹ کو مکر فریب کے ایسے ایسے خوبصورت لبوے پہنا کر بیچ کے روپ میں پیش کیا کہ غالی رائے علمہ بھی گمراہ ہونے لگی۔ بھارتی سفارتی سرگرمیاں رنگ لائیں اور ہمارے سفارت کار منہ ہی دیکھتے رہ گئے۔

اندرون ملک عوام کو پاکستان دشمنی پر آمادہ کرنے کے لئے مابھائی ذہنیت اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لاری تھی اور ہمارے ملک میں جب مختلف نوعیت کے فکری محاذ جلنے کن کن ازموں میں انسانیت کی ہٹا کا راز بتانے میں مصروف تھے۔ عین انہی دنوں بھارت میں مابھائی فنڈوں نے "اکھنڈا" اور "بھارت درش" کی ایسی آگ لگائی کہ "کرانتی دل" وجود میں آگیا جس کے رضاکار اپنا تن من و دھن پاکستان کے خلاف بیج دینے کا دھن دے کر "کرانتی دل" میں آتے تھے۔ وہ اس معاملے پر اپنے خون سے دستخط کرتے تھے۔

بھارتی مسخرا جوئے کمری دن رات کی شوٹنگ کے بعد صرف ایک ماہ میں ”جوئے بنگلہ دیش“ نامی فلم بنا کر لے آیا تھا۔ اس فلم نے وہ کلام کیا جو بھارت کے سارے ذرائع ابلاغ بھی مل کر کبھی نہ

○○○

جب ہم فلم دیکھ کر باہر نکلے تو میرے تن بدن میں آگ لگی تھی۔ فلم سے ہم سیدھے لاری

ہوئی تھیں۔ اس نے یہاں ایک ایسا کارنامہ سرانجام دے رکھا تھا جسے میں ہمیشہ کی طرح سنتے ہی
مٹ مٹ کر اٹھتا تھا۔

جسوت نے اس ٹارگٹ سے متعلق ایک ٹائیک اور ایک سپاہی کو اپنے جہل میں پھنسا رکھا
تھا۔ یہ دونوں ایک جگہ جوا کھیلنے ہوئے جسوت کی نظروں میں آ گئے تھے اور ایسے لوگوں کا
وہ پہلے ہی سے متلاشی تھا۔ پہلے ٹائیک اس کے ہتھے چڑھا۔

کسی نہ کسی طرح جسوت نے اس ٹھکانے تک رسائی بھی حاصل کر لی تھی جہاں اس کی
اطلاعات کے مطابق چھوٹے ریک کے فوجی اپنی رم کی بوتلیں جو انہیں خاصے کم زرخوں پر
یونٹ سے مل جاتی تھیں، زیادہ قیمت دے کر فروخت کیا کرتے تھے۔ یہ الگ بات کہ اس طرح
حاصل ہونے والی آمدن کو وہ اسی ڈیرے پر جوئے کی بیعت چڑھا دیا کرتے تھے۔ یہ ڈیرہ اصل
میں شراب کا ایک ٹھیکہ تھا جو باقاعدہ اجازت نامے کے تحت قائم ہوا تھا۔ ایسے ٹھیکے پنجاب کے
وہلوں اور شہروں میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں، جہاں سرکاری اہتمام سے شراب خانہ خراب
اڑلی جاتی ہے اور اس کی حدود۔۔۔۔۔ جو عموماً چائے کے ایک سٹل جتنی بھی نہیں ہوتی کے
اندروں غل خپاڑہ مچانے کی کھلی چھٹی ہے۔ زیادہ تعداد ایسے ٹھیکوں کی ہے جہاں شراب سے متعلقہ
دوسرے لوازمات کا بھی بندوبست موجود ہوتا ہے تاکہ یہاں آنے والوں کو کسی قسم کی تشنگی کا
احساس پائی نہ رہے۔

شراب کے ان ٹھیکوں پر بظاہر تو وہی شراب کی بوتلیں بھی دکھائی دیتی ہیں جو بھارتی
لیبارٹریوں کی تیار کردہ ہوتی ہیں لیکن اندر خانے زیادہ تر مٹھیا قسم کی اور دھاتی علاقوں میں غیر
قانونی طور پر نکال گئی شراب ہی بکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے روز بھارت کے اخبارات میں
”ڈہرلی شراب“ پینے سے واقع ہونے والی کسی نہ کسی ”مرتبہ“ کا ذکر پڑھنے کو مل جاتا ہے۔

جسوت کسی ایسے ٹھیکے کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا جہاں اس کے ٹارگٹ سے مستند لوگوں
کا آنا جانا رہا ہو۔ یہیں اس کی جہاندیدہ نظروں نے ٹائیک اندر موہن کو آڑا تھا جو رم کی بوتلیں
فروخت کرنے سے حاصل شدہ آمدنی کو جوئے کی نذر کر کے اب لپٹائی ہوئی نظروں سے دوسروں
کے بھرے ہوئے گلاس دیکھ رہا تھا۔ ایسے مواقع پر فوجی لوگ وردی پن کر آنے سے تو رہے
لیکن جاسوس کی تربیت میں پسلا مرحلہ اسے اپنے پیٹے سے متعلق افرلو کی جان پھپھن سے متعلق
ہوتا ہے۔ اندر موہن کو اس کی وضع قطع اور چال و چل سے ہی جسوت نے پہچانا تھا۔

○○○

یہ سپر کی شام تھی۔۔۔ اگلے روز چونکہ اندر موہن کو چھٹی تھی اس لئے وہ جسوت کے

ساتھ جگڑاؤں سے باہر ایک ویران سی جگہ پر جہاں کسی محلے نے تیزی سے بڑھتی ہوئی جن
سکھیا کے پیش نظر مستقبل کے لئے سرمایہ کاری کرتے ہوئے دس پندرہ کوارٹر بنا ڈالے تھے، چلا
آیا تھا۔ ٹائیک اندر موہن خود بھی کھل آیا تھا یہ تو اس بوتل کا مکمل تھا جسے جسوت نے جہل میں
دبا رکھا تھا۔

رات اندر موہن نے جسوت کے ساتھ ہی گزاری اور صبح تک وہ بچے یار بن چکے تھے
کیونکہ جسوت بھی ”انٹلق“ سے اندر موہن کی طرح ہمار کا ہی رہنے والا تھا۔ لور یہ بھی ”انٹلق“
ہی تھا کہ دونوں کی گوت بھی ایک ہی تھی۔ کئی دور جا کر ان کے بزرگوں کا سلسلہ بھی آپس میں
مل جاتا تھا۔ جسوت نے اسے بتایا تھا کہ وہ مزدوری کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت ”دھندا“ بھی کر
لیتا ہے یعنی کبھی کبھی دھاتوں سے شراب وغیرہ لاکر یہاں فروخت کر دیتا ہے۔ اس لئے تو وہ اتنے
ٹھٹ سے زندگی گزار رہا ہے۔

ٹائیک اندر موہن ساری رات شراب پیتا رہا اور اپنی نوکری پر لعنت بھیجتا رہا۔ چونکہ وہ
دونوں ہم ذات تھے اور ایک ہی صوبے کے ایک ہی ضلع سے تعلق رکھتے تھے اس لئے جاتے
سے اس کی جیب میں جسوت نے زبردستی سو روپے بھی ڈال دیئے تھے جو اگلے ہی روز
اندر موہن نے جوئے کی نذر کر دیئے تھے۔ ٹائیک اندر موہن اپنے ایک ضلع والی ساتھی کو بھی جو
اس کی یونٹ کا سپاہی تھا، جسوت کے پاس لے آیا۔ اب تینوں مل کر رنگ رلیاں مٹاتے تھے۔
جب میری ملاقات اس نے ٹائیک اندر موہن اور سپاہی نیک رام سے کر لی تو دونوں اس کے
قرباً ”دو ہزار روپے کے مقروض تھے اور اس کے سامنے اس کے زر خرید غلام نظر آتے تھے۔

”میرا بھائی ہے رشتے کا۔۔۔۔۔ سرور کو پنجاب میں نبھانے کیا دکھائی دیوے ہے جو سب
اوجھری بھاگے چلے آ رہے ہیں۔“ اس نے دونوں سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

دونوں چیلے جو شراب کے نشے میں ڈگمگا رہے تھے مجھے جسوت کا بھائی جان کر میرے پاؤں
میں بچے جارہے تھے۔ بمشکل میں نے انہیں خود سے الگ کیا ورنہ وہ تو مجھ پر ”قرہن“ ہونے کو
تے نظر آتے تھے۔

”بڑے سدھائے ہوئے ہیں۔“ میں نے اپنی مخصوص ذہن میں جسوت سے ہنستے ہوئے
کہا۔

”راہے بھگوان کی۔“ اس نے ہاتھ باندھتے ہوئے اٹھاری سے جھک کر کہا۔ مجھے غیر ہنس
زبان بولنے دیکھ کر دونوں گدھوں نے نشے کی رنگ میں مجھے ”لوٹا“ سمجھ لیا اور میرے سامنے
ہاتھ رکھنے لگے۔ ہنستے ہنستے میں بے چارہ ہوا جاتا تھا، بمشکل سمجھا بھا کر جسوت انہیں اصلی

حالت میں دابھس لایا۔ وہ کبعت تو کبھی نہ اٹھتے لیکن جسوت نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ”ایسور
فیسے ہو جائیں گے۔“

”مگر دبی آج ہی کیوں نہ قسمت آزمائی کریں۔“ میں نے جسوت کو رائے پیش کی۔

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا، پھر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ”او کے“
کے مختصر سے الفاظ اس کے ہونٹوں پر تھرکے۔

ہم دونوں ان گدھوں کو وہیں چھوڑ کر کوائر سے باہر آ گئے تھے جہاں دور دور تک کسی شے
کا ہم روشن دکھائی نہ دے رہا تھا۔ البتہ کبھی کبھی سڑک پر سے کوئی لاری ضرور گزر جاتی تھی۔

ٹائیک اندر موہن کی کوائر گھ ڈیوٹی تھی۔ اسے سزایافتہ فوجیوں کے سیلوں پر سپرو وینا ہوتا تھا
اور رات کو آٹھ بجے اس کی ڈیوٹی شروع ہوتی تھی۔ اس دوران میں اور جسوت نے دونوں کی
مدد سے اس ٹائیلین ہیڈ کوائر کا اپنے ذہن کی مدد سے نقشہ تیار کر لیا تھا۔ اندازاً ”اسے معلوم تھا
کہ سزایافتہ فوجیوں کے سیل کس طرف ہوں گے۔ سوائے اس کے کہ جسوت کو آج رات کے
”پاس درڈ“ کا علم تھا اور ہم نے انڈین فوج کی دریاں زیب تن کر لی تھیں اور کوئی زاہد راہ
ہمارے پاس نہیں تھا۔

یہ آگ میں جہن بوجھ کر چھلانگ لگانے والی بات تھی لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا
تھا۔۔۔؟ اپنی جان سے ہولی کھیلنے کی اجازت کسی جاسوس کو نہیں دی جاتی لیکن ہمارا تعلق کسی
لفذ ہی ملک سے نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے بے سروسللی کے عالم میں بھی اللہ کی خصوصی
مدد سے وہ کام کر دکھائے تھے جو شاید دنیا کی بڑی بڑی جاسوسی ایجنسیوں کے ایجنٹ جدید ترین
آلات جاسوسی سے لیس ہو کر بھی انجام نہ دے پائیں۔

○○○

دونوں فوجیوں کے گھاسوں میں جسوت نے بے ہوشی طاری کرنے والا سٹوف اتنی پھرتی
سے نفل کیا کہ مجھے بھی کلاں کلن خبر نہ ہو پائی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ دونوں خرانے
لینے لگے۔ ٹائیک کی وردی جسوت نے پن لی اور سپاہی کی میں نے۔ ٹائیلین ہیڈ کوائر پر ہم قریباً
آٹھ بجے ہی پہنچے تھے کیونکہ اس کے بعد داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ جن لوگوں کی دریاں ہم
نے پن رکھی تھیں انہوں نے اسلحہ اپنے پونٹ سے حاصل کرنا تھا لیکن ہم اتنے نئے بھی نہیں
تھے۔ اپنے آئوٹک پستول جن کی اہمیت اس ماحول میں نہ ہونے کے برابر تھی، ہم نے لباسوں
میں چھپا رکھے تھے۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چلتے ہوئے ان فوجیوں کے ساتھ

اندر داخل ہو گئے جو ہماری طرح بڑی جلدی میں دکھائی دیتے تھے۔ ٹائیلین ہیڈ کوائر کے گیت پر
کھڑے ملٹری پولیس کے مسلح گارڈز نے ایک سرسری سی نظر ہم پر بھی ڈالی۔۔۔۔۔ اس ہیڈ کوائر
میں بھات بھات کے لوگ اکٹھے کئے گئے تھے کیونکہ یہاں پر کچھ خاص نوعیت کی مشقیں کی جا
رہی تھیں۔ جس پونٹ کی دریاں ہم نے پن رکھی تھیں اس کے جوان بھی یہاں دکھائی دے
رہے تھے لیکن ہم نے اس بات کی خصوصی احتیاط برتی کہ ہم ان کے نزدیک تک نہ پہنچیں۔

مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ہم ایک نسبتاً ”دیرین علاقے کی طرف جہاں
درختوں کی بہتات نظر آ رہی تھی“ گھوم گئے۔ یہاں اکا دکا فوجی ہی نظر آ رہے تھے کیونکہ یہ
ڈیوٹیوں کی تبدیلیوں کا وقت تھا۔ اس لئے ہر کوئی افزائش میں دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارا رخ
درختوں کے اس جھنڈ کے پیچھے بنے دفاتر کی طرف تھا جہاں مختلف نوعیت کی فائلیں رکھی تھیں۔
یہ دفاتر تین بجے کے بعد بند ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد اس طرف کسی کا آنا جانا بھی کم ہو جاتا
تھا۔

یہاں تک پہنچنے کے لئے ہمیں دو جگہ پوچھنے پر ”پاس درڈ“ جانا پڑا تھا۔ بنگالی صورت حال
کی وجہ سے لائٹ آف تھی، صرف سرچ لائٹ کبھی کبھی روشن کر کے کھلتی جا رہی تھی۔ اس
کے علاوہ بھی اس ہیڈ کوائر کے چاروں اطراف ”سرجنگ ٹلور“ بنے ہوئے تھے لیکن ہم نے وہ
سب کچھ بھلا دیا تھا۔ قریباً دو ڈھائی گھنٹے یہاں چپے رہے۔

یہ دفاتر ایک بلاک کی صورت میں بنے ہوئے تھے۔ پھر درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ہم ان
کے نزدیک پہنچ گئے اور اب جلد از جلد کچھ کر گزرنے کے لئے بے تپ ہو رہے تھے۔ اس اثناء
میں کسی آمد، خطرے کے پیش نظر فرار ہونے کے لئے راستے کا بھی انتخاب کر لیا تھا۔ رات کے
وقت اپنے علاقے عام فوجیوں کے لئے بھی ممنوع ہوتے ہیں اور بغیر ڈیوٹی کے ان جگہوں کے
نزدیک کسی کا پھنکنا بھی ممنوع ہوتا ہے۔

ہم دونوں دبے پاؤں۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اپنے ہدف
سے چند گز کے فاصلے پر اچانک ہم دونوں زمین بوس ہو گئے کیونکہ ایک سائے کو ہم نے دفاتر
والے بلاک کے ایک کونے سے نمودار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میرا ہاتھ پھرتی سے اپنی جیب کی طرف
گیا اور دوسرے ہی لمحے نئے سے آئوٹک پستول پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔۔۔۔۔ میں سائے
پر ٹھنکی ہانڈے نظریں جمائے لینا تھا۔ جسوت کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

لینے لینے اس نے ایک مخصوص سٹل دیا جس کا مطلب تھا کہ میں آگے نکلوں اور وہیں
موجود پھرے دار کو دھوکے سے اپنی طرف متوجہ کروں۔ اس اثناء میں جسوت کو اپنا کام کر گزرتا

○○○

جسوت نے قربان دس منٹ اندر لگائے تھے۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ اس کی مدد کے لئے اندر جا کر مجھے پھر ایک تملے پر زور آزمائی کرنا پڑی۔ جب دس منٹ کے بعد جسوت باہر نکلا تو کھمبائی اس کے چہرے سے جھٹک رہی تھی۔

چند سیکنڈ۔۔۔۔۔' بمشکل ہی وہ اپنی جگہ ٹھہرا ہو سکا لیکن ہمارے لئے وہ چند لمحوں کی مدت تھی۔ دیکھا کہ اس نے اپنے معمول کی رفتار سے میری طرف بڑھنا شروع کیا۔ اپنے قدم پر لٹکی آؤٹک رائل اس نے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے قہار لی تھی۔ کمر تیزی کی حالت میں نہیں۔۔۔۔۔ شاید ابھی تک اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا اور جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا، ایک وقت دو اطراف سے اس کی قیامت ٹوٹی۔۔۔۔۔ جسوقت جو سر کرتا

اصل میں اب وہ خطرناک مرحلہ آیا تھا جس سے بخیریت گزرتے ہماری کلاسیاں کا دار و مدار تھا۔۔۔۔۔ ہینڈ کوارٹر کے چاروں اطراف دیوار بنی ہوئی تھی جس پر خاردار تار لگے ہوئے تھے اور رات کو آٹھ بجے کے بعد ان میں بجلی کی رد و دوڑنے لگتی تھی۔ اس کے علاوہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لوہے کے اونچے پلور بنائے گئے تھے جن پر مشین گنیں نصب تھیں۔ ان کو کچھ اس انداز سے نصب کیا گیا تھا کہ اشارہ ملنے پر ہینڈ کوارٹر کے کسی بھی حصے میں ان سے فائرنگ کی جاسکتی تھی اور چند منٹ کے اندر وہ حملہ آوروں کو بھون کر رکھ سکتی تھی۔

تین بجے پریدار بدلتے تھے۔

۔۔۔۔۔ ہم نے اسی وقت کو یہاں سے نکلنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ دونوں گدھے جنہیں ہم جسونت کے کوارٹر میں چھوڑ آئے تھے۔ ان کے چوہیں گھٹنے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس وقت بمشکل رات کے بارہ بجے تھے اور ایسے اعصاب شکن حالات میں صبح تین بجے تک یہاں چھپے رہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہم دفاتر سے پرے ہٹ گئے تھے۔ جاتے جاتے ایک مرتبہ پھر ہم نے اپنے نئے شکار کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ گمری خند سو رہا تھا۔۔۔۔۔

اس کی رائفل جسونت کے کندھے پر لٹکی تھی۔ وہاں سے چرائے گئے کلمات کچھ تو میں نے اپنی جیبوں میں ٹھونس لئے تھے اور کچھ جسونت کے پاس تھے۔ ہم اب درختوں کے جھنڈ تک پہنچ چکے تھے اور وہیں بیٹھے وقت گزار رہے تھے۔ دونوں ہی ایک درخت کی مخالف سمت میں منہ کئے بیٹھے تھے۔ رائفل جسونت کی گود میں دھری تھی اور پستول میری جھولی میں پڑا تھا۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی اکتا جاتے تو پلٹ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے اس کے علاوہ وقت گزاری کا اور کوئی بلانہ ہمیں میسر نہ تھا۔

○○○

جیسے ہی ہینڈ کوارٹر میں گلی ٹھننی پر تین باد ضرب پڑی۔ ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ اٹھے۔ منصوبے کے مطابق اپنے ”شکار“ کی رائفل جسونت نے کندھے سے نکال رکھی تھی اور اس کا لمبا فوجی کوٹ میں نے پہن رکھا تھا۔ میں نے کوٹ کے کالر کھڑے کر لیے تھے۔ یہ کوٹ ہرگز مجھے فٹ نہیں تھا لیکن کسی نہ کسی طرح گزارہ تو کرنا ہی تھا۔

اس وقت گیت تک پہنچنے والے شاید ہم دونوں سب سے پہلے انسان تھے۔ مین گیت کے سامنے لگا ہیرو جھکا ہوا تھا۔ ایک کونے پر لکڑی سے بنی چپک پوسٹ کے باہر دو سپاہی کندھوں سے رائفلیں نکلانے کھڑے تھے۔ ہیرو کے آگے ایک فوجی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ ہمیں صرف دو یا تین منٹ میں جو کچھ بھی ہم چاہتے تھے کر گزرتا تھا۔ اس کے بعد ہمارے لئے کوئی چانس باقی

نہیں بچتا تھا کیونکہ کسی لمحے گیت پر نئے سپرے داروں کی آمد متوقع تھی۔ میں آگے تھا اور جسونت میرے پیچھے۔ ہم دونوں نے چاہا کہ تیزی سے باہر نکل جائیں۔

”اے ٹھہرو!“ اچانک سنسنی کی آواز۔ نہ میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔

”بلاخرہ پھنس ہی گئے۔“ یہ سنا تو میں واپس مڑا تو میرے کانوں میں جسونت کی آواز گونجی۔

”ہینڈ زاپ!“ اس نے اپنی رائفل دونوں کی طرف تین رکھی تھی۔

نورا ”میرا پستول بھی جیب سے نکل آیا۔ دونوں نے ہنر داکر ہاتھ اٹھا دیئے۔

”موو (Move)“ جسونت نے تھکسانہ لہجے میں رائفل کی ٹلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں کہے کہے اپنی جگہ سے آگے بڑھ گئے۔

ان کے تو دم دنگل میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ پاکستانی کلہوڑو یہاں بھی آجائیں گے۔

”دوسری طرف گھومو۔“ جسونت کا اگلا حکم سننے ہی انہوں نے اپنے منہ ہاتھ لوہر کئے ہوئے اس لکڑی کی بنی ہوئی پوسٹ کی طرف کر لئے۔ ہم نے انہیں ایک لمحے کی سہولت بھی نہیں دی تھی۔ جسونت نے اپنی رائفل اور میں نے پستول کا دست آزمایا۔ ایک ہی ضرب سے وہ تینوں درختوں کی طرح کٹ کر زمین پر آ رہے۔ ہم دونوں تیزی سے موٹر سائیکل کی طرف لپکے اور موٹر سائیکل کو بھگانا شروع کر دیا۔

۔۔۔۔۔ چند گز بھاگنے کے بعد ہی ہم اسے شارٹ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں چھلانگ لگا کر جسونت کے پیچھے بیٹھ گیا۔ رائفل ابھی تک اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی لیکن ہمارے لئے فی الحال کار آمد نہیں تھی۔ میں نے اپنا پستول البتہ فائرنگ پوزیشن میں ضرور کر لیا تھا۔

ابھی بمشکل جسونت نے پہلا ہی گھیر بولا تھا کہ سامنے سے دو فوجی آتے دکھائی دیئے۔ یہ لوگ عتابا پرانے سپرید اوروں کی جگہ لینے آئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے پیچھے گولی چلنے کی آواز آئی۔ چپک پوسٹ پر پہنچنے والوں نے بے ہوش سپرے داروں کو دیکھتے ہی ہم پر گولی چلا دی تھی۔ اس سے پہلے کہ سامنے سے آنے والے لوگ صورت حال سمجھ پائیں جسونت نے موٹر سائیکل کا رخ ان کی طرف موڑ دیا اور جب تک وہ سنبھل کر دوبارہ فائرنگ کی پوزیشن میں آتے ہم ان کی دسترس سے دور جا چکے تھے۔

ہمارے پیچھے اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی لیکن جسونت تمام حالات سے لاپرواہ انتہائی خطرناک ڈرائیونگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے موٹر سائیکل کو بھاگنے لے جا رہا تھا۔ اس وقت ہم

دونوں واقعی کسی انگریزی فلم کے کردار دکھائی دے رہے تھے۔ جب ہم کی سڑک سے اتر کر ایک کچے راستے پر مڑے جو ایسی نازک صورت حال کے پیش نظر ہم نے پہلے ہی منتخب کر رکھا تھا تو لمٹری جیپ پر لگے سائرن کی مخصوص آواز ہمیں دور سے آتی سنائی دینے لگی تھی۔

یہ کچا راستہ نہر پر جاتا تھا اور کسی کے گمان میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ہم نہر میں ڈوبنے کے لئے چلے آئیں گے۔ اس لئے کسی کے اس طرف آنے کے امکانات کم ہی دکھائی دینے تھے۔ موٹر سائیکل پر جسونت کو مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ اس نے رفتار اب خاصی کم کر دی تھی اور ہم کھیتوں کے پتھوں بچ چلے جا رہے تھے۔ کچھڑ میں موٹر سائیکل چلانا کوئی غلطی کا کھیل نہیں تھا لیکن جسونت کی مہارت ہر جگہ کام آئی اور ہم نہر کے کنارے تک جا پہنچے۔ یہاں موٹر سائیکل کھڑی کر کے مجھ سے کوئی بات کئے بغیر بندروں کی طرح بھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک درخت پر جا چڑھا۔ غالباً اس نے بھی تعاقب میں آنے والی جیپ کی آواز سن لی تھی، ہم سڑک سے قریباً دو ڈھائی فرلانگ دور تھے۔

قریباً دو منٹ کے بعد ہی وہ نیچے اترا اور شدت جذبہ سے بے قابو ہو کر مجھ سے پلٹ گیا۔

”یہ بلا تو ملی۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا، ہمیں علم تھا کہ صرف چند منٹ کی ملت لی تھی کیونکہ یہ جیپ جو ہمارے پیچھے آئی تھی وہ تو ہنگامی طور پر تیار شدہ جیپ تھی، جو اچانک پیش آنے والی صورت حال سے نمٹنے کے لئے ”سینڈ ہائی“ رہتی تھی۔ اس کے پیچھے یقیناً اور لوگ بھی آئیں گے جو اس علاقے میں فوراً بکھر کر ہمیں ڈھونڈنا شروع کر دیں گے۔ ہم موٹر سائیکل دھکیلتے ہوئے نہر کے کنارے تک آئے۔ پھر بھارتی فوج کی منحوس وردی سے نجات حاصل کی جس کے نیچے ہم نے اپنے پرائیویٹ کپڑے پہن رکھے تھے۔

جسونت کے کپڑوں میں ٹانگوں کا ایک تھیلہ برآمد ہوا، ہم نے بڑی بھرتی سے چوری کرنا کلفتات اور اپنے کپڑے جوتیوں سمیت اس میں ٹھونس دیئے۔ تھیلے کا منہ ٹائیلوں کی ایک باریک ڈوری سے کس کر باندھ دیا اور اسی ڈوری کی مدد سے میں نے یہ تھیلہ اپنی چین پر باندھ لیا۔ بھارتی فوجی دروایاں ایک گھنٹری کی صورت میں موٹر سائیکل سے باندھیں اور انہیں موٹر سائیکل سمیت نہر میں غرق کر دیا۔

موٹر سائیکل کے گرنے سے چھتا کے کی ایک آواز گونجی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد

ہم دونوں بھی نہر میں کود گئے اور پانی کے ساتھ بہتے دوسرے کنارے پر بہت دور نکل گئے۔ قریباً بیس پچیس منٹ کے بعد جب ہم دوسرے کنارے پر باہر نکلے تو محسوس آیا ہی نہیں حقیقت میں ہماری قلبی جم جچی تھی۔ گیلے زیر جاموں سے نجات حاصل کی اور تھیلے میں سے کپڑے نکل کر پہن لئے۔ اپنے جسم کو گرم کرنے کے لئے ہم دونوں نے قریباً پانچ منٹ تک الٹی سیدھی درز میں کس۔

اس علاقے کے لئے ہم بالکل اجنبی تھے اور اپنی تربیت کے مطابق اب ہمیں الگ الگ سمتوں میں سڑک کرنا چاہیے تھا۔ ہم نے موت کی شاہراہ پر ایک دوسرے کے سنگ سنگ سڑک کیا تھا اب زندگی کی نوید ملی تھی تو کیسے جدا ہوتے۔۔۔؟ یہاں بھی وہی ظالم پل کر گیا۔ قریباً ایک میل تک سڑک کرنے کے بعد جب ہمیں ارد گرد کے کھیتوں میں لوگوں کی آمدورفت دکھائی دینے لگی تو وہ ایک جگہ رک گیا۔

یہ جدا ہونے کا مشکل تھا۔ اتنے پیارے اور ہلور ساتھی سے جدا ہونے کو ہی نہیں چاہتا تھا۔ ”سینئر ہونا! یہاں بھی نمبر لے جلو گے۔“ میں نے قریباً دندھے ہوئے گلے سے کہا۔ جسونت خاموش رہا۔ شاید اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر بے اختیار آگے بڑھ کر وہ مجھ سے پلٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی جھللا رہے تھے۔ الگ ہوتے ہوئے میرے دونوں کندھے اس نے تھپتھپائے اور ”خدا حافظ“ کہہ کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

ہم دونوں مختلف سمتوں میں چل دیئے۔ کٹنی دیر بعد جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرا دوست کھیتوں کے وسیع سلسلے میں غائب ہو چکا تھا۔

○○○

بڑے بوجھل دل سے میں اس سے الگ ہوا تھا لیکن جلد ہی ٹاربل ہو گیا۔ سورج نکل رہا تھا اور لوگوں کی آمدورفت بھی شروع ہو چکی تھی۔ میں مختلف کھیتوں کی گنڈنیاں پھلانگتا ہوا دیکھی منزل کی طرف گھڑن تھا۔ صورت حال کی سنگینی کے پیش نظر میں نے کسی سے بھی سڑک کا راستہ دریافت نہ کیا اور تن بہ تقدیر چلا رہا۔ قریباً ڈھائی گھنٹے تک ٹانگ ٹوئیں مارنے کے بعد مجھے سڑک کی صورت دکھائی دی۔ اس دوران نجانے کتنے دھماتے، مندر، گردوارے اور لوگ مجھے لے گئے تھے لیکن میں ان سب سے کئی کترا کر گزر گیا تھا۔

ساری رات جس اوصاف شکن ماحول میں کئی تھی اور جس صورت حال سے میں دوچار ہو کر یہاں تک پہنچا تھا۔ ان حالات میں میری ذہنی اور جسمانی تندرستی کا برقرار رہنا کسی معجزے

سے کم نہیں قتل سڑک پر پہنچ کر میں نے کوئی خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ میں سب کیل دھکیلی نہیں دے رہا تھا جس سے اندازہ ہو سکتا کہ یہ سڑک کہیں سے آتی ہے اور کس طرف جا رہی ہے۔

--- میں نے سڑک کے کنارے کنارے چلتا شروع کر دیا۔ تھوڑی دور جا کر ایک کنارے پر لگا بورڈ دھکیلی دیا جس پر انگلی کے اشارے سے ایک راستے کی نشیمن دی گئی تھی اور اس گلوں کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس سے کچھ آگے بائیں طرف بھی ایک ایسا ہی بورڈ نظر آیا۔ کچھ اور آگے پہنچا تو گو ہر مقصود بھی ہاتھ آگیا۔ یہ لدھیانہ کی ایک زلی سڑک تھی جو آگے جا کر نیلی روڈ سے مل جاتی تھی۔

ایک جگہ سڑک کے کنارے بنا ہوا ایک لوہے کا شیڈ ساتھ جس کا مطلب تھا کہ یہ بس سٹاپ ہے۔ قریباً پندرہ بیس منٹ کے چلن لیا انتظار کے بعد ایک چھوڑا سا دور سے آتا دھکیلی دیا۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ یہ بس ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس بس نما چھوڑے میں سوار ہو گیا۔ جس میں پہلے ہی سے نزدیکی دہشت کے لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھسے ہوئے تھے میرے سوار ہونے پر حسب روایت پہلے سے پھنسے لوگوں نے دوچار گلیاں بس والوں کو نکالیں دوچار کلمات خیر میرے حق میں کے اور بس چل دی۔

آدھے گھنٹے بعد قریباً پسیلوں کو کھینچے سے نکالنے کے بعد مجھے کھلی ہوا میں سانس لینے کی توفیق نصیب ہوئی۔ یہ ایک قصبائی بس سینڈ تھا جس سے بسیں موگا وغیرہ کے لئے جاتی تھیں۔ سامنے موگا کی بس تیار تھی میں اس میں سوار ہو کر موگا کی طرف چل دیا۔

دوسرے قریب موگا پہنچا۔ ایک ہوٹل میں ڈنٹ کر کھانا کھلیا اور وہیں ایک مقامی سینما میں جا گھس کر شام جب مجھے جسونت کے محفوظ ہاتھوں تک پہنچنے کا سنگل موصول ہوا تو بے اختیار میرا دل تشکر کے جذبات سے بھر آیا۔ --- اللہ تعالیٰ کے خصوصی رحم و کرم سے ہی یہ مہم سر ہوئی تھی۔ سرت بھرے دل کے ساتھ میں یہاں سے عازم لدھیانہ ہوا اور سورج ڈھلتے ہی دہلی جا پہنچا۔

○○○

پرکاش کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ میں سیدھا اوپر کمرے میں ہی چلا آیا۔ شاید ہی کسی نے مجھے دیکھا ہو گا۔ یہاں ایک ٹرک میں سے اپنے دھلے ہوئے کپڑے نکال کر پہنے۔ پرکاش کے آنے سے پہلے پہلے اسی کے سٹلن سے شیو بیٹا پھر ایک لڑکے کو بلا کر قریبی ہوٹل سے چائے لانے کو کہا اور خود چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

پرکاش سدرشا کے ساتھ قلم دیکھنے گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی رات دس بجے کے قریب ہوئی۔ اس دورن میں میں شاندار خند سے لطف اندوز ہو چکا تھا اور خود کو تروتازہ محسوس کر رہا تھا۔ ایک لڑکے کو میں نے قریبی ہوٹل سے کھانا لینے بھیج دیا اور پرکاش کی آمد ایک ساتھ ہوئی تھی۔ اسے چونکہ میرے آنے کی خبر نہ تھی اس لئے مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

”آپ کب پدھارے مہاراج؟“

”جیسے آوارہ گردی سے فرصت ملے تو جانو۔“

”میں آوارہ گردی کرنے نہیں، قلم دیکھنے گیا تھا۔“ پرکاش نے جیتے ہوئے کہا۔

کھانا ہم دونوں نے اکٹھے ہی کھلیا، پھر پرکاش تو لمبی تن کے سو رہا جب کہ میں نے وہ رات کو نہیں بدلے گزار دی۔ جب سے میں نے قلم ”جوئے بنگلہ دیش“ دیکھی تھی اک بے کلی سی چمکی رہتی تھی۔ کوئی طاقت اندر ہی اندر مجھے آنے والے بیباک خطرے کا احساس دلاتی رہتی۔ ہندو کی چلترازیوں کا نزدیک سے مشاہدہ کرنے کے بعد اور اپنی قوم کی بھولی ذہانت کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ چاکلیہ کے چیلوں کی خباثت رنگ لاکر رہے گی اور جو زہر آہستہ آہستہ لیکن بڑے منظم طریق سے بھولے بھالے بنگالیوں کے دل و دماغ میں اتر رہا تھا اس کے دور رس نتائج ضرور برآمد ہوں گے۔

بھارتی اخبارات میں روزانہ پاکستانی فوج کے متعلق من گھڑت کہانیاں شائع ہونے لگی تھیں۔ نجانے یہ لوگ کہیں سے عجیب عجیب قسم کی تصویر لے آئے تھے جن کو پاکستان کی برصغیر کا شکار ظاہر کر کے دن رات پراپیگنڈہ کیا جا رہا تھا۔ آکاش دہلی کے کسی نہ کسی شیش سے ہر روز کوئی نہ کوئی ”شرارت تھی“ پاکستان کے خلاف زہر افگنا سٹائی دیتا تھا۔ غیر ملکی خبر رس ایجنسیاں کہ اسلام دشمنی جن کی گھنٹی میں پڑی تھی، ایسی باتوں کی خیر رہتی تھیں اور بغیر کسی تصدیق کے وہی خبر اگلے روز ان کے حوالے سے پڑھنے سننے کو مل جاتی تھی۔ کاش ہمارے سفارت کاروں نے اس دور پر آشوب میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کیا ہوتا اور وقت کی آمد میوں کا رخ پہچان سکتے۔

اگلے روز علی الصبح میں اور پرکاش لدھیانہ جیل جانے کی تیاریوں میں لگ گئے کیونکہ آج بیہوشی سے ملاقات کا دن تھا۔ صبح جلد ہی ماتائی اور موسی جی پونم لور پنچو کے ساتھ آگئی تھیں۔ انہوں نے بیہوشی کے لئے بہت سا سلیٹن اکٹھا کر رکھا تھا۔ جیل میں بیہوشی سے ملاقات علیحدگی میں ہوئی۔ اس سلسلے میں ہم نے پہلے سے ہی جیل حکام کی مٹھی گرم کر دی تھی اور انہوں نے بھی پورا پورا حق نمک ادا کیا۔

بہو جی ہمیں بڑے اچھے موڈ میں ملے۔ وہ ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ گھروالوں نے میری مسائی سے انہیں اگھ کیا تو ان کی حالت دیدنی تھی۔ انہوں نے علیحدگی میں مجھ سے کچھ باتیں کیں تو میں نے انہیں منور سنگھ کی ملاقات سے اگھ کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں لن کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔

”پرکاش بیٹے اس سلسلے میں مجھے نجانے کیوں اک نکل سی گئی رہتی ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں میں نے اپنے مشن کی عظیم خدمت کی ہے جو انہیں تم جیسا کارکن سونپا ہے، لیکن جب پونم کا خیال آتا ہے تو مجھ..... وہ خاموش ہو گئے۔

”آپ صرف تحریک کی کلاسیکی کے بعد کے ثمرات سوچا کیجئے۔ بہو جی اگر آپ نہ ملنے تو کیا میں نکس باڑی نہ بننا؟ بس آپ کا بلانہ بننا تھا سو بن گیا۔“ میں نے لن سے کہا تو بوڑھے کیونٹ نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

بہو جی کی زبانی علم ہوا کہ جس بات کا انہیں شک تھا، اس بات سے خیریت ہی گزری ہے اور ان کی اطلاعات بھی یہی ہیں کہ انہیں نکس باڑی ہونے کے شبے میں نظر بند کیا گیا ہے۔ پولیس کپتان کے سلسلے میں نہیں۔ بہو جی کی طرح مجھے بھی اس بات کا یقین تھا کہ حکومت کی کوئی ایجنسی بھی ان کے خلاف نکس باڑی ہونے کا ثبوت حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ بہو جی نے کچی گولیاں نہیں کھلی تھیں۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ ممکن ہے مجھے اب کلکتہ لن کے ہیڈ کوارٹر میں تربیت حاصل کرنے جانا پڑے۔ اس سلسلے میں پیش بندی کے طور پر انہوں نے گھروالوں سے کہہ دیا تھا کہ ”چند روز تک ممکن ہے پرکاش کو ان کے کسی خاص کام سے کلکتہ جانا پڑے۔“ تاکہ گھروالوں کو میرے اچانک اس طرح کلکتہ جانے پر شک نہ گزرے۔

ملاقات کے لئے عموماً ایک گھنٹے کا وقت ملتا ہے لیکن ہم نے تین چار گھنٹے بہو جی کے ساتھ گزارے اور ان کی نیک تنائیں لے کر رخصت ہوئے۔ پرکاش کو میں نے گھروالوں کے ساتھ رائے کوٹ بھیج دیا اور خود لاہور روانہ رہ گیا۔ اصل میں، میں اپنے لوگوں کے ساتھ مل کر کلکتہ کے سلسلے میں اگلا پروگرام طے کرنا چاہتا تھا کیونکہ خلی ہاتھ بیٹھے رہنا مجھے منظور نہیں تھا۔

مجھے تو کام کرنا تھا۔ نکس باڑیوں کی آڑ میں ہی سی! کلکتہ کے ممکنہ دورے کے پیش نظر مجھے وہیں سے متعلق کچھ مشن سونپے گئے اور وہیں کے ”دوستوں“ کو بھی میرے متعلق اطلاعات بھیج دی گئیں۔ اپنے کام سے نمٹ کر قریباً شام کے وقت جب میں واپس کارخانے پہنچا تو ایک پیغام میرا منتظر تھا۔

”بہو جی ایک صاحب آئے تھے، آپ کا انتظار کرتے رہے پھر یہ رقم دے گئے۔۔۔!“ ایک ملازم نے اطلاع دی۔

میری توقع کے عین مطابق یہ میرے نئے دوستوں کا پیغام تھا۔ انہوں نے اگلے روز پھر اسی ہوٹل میں آنے کے لئے کہا تھا۔

○○○

اگلے روز سب سے پہلے پونم سے ملاقات ہوئی جو رائے کوٹ سے سیدھی بیس چلی آئی تھی۔

”خیریت“ میں نے اس کے کپڑوں پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا اس نے کالج کی مخصوص وردی کے بجائے پرائیویٹ کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔

”بالکل نہیں۔“ پونم مختصر سا جواب دے کر میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”ارادے خطرناک ہی دکھائی دیتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف جھٹکتے ہوئے کہا۔

”آپ سے زیادہ نہیں۔“ میں پونم کی اس بات سے چونکا۔ ”یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کلکتہ جانے کی کیا سوجھی؟“

”اچھا تو یوں کہنا بھی! بہو جی کا کام تھا کچھ۔“ میں نے لاہور والی سے کہا۔

”پرکاش بہو آپ کو مجھ پر دشواش نہیں کیا؟“ اس کا لہجہ بڑا گھمبیر ہو گیا تھا۔

”پونم یہ بات تم کہہ رہی ہو، تم جو میرا انتہا دشواش ہو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

پرکاش بہو میں بچی نہیں ہوں، مجھے علم ہے بہو جی کس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ یہ بات میں آج سے نہیں بچھلے پانچ سال سے جانتی ہوں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے بات کی اور میرا دل بھر زور سے دھڑکا۔

”میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھتا۔“ میں نے اپنی طرف سے چلا کی کا مظاہرہ کیا۔

”پرکاش بہو آپ سب کچھ جانتے ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ بہو جی آپ پر دشواش کرتے ہیں۔“

انہوں نے آپ کو کلکتہ میں اپنے کسلا بیڈ دوستوں سے ملاقات کرنے کو کہا ہے۔ مجھے صرف

ایک بنی کرنی ہے کہ آپ کیس.....“

”لوہ پونم کیا بچوں کی سی بات کرتی ہو، جو تمہاری زلفوں کا امیر ہو چکا وہ وہ اور کسی کے دام میں نہیں پھنس سکتا۔ یہ ٹھیک ہے میں بہو جی کے کام ہی سے جا رہا ہوں لیکن ایسی بات قطعاً نہیں کہ میں خود نکس باڑی بن جاؤں گا اور ہاں جس راز کو پانچ سال سے تم نے اپنے سینے میں

ٹھوڑی دیر بعد میں بھی اٹھ کر باہر نکل آیا۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب براہ راست چانکیہ کے ان غیبت چیلوں سے نکرانے کا موقع ملے گا جو پورہ پاکستان کی پو تو دھرتی کو اپنے ہلاک قدموں سے روند رہے تھے کیونکہ کئی ماہی کے ٹینگ کیپ زیادہ تر کلکتہ میں واقع تھے اور مشرقی پاکستان میں کی جانے والی تمام کارروائیوں کو عموماً "کلکتہ اور آسام ہی سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔

واپسی میں رائے کوٹ ہی چلا آیا۔ اتفاق سے سالگ رام بھی چھٹی لے کر آیا ہوا تھا۔ میں نے گھروالوں کو بتایا کہ پرسوں مجھے کلکتہ جانا ہو گا، ممکن ہے وہیں کچھ دن لگ جائیں۔ بڑی مشکل سے میں انہیں مطمئن کر سکا کیونکہ گھر کا کوئی فرد مجھے کلکتہ جانے کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھا۔ پونم کو میں نے بڑی تردد کے بعد اس بات کا یقین دلایا تھا کہ میں صرف بیوی کو اس چکر سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں، کیونکہ ان کے متعلق زیادہ تر شواہد حکومت کلکتہ سے حاصل کرے گی اور ہماری کوتاہی کی وجہ سے اگر بھگوان نہ کرے، ان پر نکلا ہیڈ ہونے کا الزام ثابت ہو گیا تو پھر ان کی ساری زندگی جیل کی نذر ہو جائے گی۔

پونم کو میں نے دہن دیا تھا کہ میں کبھی کنس باڑیوں کا آلہ کار نہیں بنوں گا۔ خدا خدا کر کے سب لوگ راضی ہوئے۔ میں نے پرکاش کو بتایا کہ کلکتہ میں برنس ملنے کی بھی بہت امید ہے۔

"جنم میں گیا برنس اور کلکتہ۔" اس نے اگڑے اگڑے لمبے میں جواب دیا۔ اصل میں اس گھر کے کینوں کو مجھ سے ایسا لگاؤ ہو گیا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ گھر میں شاید ایک حلاء سا محسوس کرنے لگتے۔ ایک سالگ رام ایسا تھا جسے میں نے اشارے کنایے سے حالات کی یقینی کا احساس دلا کر اپنی حمایت پر راضی کیا تھا اور جب گھروالوں نے میرے جانے کے حق میں فیصلہ دے دیا تو پرکاش ناراض ہو کر رائے کوٹ چلا آیا۔ میں نے بھی فی الحال اسے چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔

رات کو پونم اور میں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے تو اب قدرت کی ستم خیزی کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا لیکن ایک پھانس سی کس ایک کر رہ جاتی۔ جب میں یہ سوچتا: میری دائمی جدائی کو یہ لوگ کیسے برداشت کریں گے؟ جب میں نے اس کھیل کا آغاز کیا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ حالات اتنے سنجیدہ ہو جائیں گے!

پونم کی قربت کے وہ حسین لمحات اب میرے لئے سرمایہ حیات بن چکے ہیں۔ فلک نے ہر

چھپا رکھا ہے اسے بیٹھ رازی رکھنا، اس میں ہم سب کی سلامتی ہے۔" پونم خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر خلا میں کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔ شاید آنے والے وقت سے متعلق کچھ اندازہ قائم کر رہی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے کہا۔

"پونم میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں۔ دشاوش رکھو میں زندگی میں جہیں بھی دھوکہ نہیں دوں گا کبھی نہیں۔" یہ بات کہتے ہوئے میرا دل بھر آیا۔

کیسا خطرناک کھیل تقدیر کھیل رہی تھی میرے ساتھ۔!۔۔۔! دوپہر تک ہم اکٹھے رہے۔ ایک ہوٹل سے ہم نے کھانا کھلایا اور میں پونم کو بس میں سوار کر کے واپس اس ہوٹل کی طرف چل دیا جہاں مجھے اپنے نئے دوستوں سے ملنا تھا ابھی ہماری ملاقات میں قریباً ایک گھنٹہ بقی تھا۔ یہ وقت میں نے آوارہ گردی کی نذر کر دیا اور مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی ہوٹل میں جا بیٹھا جیسے ہی گھڑی کی سوئیاں مقررہ وقت پر پہنچیں، اس کے بمشکل دو منٹ کے بعد ایک سارٹ سانو جوان اپنی طرف آنا دکھائی دیا۔ نووارد نے وہ مخصوص نشان اپنے کوٹ کے کالر پر سجایا تھا جو کنس باڑی کے لئے ان دنوں مخصوص تھا۔

"اشوک" اس نے میرے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملا کر کہا۔ "پرکاش" میں نے بھی گرجوش سے اس کا ہاتھ دہرایا۔ ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک کین میں بیٹھ گئے اور میرے کو چائے لانے کا کہہ کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

"مشر پرکاش مجھے آپ کے ساتھ کلکتہ جانا ہے جہاں ہمارے دوست آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ آپ کو کم از کم ایک ماہ تک قیام کرنا ہو گا تاکہ آپ بنیادی تربیت حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد آپ واپس پنجاب میں آئیں گے اور آپ کو عظیم پروٹاری انقلاب کے لئے کام کرنا ہو گا۔ ممکن ہے آپ نے ہمارے ساتھ شمولیت کا فیصلہ جذباتی ہو کر کیا ہو، ہم نہیں چاہتے کہ تصویر کا کوئی رخ آپ سے پوشیدہ رہے۔ صرف ایک بات یاد رکھئے کہ ایک دفعہ کنس باڑی ہو جانے کے بعد اس ملک میں آزادی کا سانس لیتا آپ کے لئے ناممکن ہے یا تو سیکورٹی والے آپ کو کسی نہ کسی بہانے سے مار ڈالیں گے یا پھر ساری عمر گھٹنے سڑنے کے لئے کسی جیل میں پیسٹک دیں گے۔ آپ پرسوں تک سوچئے، اچھی طرح حالات کا جائزہ لیجئے۔ اگر اس کے بعد بھی آپ ثابت قدم رہیں تو میں دن کے گیارہ بجے پلٹ فارم نمبر "تمن" پر آپ کا خیر رہوں گا۔ مجھے جواب دینے کا موقع دینے بغیر اس نے گرجوش سے ہاتھ ملایا اور "گڈ لک" کہہ کر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی میرے پیارے مجھے آنسو بھری مسکراہٹوں سے الوداع کر رہے تھے۔
 زمین نے رنگنا شروع کیا۔ میں اپنے برقعہ پر پہنچا جہاں اشوک میرا انتظار تھا۔

اعلیٰ جس تو معمول کی کارروائی کے مطابق یہ کلمہ کر رہی تھی جب کہ کنسن باڑی نے کامریڈ پر آخر وقت تک نظر رکھتے تھے مبلو اور حکومت کا آدمی ہو اور سب کو لے ڈوبے یہ لوگ اتنے زبردست تربیت یافتہ تھے کہ میرے لاکھ ہلاک ہونے کے بلوجود ابھی تک میں نے اشوک سے ملنے والے کسی شخص کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ پیغام البتہ ہم تک ضرور پہنچ جاتا تھا۔

بڑی بازار کیا تھا چوں چوں کامریڈ! جس مکان میں ہم پہنچے وہ ایک کٹری میں بنا تھا اسے

جاوروں کا طوطہ کما جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ بازار میں گھسے ہی عجیب عجیب رنگ و نسل کے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جو انسانوں کے بجائے کسی مشین کا کل پرزہ دکھائی دے رہے تھے۔ ان لوگوں کو پنجاب کے لوگوں کی طرح دوسروں کے متعلق سوچنے کی سلت میر نہیں تھی۔ ویسے بھی ان کے پاس سوچنے کے لئے وقت تھا ہی کمال۔ وہ تو رات کو بھی اتنی دیر ہی آرام کرتے تھے جتنی دیر کے لئے کسی زیر استعمال مشین کو مکمل نقصان کے پیش نظر بند کر دیا جاتا ہے۔ پنجاب کے اور یہاں کے لوگوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ سوکھے سوکھے مزل سے بھلی جو دن رات زندگی سے لڑائی میں جتے رہتے تھے۔ اس لڑائی میں انہیں نہ کبھی فتح نصیب ہوئی نہ ہوگی کہ یہی کچھ انہیں ورٹے میں ملا تھا جسے وہ اگلی نسلوں کو نخل کر دیں گے۔

ہم جس ڈربے میں گھسے تھے اس کی چلی منزل میں شراب خانہ تھا اور لوہے کی منزل میں تین کمروں میں تین کنبے رہتے تھے۔ ایک ڈربہ کھلے ہاڑیوں نے لے رکھا تھا۔ جہاں موقع محل کی مناسبت سے ان کا ایک در کر اپنی بیگم کے ساتھ مقیم تھا۔۔۔ یہ تھے جیتن اور اس کی جتنی سہانا۔

سہانا بگڑی ہوئی رئیس زادی تھی جو اپنے باپ کی مل کے ایک کلرک جیتن کے ساتھ یہاں آن برائی تھی۔ دونوں نے واقعی خود کو کھل باڑی تحریک کے لئے وقف کر دیا تھا۔ سہانا عورتوں میں کام کرتی تھی اور جیتن یہاں کا مقامی سکتر تھا۔ دونوں بڑے خوش عقیم انقلاب کے لئے لڑ رہے تھے جو شاید کبھی ان کا مقدر نہ بن سکے۔ سہانا کو تحریک میں عقیم مقام اس لئے حاصل تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے ”بورڈا ہاپ“ کو گولی مار دی تھی اور جو کامریڈ اپنے اصولوں کے لئے اپنی ولایت سے بھی منکر ہو جائے وہ ”عقیم“ کیوں نہ کہلائے گا اس کو زیادہ اہمیت اس لئے بھی حاصل تھی کہ اس نے کبھی کسی کامریڈ کو ”ناراض“ ہونے کا سرفہ نہیں دیا تھا۔ سہانا کے دروازے ہر کسی کے لئے کھلے تھے۔ وہ انسانی پستیوں کی انتہا میں گر چکی تھی جہاں اخلاقیات کا جنازہ نکل جاتا ہے اور مذہب، معاشرت، اخلاق وغیرہ لائینی سی چیزیں بن کر رہ جاتے ہیں۔

سہانا ولی کی رہنے والی اور پولیس کو مطلوب تھی۔ وہ یہاں پچھلے دو سال سے اپنا نام اور شخصیت بدل کر قیام پذیر تھی۔ اس کے ہاتھ لوگوں کے خون میں بھی یقیناً رنگے ہوں گے، لیکن ان کا علم کسی کو نہیں تھا۔ اس کے باپ ولی بات بھی اس لئے بتائی جاتی کہ دوسرے کامریڈ انقلاب کے راستے پر چلنے والی اس ”مملویر کامریڈ“ جیسے نظریات اپنائیں جو بنفس نفیس ان میں موجود تھی کیونکہ بقول ان کے انقلاب کا حصول جمعی ممکن ہے جب ہم تمام رشتوں کو بھلا کر

صرف ”انقلابی“ کا رشتہ اپنائیں۔ جسے سہانا نے خوب خوب اپنایا تھا۔ کسری میں داخل ہوتے ہی شراب کی بدبو میرے نغٹوں میں گھس آئی تھی۔ پہلے پہل تو مجھے ایسی جگہوں سے سخت وحشت ہوتی لیکن بھارت میں چونکہ قدم قدم پر ایسے ہی ماحول سے واسطہ پڑتا ہے اس لئے اب میں نے ذہنی طور پر ان حالات سے مصالحت کر لی تھی اور چند لمحوں کے بعد ایسی جگہوں پر لعنت بھیج کر میں بھر مارل ہو جاتا تھا۔ تب مجھے یہ احساس نہیں ہو پاتا تھا کہ میں یہاں کوئی غیر مرئی مخلوق بن کر آیا ہوں بلکہ میں خود کو بھی اسی ماحول اور اس میں بسنے والے لوگوں کا ایک حصہ جانے لگتا تھا۔۔۔ ڈربے پر ہمارا استقبال جیتن نے کیا۔

”ہیلو کامریڈ۔“ کہہ کر اس نے گرجوٹی سے ہم سے مصافحہ کیا۔

ابھی ہم بمشکل جینے ہی پائے تھے کہ سیڑھیوں سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند لمحوں بعد ہونٹوں میں سرکٹ دہائے میرے سامنے بگڑی ہوئی رئیس زادی کھڑی تھی، اس کی آنکھیں نٹے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

جس پر اپنی وضع قطع کے موافق ہم بیٹھے تھے اس کے سامنے ایک کونے میں رکھی تپائی پر شراب کی آدھی خالی بوتل اور گلاس بھی موجود تھا جس کے بھسکے اس کے منہ سے اٹھ رہے تھے۔ اس نے استغناء سے نظروں سے جیتن کی طرف دیکھا جس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا اور جواب میں سہانا نے بھی اس سے کچھ زیادہ ہی سرگرمی سے ”کامریڈ“ کہہ کر ہم دونوں سے باری باری مصافحہ کیا۔

اشوک بھی شاید میری طرح ان دونوں کے لئے اجنبی تھا، لیکن یہاں کے دوسرے لوگ جنہیں پنجاب میں کام کرنے کا سرفہ ملا تھا اس سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اسی لئے جیتن نے اس کا خیر مقدم اس طرح کیا تھا جیسے وہ سینئر کامریڈ کا کیا کرتے تھے۔ میرے متعلق اطلاعات پہلے ہی سے یہاں پہنچ چکی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی یہاں زیادہ تر نے پھسلے گئے یا خود پھنسے ہوئے کارکن ہی آتے تھے اور بڑی بازار کے اس مکان کو ٹرننگ سینٹر کا مقام حاصل تھا۔

مسل سرنے میں تھا ڈالا تھا اس لئے بیٹھ کرتے ہی اسی کمرے کے ایک کونے میں گئے ککڑی کے ایک تخت پوش پر آڑے تڑپے ہو کر سو رہے۔ میرے آنکھ تو جلد ہی کھل گئی جب کہ اشوک ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ سہانا اور جیتن دونوں کمرے میں موجود نہیں تھے۔ میں ایک تویہ کدھے پر رکھ کر نیچے گیا اور شراب خانے کے ایک کونے میں گئے تھکے پر منہ ہاتھ دھو کر دوبارہ واپس آیا تو جیتن وہاں موجود تھا۔ کچھ کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔

”کھل عجب ہو گئے تھے یار۔“ اس نے بڑی بے تکلفی سے میرے کدھے پر ہاتھ مارا۔

”منہ ہاتھ دھوئے گیا تھا“ سوچا گھوم بھر کر کلکتہ ہی دیکھ لوں۔“ میں نے توبہ ایک طرف نکلتے ہوئے جواب دیا۔

”میں تو سمجھا تھا بھاگ گئے ڈر کے مارے۔“ اس نے قریباً جپتے ہوئے کہا۔
”کامریڈ میں بھاگنے کے لئے میں نہیں آیا۔“ میرے لیے کی سبیدگی نے جینن کو بھی سنجیدہ کر دیا۔

اس اثناء میں سنا بھی دہلی آگئی۔ اب وہ نارمل نظر آتی تھی۔ اس نے جینن کے اشارے پر ایک سنود پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا اور جینن نے اپنا کلم سنبھل لیا۔ سب سے پہلے تو اس نے عظیم انقلاب کی خوبیاں منوالی شروع کیں، پھر کچھ حفاظتی اقدامات سے آگاہ کیا اور یہ خصوصی ہدایت کی کہ میں کسی کامریڈ کو سوائے اپنے کلم کے اور کچھ نہیں بتاؤں۔ نہ ہی کسی کے متعلق جاننے کی کوشش کرے۔ مجھے صرف انہی باتوں یا معلومات پر اکتفا کرنا تھا جو تحریک کی طرف سے مجھے فراہم کی جاتیں۔ خود سے کچھ جاننے کی کوشش کرنا یا زیادہ چلاک بنا جرم تھا۔ ایسی کوئی بھی حرکت سرزد ہونے پر ”عوامی عدالت“ انقلاب کی راہ سے ہننے والے یا روڑے اٹکانے والے کے خلاف کارروائی کرتی تھی اور اس کا ہر فیصلہ قبول کرنا پڑتا تھا، خواہ وہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو۔ اپنے اصول و ضوابط مختصراً بتا کر اس نے میری توجہ کچھ سرخ جلدوں والی کتابوں کی طرف دلائی اور بتایا کہ ہر انقلابی کا فرض ہے کہ وہ ان کا مطالعہ کرے۔

جینن واقعی کامیاب در کر تھا۔ اس کا بت سمجھانے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا کہ سننے والے کو یہ کبھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اسے ڈرایا دھمکیا جا رہا ہے جب کہ وہ سب کو کہہ گزرتا تھا۔ جینن کی اجازت سے میں شہر دیکھنے باہر آ گیا۔ اس نے سنا کو اپنے ساتھ لے جانے کی پیشکش کی لیکن میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ سنا نے اس پیش کش کو ٹھکرانے پر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ نہ جانے کیوں؟

○○○

شام کو پانچ بجے واپس آنے کا وعدہ کر کے میں روانہ ہو گیا۔۔۔۔۔ کلکتہ بھی اس وقت جاگ گیا تھا۔

—دریائے ہنگی کے کنارے آبلہ اس شہر کے۔۔۔۔۔ زاکھوں کینوں میں سے اکثر دیشتر اپنے اپنے دھندوں کے لئے گھروں سے باہر آ گئے تھے۔ اسی نجوم میں، میں بھی سڑکوں پر مڑمڑت کرنے لگا۔

میدان سے ہوتا ہوا لوڑ چٹ روڈ پر آ گیا اور وہاں سے گھومتا گھماتا آخر زکریا اسٹریٹ کی

طرف آ نکلا۔۔۔۔۔ میں زیادہ تر آبلہی مسلمانوں کی تھی۔ ایک بڑی سی سرائے کے نزدیک لوگوں کے جھوم نے میرے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ میں وہیں رک گیا۔ دیکھوں تماشا کیا ہے؟
لورہ دکھارہ دیکھ کر میرا داغ خون کے آنسو روئے لگا۔

—چند ہنگل لوجن لڑکیوں کو لوگوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ یہ وہ بد قسمت شرقی پاکستان کی مسلمان لڑکیاں تھیں جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ بھارتی پرمیٹڈ اکاشکار ہو کر میں چلی آئی تھیں۔

پہلے تو یہ لوگ سرمدی اضلاع میں لگے شرابار تھی کیہوں میں آتے تھے، پھر سیالہ سے ہوتے ہوئے کلکتہ کی طرف نکل جاتے تھے کیونکہ شرابار تھیوں کے نام پر حاصل ہونے والی مقامی اور بین الاقوامی امداد بھارتی سرکار خود منعم کر جاتی تھی یا کتنی باہنی کی بحیثیت چڑھا دیتی تھی اور ان بد نصیبوں کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کلکتہ کا رخ ہی کرنا پڑتا تھا۔

کلکتہ میں ان کے لئے زندہ رہنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔۔۔۔۔ کہ وہ اپنی عزت بچیں یا پھر بھوکے مرجائیں۔ کیونکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہیں مزدوری کرنے کے مواقع نہیں دیے جاتے تھے تاکہ یہ بد بخت لوگ اتنے مجبور ہو جائیں کہ اپنے ہاتھوں اپنی غیرت کو سولی پر چڑھا دیں۔ پہلے پہل تو یہ بد قسمت کنبے اپنے ساتھ لایا ہوا مال و متاع اونے پونے داموں بیچ کر زندگی بسر کرتے اور جب زور لہ ختم ہو جاتا تو افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ کمرہ دھندا اپنا لیتے۔

زمانہ غلامی میں شاید اس طرح کینڑوں اور غلاموں کی منڈیاں لگتی ہوں گی جس کا نظارہ میں دیکھنے میں آ رہا تھا۔۔۔۔۔ کمرہ چروں والے چانکیہ کے خبیث چیلے کھا جانے والی نظروں سے ان کا جائزہ لیتے۔ انہیں ٹٹول ٹٹول کر ان کی قیمت کا تعین کرتے۔ قیمت چکاتے اور بے کسی کی ان تصویروں کو بغل میں دبا کر اپنی راہ لیتے۔ عزتوں کا یہ کوڑیوں کے مول غلام کیسا اندوہناک البتہ تھا۔۔۔۔۔ اس کا احاطہ الفاظ میں ممکن نہیں۔

حیرت تو اس بات پر ہوتی تھی کہ آخر شرابار تھیوں کو بھارتی حکومت نے اپنے شہروں میں آنے جانے کی اجازت کیوں دے رکھی تھی؟ حالات نے اب یہ ثابت کر دیا تھا کہ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جا رہا تھا۔ کسی قوم کو ذلیل و خوار کرنا مقصود ہو تو حملہ آور قومیں سب سے پہلے ”دشمن“ کی بہو بیٹیوں کی صحت پر ڈاکہ زنی کرتی ہیں۔ انہیں بے غیرت بنا کر ان کے تشخص میں دراڑیں ڈالی جاتی ہیں اور کرداروں میں ایسے شکف بنا دیئے جاتے ہیں کہ وہ جب چاہیں ان رنخوں میں سے دخل اندازی کر سکیں۔ اس مداخلت پر مطلوب کچھ نہیں

کہہ پاتے، احتجاج بھی نہیں کر سکتے کہ ضمیر تو ان کے پہلے ہی اپنی قیمت پا چکے ہوتے ہیں۔ بھارت کے اس سب سے بڑے شر۔۔۔ کلکتہ کی مقامی مسلمان آبادی اتنی غریب تھی کہ سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ حالت مسلمانوں کی ہی نہیں یہاں بسنے والے تمام مذاہب کے لوگوں کی تھی۔ بھارتی حکومت پر جنگی جنون کا بھوت اس بری طرح سوار تھا کہ اس نے جتنا کی تمام ضروریات کو نظر انداز کر کے اپنی تمام توانائیاں مشرقی پاکستان پر غلبہ انداز کے لئے وقف کر دی تھیں۔

یہ متاثرہ دیکھ کر میرا دل اپنی بد قسمتی پر خون کے آنسو رو دیا۔ بڑے دکھ دل کے ساتھ میں واپس آ رہا تھا۔ زکریا اسٹریٹ کے ایک کونے پر کھڑے ایک بوڑھے مشرقی پاکستانی نے جس کے ساتھ سکرے سنے دے بچے بھی بیٹھے تھے بیک لگتے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ان کی حالت دیدنی تھی! مجھے بجائے رحم کے ان پر غصہ آ رہا تھا۔

”تم سلا ایک دم بے غیرت ہے! اور آڑوی کانٹو لگاتا ہے اور اپنی عورتوں کا دھندا کرتا ہے۔“ میں نے کلکتہ لہجے میں اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

”ہم دھوکے میں مارا گیا صاحب۔ ہمارے ساتھ بہت ظلم (ظلم) ہوا۔ اور موزیب (جیب) ہم سے بولا، بھلی تم پر ظلم کرتا ہے، تمہارا حق کھاتا ہے۔ اور اندرا حکومت ہم سے بولا ہم تمہیں بھات دے گا، تمہیں بچائے گا۔ تم بھلیوں سے لڑو۔ صاحب ہمیں موزیب اور اندرانے مار ڈالا۔ صاحب! ہم بے غیرت نہیں ہے۔ ہم بزدل بھی نہیں ہے۔ ہمیں تو اپنوں نے مار ڈالا۔“ وہ قریباً سسکیں لے کر رونے لگا۔

○○○

بوڑھا مابھی میرے سامنے ہاتھ پھیلائے نہامت کے آنسو بہا رہا تھا۔ لیکن میرے سامنے اس سے پورے پاکستان ابھر آیا تھا۔

جہاں کی سنری رست پوری آب و تاب سے ہنک اٹھی تھی اور جہاں کی مٹی سے سر نکالنے والے پٹ سن کے ریشے میری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگے تھے۔ جہاں کے لہلہاتے کعبوں میں دور دور تک چھٹی ہوئی دھواں کی فصلیں مجھے شوق نگارہ دینے لگی تھیں۔

اور جہاں اس وقت آلتب ظلم ہو رہا تھا۔ آہ! سنری اور روپلی آفتابی کرنیں کس شوق سے دریاؤں پر حدنگہ تک پھیلی ہوئی زمین پر سونا بکیر رہی تھیں۔

”خدا یا! کیا پیارا لگتا ہے یہ سنری دیکھ میرا۔“ میرے ہونٹوں پر جب یہ فقرہ لرزنے لگا تو میری آنکھیں مابھی سے دھار ہو گئیں۔ اس کے ہاتھ بدستور میرا دل ٹٹولنے کی

کوشش کر رہے تھے۔

میں بھی چینی چینی نظروں سے اس بوڑھے مابھی کو دیکھ رہا تھا جس کے ہاتھوں میں اب بھی طوفانوں کا سینہ چرنے کی سکت تھی لیکن جسے بے دست و پا کر کے اس کے لیڈروں نے چاکلیہ کے خوشخوار بھیلوں کے سامنے لاکر پھینک دیا تھا۔

اور وہ معرتوں کی طرح ان سے لپٹے ان کا خون چوس کر اپنی انڈیا پیاس بجھا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو جھللائے گئے۔ لیکن میں اتنا مجبور تھا کہ ان کے سامنے رو بھی نہ سکا۔ مبلوا کوئی سی۔ آئی۔ ڈی والا میری اس حرکت سے مجھے مشتبہ نہ سمجھ سکے۔ میں تو اپنے پورو پاکستان کے مابھی سے یہ بھی نہ کہہ سکتا ”بد بختو! اب بھی وقت ہے اپنوں میں واپس پلٹ جاؤ۔ صرف وہیں تمہارے لئے ان کے درنہ دنیا کا کوئی گوشہ تمہارے لئے محفوظ نہیں۔ اپنی ڈار سے چھڑ جلنے والی کو نہیں کر گوں کا شکار بن جلیا کرتی ہیں۔“

بس چپ چاپ جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کا نوٹ اس کی مٹھی میں تھما کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا اور یہ بات میرے پیٹے کے اصولوں سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ جلد ہی میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور۔۔۔ گھر لوٹنے سے پہلے اپنے مقامی ”دوستوں“ سے رابطہ قائم کر کے انہیں اپنے ٹھکانے سے آگے بھی کر دیا اور ضروری ہدایات بھی حاصل کر لیں۔

لیکن جب جنس کے ہاں پہنچا تو ایک کاتنا بدستور میرے دل میں پست تھا اور وہ تھا۔۔۔ مشرقی پاکستان کی بہنوں کی رحم طلب نگاہیں! میری بد نصیب بہنوں کی بد نصیب فریادیں۔

○○○

پانچ بجے کے قریب ایک اور شخصیت کا زور ہوا۔ یہ بسواس تھا۔ ان لوگوں کا مقامی لیڈر۔ بسواس نے بھی مصافحہ کرنے میں خاصی گرجو شوق کھلی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پانچ چھ اور نوجوان اکٹھے ہو گئے۔ یہ سب میری طرح ”ایئر ٹریننگ“ تھے۔

بسواس اور جنس نے ہمیں قریباً ایک گھنٹہ تک کیونز پر لپکھ دیا۔ بدل خواستہ مجھے بھی دوسروں کی طرح ان کی الٹی سیدھی سخی پڑیں۔ ازاں بعد ہم نے سہانا کی پٹلی ہوئی چائے زہرا کی۔ دوران لپکھ تو کسی کو آنکھ جھپکنے کی بھی اجازت نہیں، لیکن اس کے بعد کامریڈ سہانا سے بے ہودہ مذاق کرنے لگے تھے۔ بسواس چلا گیا تو اس کے بعد ایک ایک کر کے باقی لوگ بھی چلے گئے۔ میں اور اشوک شام ڈھلنے کے بعد سہانا کی معیت میں وہاں سے چلے آئے۔ سہانا ہمیں کلکتہ

کے تنگ و تاریک محلوں اور پر قفس گھبوں میں گھمائی پلاؤ ایک بلڈنگ کے سامنے لے آئی جس میں کم از کم پچاس کنبے مقیم تھے۔ اسی کے ایک کونے میں ایک کمرہ ہمارے لئے بھی موجود تھا۔ میرے روسیے نے اسے کچھ الجھن میں جلا کر دیا تھا جس کا اٹھارہ اس کی مختلف حرکات سے ہو رہا تھا۔ اشوک البتہ اسے خلصا انجوائے کر رہا تھا۔ ایک ہفتہ جو میں نے اب تک خاص طور سے نوٹ کی تھی وہ یہ کہ یہ لوگ زیادہ تر مغبھیں آبلو علاقوں میں ٹھکانہ کرتے تھے ورنہ عموماً "سننے میں کمی آتا تھا" ایسی تنظیمیں اجازت اور ویرن مقلات پر سیرا رکھتی ہیں۔

میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ میں یہاں ایک سٹراٹیجٹ کی حیثیت سے قیام کر رہا ہوں اور اپنے اصولوں کے مطابق وہ لوگ کسی کی پرائیویٹ لائف میں دخل بھی نہیں دیتے تھے۔

— سہانا ہمیں اگلے روز کے پروگرام کے متعلق ضروری ہدایات دے کر چلی گئی۔ اشوک نے میرے ساتھ سفر کے دوران اس ہفتہ کا اندازہ لگایا تھا کہ پینے پلانے کے معاملے میں 'میں ہانگل "کنزروٹو" ہوں۔۔۔۔۔ شراب خانے پر وہ اسی لئے اکیلا ہی چلا گیا جب کہ میں نے "ڈھابے" کا رخ کیا۔۔۔۔۔ وہاں سے میں جلد ہی واپس آیا اور آتے ہی سونے کی فکر کرنے لگا۔

○○○

لیکن نیند تھی کہ غفوار ہو گئی۔

۔۔۔۔۔ صبح جو کھانا دلی میں پیوست ہوا تھا اب وہ میرے سارے جسم کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ مشرقی پاکستان کی محل داستان میرے سامنے بکھری پڑی تھی۔۔۔۔۔ اور وہ کھلی میرے لاشعور سے زندہ پیر کی طرح انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگی۔

اس مقدس ٹپ دھرتی سے ستمبر ۱۹۷۱ء میں Crush India کا نعرہ ابھرا تھا۔ یہ سلوگن لے کر پورے پاکستان کے جوانوں، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں نے بڑے بڑے جلوس نکالے تھے۔ انہوں نے اپنے قول ہی سے نہیں، عمل سے بھی ثابت کر دیا تھا کہ وہ شہید سید میر نور سراج الدولہ کے جانشین ہیں۔ فٹ بگھل ٹائیگر نے اپنے جسموں کی آہنی دیواریں بھارتی سولہوں کے سامنے جن دی تھیں۔ وہ عمل و عزم کی ایسی ناقابل تفسیر دیوار بن گئے تھے جس سے سرخ پنج کر چاکلیہ کے خونخوار چیلوں کے زہریلے عزم ترخ گئے تھے۔

مجھے وہ بوڑھی عورت یاد آگئی جو بھلت دہل لے کر جیسور کی سرحد پر سورج زن اللہ کے شیروں کے پاس آئی تھی۔ اس نے سسکیں لے کر بتایا کہ اس کے بچے صبح سے بھوکے ہیں، شام کو بوڑھا چلول لایا تو انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ پہلا حق ہمارے دل اور جان پر

ہمارے جیالوں کا ہے۔

آج اسی بوڑھی ماں کے بچے جنہوں نے بھوکے ہوتے ہوئے بھی اپنے فوجیوں کے لئے کھانے سے انکار کر دیا تھا، ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے مکار ہندو نے محبت کی جھنجھ کو نچوڑ کر دہلی ندرت کی چنگاریاں بھردی تھیں۔

الٹی اتنی بڑی اور زبردست تبدیلی کیسے آگئی؟ کس نے سیدھے سادے ماں بھیس کو اپنے بھائیوں کے خون کا پیاسا کر دیا۔ وہ بھائیوں کے بچ کرودھ کی مضبوط دیوار کس نے چن دی۔ کس نے کپاس کا سونا پیدا کرنے والے کسان کے ہاتھوں سے تخلیق کی قوت چھین کر اسے فنا کے زہریلے ترشول تھما دیئے۔

سیالکوٹ سے ورنگار اکراڑے گئے پاکستانیوں کے قافلے جب جموں امیدوں کے سارے ٹکٹ پینچے تو ان کا استقبال منوجی کے صدیوں سے تربیت یافتہ بھیڑیے کرتے۔ پہلے ہی ہلے میں وہ ان کی شہ رگ سے سارا خون پی کر انہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر پھینک دیتے۔

پھر "کھلی" کے پجاریوں کا خونی رقص شروع ہو جاتا اور وہ بد نصیب نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے خونی جڑے کا فکا ہو جاتے۔ ان کی مصمتیں، غنچیں، خاک میں مل جاتیں۔ تاریخ خود کو دہرائے لگتی اور تقسیم کے واقعات دوبارہ زندہ ہونے لگتے۔

○○○

صبح اٹھ کر میں نے اشوک سے اجازت لی اور ایک قریبی مارکیٹ کا رخ کیا۔ وہ ہر تک جب میں واپس آیا تو میرے پاس اچھا خلصا آرڈر پر کاش کے لئے موجود تھا اور اگلے مشن سے متعلق ہدایات بھی مل چکی تھیں۔

حسب حکم قریباً تین بجے دہلی کے گھر جا کر بسواس کا ٹیکسٹر مضم کرنا پڑا۔ وہیں سے ہم لوگ دو دو کی ٹولیوں میں ایک تفریح گھر میں پہنچے۔ تفریح گھر سمندر کے کنارے بٹائی گئی تھی جس میں ایک لانچ ہمارے لئے تیار کھڑی تھی۔ اس علاقے سے متعلق میری معلومات صفر تھیں۔

جس وقت ہم اس جزیرے میں پہنچے، سورج سمندر کے کمرے پانیوں میں ڈوب رہا تھا۔ یہ جزیرہ غیر آباد و کھلی دے رہا تھا۔ مختلف سمت کھڑی پٹی گیروں کی پھیلیاں پکڑنے والی لانیوں سے یہ احساس ہوتا تھا جیسے یہ جزیرہ یہاں پھیلیاں پکڑنے والوں کا وقتی مسکن ہے۔ بعد میں میرے علم میں یہ بات آئی کہ یہ لوگ نیکل ہاؤس ہی تھے جو پٹی گیری کے بجائے یہاں قیام کرتے تھے اور یہ جگہ ایک طرح سے ان کے ٹرننگ سینٹر کی حیثیت رکھتی تھی۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ علم ہوا کہ تحریری کارروائیوں کی انسٹرکٹر جانا ہے میری طرح یہاں تین اور نئے ”شکار“ بھی موجود تھے۔ ہم چاروں کو جانا پڑا ہوتا تھا کہ استعمال کرنے سے متعلق بتانا شروع کیا اور جب عملی مظاہرے کا وقت آیا تو میری کارکردگی اس سے بھی بہتر تھی۔ پہلے ہی روز میں نے انہیں ”دستی ہم“ بھی استعمال کر کے دکھایا۔ ان باتوں کا تذکرہ میں اشوک سے لدھیانہ میں کر چکا تھا اور ان لوگوں کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ میں نے یہ سب کچھ باغی میں سیکڑوں کے ایک گروہ سے وابستہ رہ کر سیکھا تھا اور بوقت ضرورت میں اس سے بھی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکوں گا۔

پہلے ہی روز کی کارکردگی نے ان لوگوں کو میری پوشیدہ صلاحیتوں کا قائل کر دیا اور بسواس کے حکم پر مجھے ہاتھ دھواہلی تسلیم کر لیا گیا۔ کافی دیر گئے تک ہماری ٹریننگ ہوتی رہی۔ ہمیں جھٹ کر حملہ کرنے اور بھاگنے سے متعلق بسواس نے خود تربیت دی۔۔۔۔۔ وہ ایک عجیب ہوا کمانڈر دکھائی دیتا تھا اور یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی تربیت کسی خاص فیرملکی انجینی نے کی ہے۔ وہاں موجود اسلحے کا تعلق بھی ایک خاص ملک سے تھا جو بظاہر تو حکومت بھارت کا یا رکار تھا لیکن اندر جانے اس کی جڑیں کانٹے میں مصروف تھیں۔

قریباً آدھی رات کے بعد ہماری تربیت مکمل ہوئی۔۔۔۔۔ ہمارے سونے کا بندوبست بھی اسی جزیروے میں کیا گیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد ملٹی گیروں کے ہمیں میں مختلف ٹولوں کی شکل میں ہمیں اسی طرح واپس لایا گیا جس طرح ہمیں وہاں پہنچایا گیا تھا۔ ساحل سمندر سے ہی ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچے تھے۔ اشوک پرانا کارکن ہونے کی وجہ سے خلاصہً ملکہ ہو چکا تھا اور مجھ سے صرف مطلب کی مشکوئی کیا کرتا تھا۔ وہ تو لوہ پر کمرے میں چلا گیا میں نے قریبی ہوٹل کا رخ کیا۔

اپنی تربیت کے مطابق ہوٹل میں میں ایک علیحدہ کیمپ میں بیٹھا تھا۔ یہ دوسرے درجے کا معمولی سا ہوٹل تھا لیکن یہاں زیادہ تر شرفاء کے لوگ ہی آیا کرتے تھے۔ ایک ہیرے کو میں نے چائے لائے کو کھل چائے اور ایک بند لٹافہ آکھٹے ہی مجھ تک پہنچے تھے۔ لفافے سے ایک چھوٹا سا راتھ برآمد ہوا۔ یہ میرے دوستوں کی طرف سے میرے لئے نیا حکم تھا جس کی تعمیل مجھے آج ہی کرنی تھی۔ میں نے تمام مقلات اور ہدایات کو ذہن نشین کیا اور کھنڈ کو لفافے سمیت تلف کر دیا۔

○○○

واپس اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے اشوک سے کہا کہ ایک واقعہ کار اچانک مل گیا ہے۔

اگر میں نے آج رات اس کے پاس قیام کرنے کی دعوت مسترد کر دی تو وہ خولہ خولہ شک میں پڑ جائے گا۔ اس لئے آج مجھے چھٹی پر ہی سمجھا جائے۔ اشوک نے حسب توقع مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں رات قیام مکمل کروں گا۔ وہ خود بخوبی تھا اور اسے علم تھا کہ بہت بڑی تعداد میں بخوبی لکھنے میں مختلف مقلات پر روزگار پڑ گئے ہوں جن اور دوسرے صوبوں میں ایک واقعہ کار بخوبی کا دوسرے سے ملنا اس کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگلے روز صبح ملاقات کا وعدہ کر کے میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

جانے سے قبل میں نے پراکش کے ہم یہاں سے موصول شدہ آرڈر اور مقلات لکھ کر خط پوسٹ کر دیا تھا۔ جس میں اسے کہہ دیا تھا کہ مل بذریعہ بلٹی بھیج دے۔ میں مقامی مارکیٹ میں دے کر پیسے وصول کر لوں گا اور واپس آ جاؤں گا۔ مجھے معلوم تھا اس عمل میں کم از کم دس ہندو دن لگیں گے اور اتنے عرصے کی سہولت ہی مجھے درکار تھی۔

پونم کو میں نے علیحدہ خط لکھا تھا جس میں باجی سے متعلق کی جانے والی جعلی کوششوں کی روایتوں سنائی تھی۔ اس کی بددلی کا رونا اور جلدی واپس کا وعدہ جس شدت سے وہ میری شہر تھی مجھے اس کا احساس تھا۔ میں نے اسے ماما اور موسیٰ جی کا دل بھلائے رکھنے کو خاص طور سے لکھا تھا کہ میری فیر موجودگی میں اسے کم سم رہ کر گھر والوں کو پریشانی میں مبتلا نہیں کرے۔

شام تک کا وقت میں نے اپنے ٹارگٹ سے متعلق مقلات کے تفصیلی مطالعے میں بسر کیا۔ فرار کے امکانات کا بھرپور جائزہ لیا اور رات کو قریباً دس بجے میں ساحل سمندر کے نزدیک ایک مخصوص مقام پر دکان آنے والے مقلات کا شہر تھا۔ میں نے سلاہاں زیب تن کر رکھا تھا اور اندھیرے کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ویسے بھی یہ ڈھلتے چاند کی رات تھی۔ سمندر میں بہت دور کہیں کہیں مختلف بحری جہازوں کی روشن جہازیں کسی قتل میں رکھے ننھے سے دھبے کی مانند دکھائی دیتی تھیں۔ یہ علاقہ بندرگاہ سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا اور کسی بھی وقت ساحلی محافظوں کے اس طرف آنے کے امکانات بھی موجود تھے۔ ٹھانسیں مارتے سمندر کی پر شور لہریں مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ساحلوں سے سرخس جھاگ اڑاتیں واپس اپنے پانیوں میں غرق ہو رہی تھیں۔ میں لہروں پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ جہاں سے ہندوستان کا باغی ابرہہ آ رہا تھا اور میرے ذہن کو مختلف دھاروں پر بہا رہا۔

کبھی تو میرے تصور میں مسلمان مفتوحوں کے وہ بحری بیڑے ابھرتے جو انہی سرکش موجوں کو چرتے سمندری طوفانوں سے ٹکراتے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آئے اور براہمنوں کے غرور کو پاؤں تلے روندتے انہی ساحلوں سے آگے بڑھ کر سارے ہندوستان پر چھا

گئے۔ ان کی شمشیر جلی گیر کچھ انداز سے جمادار ہوئی کہ بت منم غلوں میں سم سم گئے۔ سمندروں کی لہروں نے ان کی غلٹوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آہن پوش لکڑیوں کے سیلاب لہن کی جھلجھلاہٹ یلغار سے یوں ڈر کر بھاگے جیسے سورج کی تیز شعاعیں اندھیروں کو چلت جاتی ہیں۔ بلند دہلا اور مضبوط قلعے لہن کے جگر دھکھ لہروں سے دہل گئے۔ نخت اور غرور و تکبر کے بڑے بڑے لات و ملت لہن کے جذلوں کی شدت سے زمین بوس ہو گئے۔ انہوں نے مہارت کا طلسم پاش پاش کر دیا اور کل کے خونخوار پجاریوں کو وہ سستی سکھایا کہ ان کی جھوٹی تاریخ کو ان کے زعم سمیت غرق ہونا پڑا۔

تصویر کا اگلا منظر بدلتا تو جھیلی راہبوں کے بجزے ٹکٹے کے پانیوں میں ابھرتے اور سفید چمڑی والے سیاہ دلوں کے مالک سوداگر نظر آئے جو تاجر بن کر آئے اور لیرے بن کر یسلی قابض ہو گئے۔ سیمکلی کے روپ میں انہوں نے ایسی ایسی نشترنی کی کہ تاریخ کے سینے میں سیاہ ٹھٹھ ڈال دیا۔ تیسو میر اور سراج الدولہ ایسے ہزاروں شہیدوں نے اپنے مقدس خون کا نذرانہ انہی ساحلوں کی نذر کیا تھا۔ اس دھرتی نے کتنے شہیدوں کا خون پیا اور پیا کی پیاسی ہی رہی۔ آج بھر چانکیہ کے خانخوار بھیڑیے انہی ساحلوں سے اٹھ اٹھ کر پورہ پاکستان کی تقدس مآب دھرتی کا رخ کر رہے تھے۔ لو کی چلت ان کو کشل کشل اس طرف بٹائے لئے جاری تھی۔

○○○

قریباً دو گھنٹے مجھے یہاں ہونے کو آئے تھے۔ میں بار بار جبل سے اپنے ہاتھ پر بندھی گھڑی کی سوئیوں کا جائزہ لیتا اور دوبارہ میری نظریں سمندر کے پر شور لہروں پر محیط ہو جاتیں۔ دو گھنٹے کے مبر آزما انتظار کے بعد امید کی کرن اندھیرے میں اُس تاریخ کی روشنی بن کر ابھری جو ایک سینہ سے جو ساحل سے آگیا تھا چکی تھی۔ یہ سینہ صرف اس لحاظ سے تھا کہ اس میں ایک انجن فٹ تھا اور نہ تو کشتی ہی تھی اور میرے خیال کے مطابق آنے والوں نے اس کا انجن کچھ فاصلے پر بند کر دیا تھا اور وہ اسے چھوڑ کر لہروں کی مدد سے یہاں تک لائے تھے۔

تاریخ کی سبز روشنی تین بار وقفے وقفے سے جل کر بجھی تھی۔ جواب میں 'میں دھڑکتے دل سے اپنی جگہ سے باہر نکلا اور ساحل پر پہنچ کر جواب میں وہی "سنگل" دہرایا۔ سنگل موصول کرتے ہی میں نے سینہ کو کنارے کی طرف بڑھتے دیکھ میں وہیں ساحل سمندر پر زمین سے چپکا آنے والے واقعات کا پتھر تھا۔ اندھیرے میں ایک سلسلے کو میں نے اپنی طرف بڑھتے دیکھ میرے دائیں ہاتھ میں پکڑے پستول کے دتے پر میری گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی۔

نوار دہنے یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ میرے قریب پہنچ چکا ہے۔ تیز سرگوشی میں "کوڑو روڈ" دہرایا۔ جواب میں میں نے بھی زمین سے اٹھتے ہوئے اسے مخصوص جواب دیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے آنے سانسے کھڑے تھے۔ نین میری طرح اس نے بھی اپنا چہرہ کچھ اس طرح چھپا رکھا تھا کہ سوائے ہماری آنکھوں یا ماتھے کے کچھ بچے کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر ہم نے کوڑو روڈ کا تہلوہ کیا اور مطمئن ہوتے ہی آنے والے نے اپنی جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر ایک سرسبز لہاف میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لہاف وصول کرتے ہی اسے اپنی جیکٹ میں محفوظ کر لیا۔ ابھی بمشکل ہم نے یہ عمل مکمل کیا تھا کہ فضا میں اچانک بولس کے انجنوں کی زوردار آواز گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی سمندر میں اس جگہ سے کچھ فاصلے پر کھڑے جہاز کی لوٹ پٹے سے دو تیز رفتار بولس بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ہماری طرف بڑھتی نظر آئیں۔

"خدا حافظ!" میں نے اپنے ساتھی کی پیٹھ پر جھکی دی۔

"مگڑ لک!" اس نے بھی جواب میں وہی عمل دہرایا۔

اس کے ساتھ ہی میں اندھیرے میں ریگ گیلہ ابھی بمشکل چند گز ہی بھاگ پلا تھا کہ میرے عقب میں بخوی کی ہشتی گن بوٹ پر نصب ا۔ بیلی فائر سے "ہٹ" کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی میرے تعاقب میں سرچ لائٹ کی تیز روشنیاں بھی لپکیں۔ "ہٹ" کی گوبدار آوازوں کا گلا فائرنگ کی سٹٹ سے ٹوٹ میرے دوست شاید ساحل پر پوزیشن لے کر انہیں آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ اس طرح اصل میں وہ مجھے یہاں سے نکل جانے کا موقع فراہم کر رہے تھے۔

فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی اگر میں بھاگتا بھاگتا زمین بوس نہ ہو جاتا تو گن بولس کی طاقت و دشمنی گنوں سے میرے تعاقب میں آنے والی گولیاں مجھے چلت جاتیں۔ میں نے انہی ساحلی جہازوں میں چلائی لگائی تھی جن میں کچھ دیر پہلے میں چھپا تھا۔ اندھیرے میں سرخ شعلے ایک قطار کی صورت میں سر سے کچھ اوپر دائیں بائیں سے گزرتے مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میرا دل اپنی تیز ترین دھڑکنوں کے ساتھ جلنے کیسے ابھی تک میرے پہلو میں موجود تھا۔ کلوں میں فائرنگ کی زوردار آوازوں سے زیادہ شوں شوں اور شائیں شائیں گونج رہی تھی جو عموماً ایسے ماحول میں دل و دماغ کو گھیر لیتی ہے۔ ہتھیلیاں پیسے میں بھیک رہی تھیں۔

لیکن! یہ ساری وقتی کیفیت تھی جو صرف چند لمحوں کے لئے مجھ پر طاری ہوئی اور جب چند سیکنڈ بعد میرا ذہن بیدار ہوا تو سب کچھ خلاؤں میں کھو گیا۔ اب میں تھا اور میری

میری شرابوں میں انگارے ترپنے لگے تھے۔ خطرے کے احساس نے ساری توانائیاں مجتمع کر کے مجھ میں سمو دی تھیں۔ میری آنکھیں آگ اگلنے لگیں اور جسم میں ایسی پھرتی سامنی کہ جیسی جلے کے وقت پیتے میں ساجاتی ہے۔ جھاڑیوں کی لوٹ میں لڑھکنا، کوٹھیں بدلتی، اٹھ اٹھ کر بیٹھا اور بیٹھ بیٹھ کر اٹھا میں بمشکل تین چار منٹ کے بعد ان کی ریچ سے نکل چکا تھا یا کم از کم اس پوزیشن میں آ گیا تھا کہ اٹھ کر تیز رفتاری سے بھاگ سکوں اور اگلے چند منٹوں میں 'میں' دوبارہ وار اپنے ذہن میں حفظ شدہ ایک سمت کا تعین کر کے بھاگ رہا تھا۔ اس اثناء میں کچھ سائے بھی مجھے اپنے دائیں بائیں بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہی دوست تھے جو اپنا سینٹر پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

میری سماعت بھاگتے بھاگتے ایک زور دار دھماکے کی آواز سے لرزی اور میں لڑھکنیں کھا کر گر پڑا۔ یہ اس ہائیم بم کا کرشمہ تھا جو میرے ہوائیوں نے اپنے سیر میں نصب کر رکھا تھا۔ ایسے ہائیم بم گھیرے میں آ جانے کی صورت میں سنگر اپنی لائچوں اور سینٹر سے بھاگتے بھاگتے ان میں نصب کر دیا کرتے ہیں تاکہ بحریہ یا پولیس کو ان کے خلاف کوئی شہدہ ہاتھ نہ آ سکیں۔ ان لمحوں میں جب کوئی اچانک گھیرے میں آ جائے، عموماً ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور ہر شخص سوائے اپنی جان بچانے کے اور کسی بات کی فکر نہیں کرتا۔ ایسے حالات میں اپنے حواس قائم رکھنا اور بم نصب کرنا جان جو کھوں کا کام ہے لیکن ایسے جلبازی کے مظاہرے کلکتہ کے ساحلوں پر سنگروں کے ہاتھوں انجام پا جاتے ہیں، جب کہ میرے ساتھی بہر حال ان سے افضل تھے۔

○○○

میں سنبھل کر اٹھا اور دوبارہ اسی سمت میں بھاگنے لگا۔ زور دار دھماکے کی آواز نے مشین گنوں کی چیخ و دھاڑ توڑی دیر کے لئے خاموش کر دی تھی۔ اس مرتبہ جب دوبارہ انہوں نے چلاؤ شروع کیا تو 'میں' کی آواز میں پہلے والا غیظ و غضب نہ تھا۔ ہم پڑتے پڑتے قریباً دس منٹ کے بعد ہی ان پر سکتہ طاری ہو گیا لیکن میری رفتار میں ابھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں اسی تیزی سے دوڑ رہا تھا جس سے میں نے شارت لیا تھا۔ قریباً بیس منٹ تک دوڑنے کے بعد میرا جسم پیسے میں بھیک گیا اور میں بری طرح ہانپنے لگا۔

تحفظ کا احساس ہوتے ہی میں نے اپنی رفتار کم کر دی لیکن رکائیں۔ میں نے اب بھاگنے کی بجائے چلنا شروع کر دیا تھا اور اس سڑک تک آ پہنچا تھا جو شرکی طرف جاری تھی۔ قریباً پانچ منٹ کے بعد میری بے قابو سانسیں سکون آئیں، سڑک کے کنارے سے ہٹ کر میں اپنی

منزل کی طرف دوں دوں تھا۔ اس "پوائنٹ" پر پہنچ کر جو میرا مقصود تھا۔ میں نے اس لفافے کو "ڈیڈ ڈراپ" کر دیا۔

"لگات" کو محفوظ طریقے سے نخل کر دینے کے بعد میں خود کو خالص ہلکا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

"کلکتہ دن کو سوتا اور رات کو جاگتا ہے۔" اس سنے سنائے فخرے کی آج عملی تفسیر دیکھنے کو ملی۔ حالانکہ وہ سڑک جس سے میں گزر رہا تھا اتنی اہمیت کی حامل نہیں تھی، پھر بھی ہر آنکھوں دسویں منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی سواری اس پر سے گزر رہی تھی۔ ان میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو سرشام ہی ساحلی علاقوں میں بنی کلب نما تفریح گاہوں کا رخ کرتے اور رات کے دوسرے پہر جب شراب اور شباب کی تپانہ کاریوں سے غرعل ہو جاتے تو اپنی اپنی کمین گاہوں کو واپس پلٹتے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد بد قماش اور سنگسار ہائپ لوگوں کی ہوتی تھی۔

مجھے پیدل چلتے اب ڈیڑھ دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے اور شراب بھی خالص دور تھا۔ اب سڑکوں پر پیدل لوگ بھی گرانے لگے تھے کیونکہ میں اس علاقے میں داخل ہو چکا تھا جس کو عموماً "ملاحوں کے لئے شراب خانے بنے ہوئے تھے۔ ایک "بار" کے سامنے جا کر میں ٹھہر گیا۔ باہر لٹکے نیون سائن سے یہی دکھائی دے رہا تھا کہ کوئی شرفانہ قسم کی بار ہے لیکن اندر گھستے ہی اپنی محفل پر ماتم کرنے کو کوئی چالہ میں یہاں محفل اس لئے آ گیا تھا کہ چند منٹ بعد جب باہر لٹکوں تو میرے پاس "پوچھ کچھ" کا جواز موجود ہو گا لیکن اب لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ یہ "بار" کسی "ڈولوا" کی زد میں آئی ہوئی تھی اور اس کے گرد گھٹکے کو لوں میں ڈیرے جملائے بیٹھے تھے۔ قریباً ہر دوسری میز پر جوا ہو رہا تھا۔

میں اندر داخل ہوتے ہی کچھ پریشان سا ہو گیا اور چاروں طرف خواہ مخواہ چور نظروں سے دیکھنے لگا۔ داخلے سے پہلے میں نے اپنی وضع قطع مقامی لفتکوں جیسی بنائی تھی، میرا گرہاں سامنے سے کھلا تھا اور گلے میں ایک سرخ رنگ کا رومل بندھا تھا۔ ایسے طیلے میں ہی ایسی جگہوں پر جایا جاتا ہے لیکن یہاں ایک بھول مجھ سے ہو گئی۔ جو میرا ذہن اس بات کی طرف نہ گیا کہ اس بار میں مقامی "ڈولوا" کا عمل دخل بھی ہو سکتا ہے جس کے لئے میں یقیناً اجنبی تھا اور کسی اجنبی "گڑھے" کا کسی مقامی "ڈولوا" کی حدود میں گھر آنا ایسی خطرناک سرحدی خلاف ورزی تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

"ابے کیا دیکھتا ہے۔" میری گدڑی پر پڑنے والے زوردار ہاتھ نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں بلہ! پرہی آدی ہے ایدھر سلا ایسے ہی آگید“ میں نے اپنی لخت مناتے اور قریباً ڈرتے ہوئے اسے موئے تازے کمرے کا شکل شخص سے کہا جو میرا مطلب تھا۔

”کیا بکنا ہے“ دادا کو کھل دیا ہے سلا!“ شراب کے نشے سے دمت ایک غنڈے نے لڑکھڑاتے ہوئے میری طرف بڑھنا شروع کیا اب پانی سر سے اوپر ہو چکا تھا کیونکہ آنے والے کے ہاتھ میں وہ مخصوص چابک نظر آ رہا تھا جو مقامی بد معاشوں کا طرز امتیاز ہے۔ جیسے ہی وہ میرے قریب چابک لہراتا ہوا پہنچا، میری دائیں ٹانگ اور اٹنی“ کچھ تو اس کی ڈنگا گھٹ اور اوپر سے میری زوردار لات جس نے تھپٹی پر گلتے ہی اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے اور وہ چابک سمیت لٹ کر پیچھے جا گرا۔ بار میں موجود ہلتی لوگ اس دور این سٹنس روکے دم پر ہلکنی جمائے بیٹھے رہے۔

اس کے گرتے ہی ٹککتے کے بد معاشوں کے پاس موجود ایک خاص دضع قطع کے چاقو کی کڑکڑاہٹ کو گنجی لور دوسرے ہی لمحے کو نئے والی میزوں سے دو غنڈے اٹھ کر خطرناک ارادے سے میری سمت بڑھنے لگے۔ محلہ دو ہی غنڈوں کا ہوتا تو میرے لئے کوئی بات نہیں تھی لیکن پہلے تو قدم قدم پر خطرات موجود تھے۔ میں نے پھرتی سے ہستول نکالتے ہوئے انہیں لٹکارا۔ آگے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رک گئے 'اپنے پہلو میں کھڑے موٹے کو میں نے بے خبری میں اتنی زور دار لات رسید کر دی کہ وہ لٹکڑاتا ہوا سامنے رکھی میز سے ٹکرا گیا اس اثناء میں 'میں دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا میں نے ایک فائر بڑے سے بلب پر کیا اور میں سوچ آف کر کے پھرتی سے باہر نکل گیا۔ میرے پیچھے دیکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میرا سب ہار کے ایک کونے میں گھڑی جیسی کی طرف تھا جس کے دروازے سے ٹپک لگائے ایک مرہل سا ڈرائیور کسی سواری کا خنجر تھا۔
 ”جگہ ہاں۔“ میں نے اس کے قریب پہنچے ہی کہا۔

"لوھر نہیں جلے کامب۔" اس نے بڑی نخوت سے جواب دیا۔
 "کیا بک۔۔۔ چلو۔" میں نے پستول اس کی طرف نہراتے ہوئے اُسے دوچار لایاں بک
 دیں۔

”چلے گامب، چلے گم۔“ اس نے خوف سے قہر کھراتے ہوئے جواب دیا۔
دوسرے ہی لمحے ہم دونوں اندر تھے۔ خیریت مگر دی گاڑی کا انجن ٹھیک ٹھاک تھا اور پہلے ہی ایکشن پر شارت ہو گئی۔ جس وقت ڈرائیور نے میسر بد لا تو بار کے دروازے سے ایک طوفان بد تمیزی زوردار آواز میں گھایاں دتا۔ لمودار ہو رہا تھا۔ خوش قسمتی سے وہاں کوئی سواری نہیں تھی۔

در نہ مجھے یوں بچ کر کوئی نہ جانے دے۔
 ”تیرا چلو“ تیرا“ میں کچھلی سیٹ سے ذرا نیچے کو دھمکا تا رہا وہ پوری رفتار سے عکس بھاگا رہا۔
 قتل۔

پولیس کی کسی حشٹی جیب سے ٹکراؤ کا کسی بھی وقت امکان تھا۔ غنڈوں کے تعاقب کا خطرہ بھی موجود تھا۔ ایک آہلی کے نزدیک پہنچ کر میں نے ٹیکسی روکنے کا حکم دیا۔ اس کی توقع سے بڑھ کر نوٹ اس کی طرف پھینکے گئے اور اسے فوراً ٹیکسی وہاں سے بھاگنے کو کہہ دیا اور کبھی تو دونوں کی طرف دھکا تھا کبھی جراگلی سے میری طرف۔ اسے مجھ سے ایسے سلوک کی توقع ہرگز نہ تھی۔ ”شکریہ صلب“ کہہ کر اس نے ٹیکسی بھاگ دی۔

میں بجائے آہوی میں گھسنے کے اس کی مخالف سمت میں چلنے لگا رات گزارنا میرے لئے مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ پولیس کی نظروں سے چھپ چھپا کر کسی نہ کسی طرح میں نے وہ رات بسر کی اور دوپہر کے نزدیک اپنے شریفانہ چیلنے میں واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تھا لیکن شاوک کی بجائے میل ایک اور شکل نے میرا استقبال کیا۔ یہ تھی سجادہ۔!

”کمل رہ گئے تھے؟“ اس نے پھٹے ہی پوچھا۔
 ”اس بات کا جواب دینا کیا ضروری ہے؟“ میں نے اسی لہجے میں جواب دیا۔
 ”ہاں کیوں اس لئے کہ ہم اپنے کامیڈ کے متعلق جاننے کا حق رکھتے ہیں۔“
 ”میرا خیال ہے ابھی تک کسی نے مجھے پرائیویٹ لائف کے متعلق بھی روز پانچ درج
 کروانے کو نہیں کمل۔“

”مسٹر پکاش آپ ڈسٹن کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔“
 ”سنا، آپ میرے پٹے میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑا رہی ہیں۔“ میں نے دوبارہ جواب دیا۔
 چند لمحوں تک وہ ہنسنے لگی تھی۔ میں بھی ہنسنے کی طرح منہ بھلائے کھڑا رہا۔

”ٹھیک ہے ابھی نئے آئے ہو جلد ہی تمہیں علم ہو جائے گا کہ سینئرز کا احترام کرنا
 چاہیے۔“

”مجھے اس بات سے انکار کب ہے کاریڈ۔ آپ مجھے تحریک سے متعلق کوئی بھی علم دیں“ میں قہقہے کر رہی تھی۔

باردھان سے متعلق پہلے سے تربیت یافتہ ہونے نے اسے ہر حال کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔
”کامریڈ براہمت ماننا۔“ اس نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
”آل رائیٹ۔“ میں نے کندھے جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

”اوکے۔ جیسی تمہاری مرضی۔“ کہہ کر وہ کمرے سے لمعہ رسوئی میں چلی گئی۔

تین دن تک یہی معمولات رہے۔ دن کو بیکھر ہضم کرنا پڑتے اور رات کو وہی ٹھانسی ٹھانسی اور دوسری تحریب کاری کی ٹریننگ۔ مارشل آرٹ سے اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار میں نے ان کے سامنے پہلے ملاقات ہی میں کر دیا تھا اور دوران تربیت ان کے کہنے پر تین چار مرتبہ اس کا عمل مظاہرہ بھی کیا تھا۔ سہانا کے رویے میں اب خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ میں نے اس کی نظروں میں اپنے لئے احرام اور محبت کے طے جے جذبات سوچنا دیکھے تھے۔ وہ دوسروں کو تو اسی لمحے میں غائب کرتی تھی جس کی وہ علوی تھی لیکن میرے ساتھ گفتگو کرتے وقت وہ سنجیدہ ہو جاتی تھی۔

○○○

اگرچہ میرے ”مقامی“ دوستوں نے مطلع کر دیا تھا کہ جو کالنا میرے بیٹے میں پوست ہے۔ اس سے نجات کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ جیسے تیسے بھی ہو شیمام بنیرجی کا پتہ کٹ دیا جائے! تو پھر۔۔۔۔۔ مریض کے زخم کسی حد تک مندمل ہو سکیں گے۔

شیمام بنیرجی کلکتہ کے مقامی دلالوں کا سب سے بڑا خریدار تھا۔۔۔۔۔ مشرقی پاکستان سے اغوا شدہ بد قسمت لڑکیوں کا سب سے بڑا بیوپاری۔ وہ کلکتہ کے شاہک ایکسچینج کا پریذیڈنٹ بھی تھا اور ماسجلی غنڈوں کا مقامی سربراہ بھی!

وہ بھارتی حکام کی مدد سے کوڑیوں کے مول اس بل کا سودا کرتا اور پھر ان بد بخت لڑکیوں کو بڑے منظم طریقے سے مشرق وسطیٰ کی منڈیوں میں فروخت کرتا۔ اس کام میں ماسجلی غنڈے اپنے سربرلو کا پورا پورا ساتھ دیتے اور وہ کتنی ہانسی سے مل کر اس کاروبار میں معقول منافع کما رہا تھا۔

۔۔۔۔۔ اس طرح حاصل شدہ آمدنی کا آدھا حصہ مشرقی پاکستان کی تحریبی کارروائیاں سرانجام دینے والوں کو دے کر وہ حکومت کا قرب بھی حاصل کر چکا تھا۔ دولت اور عزت حاصل کر کے اس نے حکومتی ایوانوں میں اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ جس سے کئی پولیس والے اس کا پانی بھرنے لگے تھے اور وہ خود بھی اٹھلی جنس کا بیٹو بن گیا۔ اب اس تک ”رسلٹی“ کیسے؟
۔۔۔۔۔ یہ فکر دن رات مجھے پریشان کرنے لگی تھی اور راستہ مجھے کوئی نہیں دکھائی دیتا تھا۔۔۔۔۔

میرے اندر شیمام بنیرجی کے خلاف نفرت کا جو لاداکھول رہا تھا اگر وہ جلد نہ پھٹ جاتا تو ایسے زہریلوں کی صورت اختیار کر لیتا جس کے ہاتھوں میری روحانی موت واقع ہو جاتی۔ میں محمد بن قاسم نہیں تھا کہ اس کی طرح کسی مسلح خاتون کی پکار پر ”لیک“ کہہ سکے۔ زندگی نے نہ اتنے دسائل دینے اور نہ ہی وہ منصب سرفراز کیا۔ لیکن میرے لاشعور میں ابھی وہ جلد زندہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے پاکستان کی بوہنیوں کو اس درندے کے ہاتھوں غارت ہوتے دیکھا تھا۔ میں یہ سب کچھ لاکھ مصلحت کوش ہونے کے باوجود کیسے برداشت کرتا۔

قرہا! ایک ہفتے کی ٹریننگ کے بعد ہمیں مشن سونپ دیا گیا۔۔۔۔۔ پہلا مشن نے کامیاب خود اپنے لئے منتخب کرتے تھے اور محل ہی میں پھنسنے والے دوستوں کا چونکہ میں ہی گروپ لیڈر تھا اس لئے قرہ میرے ہم پڑا۔

ان لوگوں کا طریق کار یہ تھا کہ وہ نئے تربیت یافتہ کامریڈ سے ”انتخاب دشمن“ شخصیت کا انتخاب کرواتے اور اس شخصیت پر کونسل میں ہاتھ بٹھائی جاتی تھی۔۔۔۔۔ زیادہ تر اسی ہلت کا جائزہ لیا جاتا کہ: ”یہ انتخاب کیسے ذاتی مخالفت کا شاخسانہ تو نہیں؟“

اور ابھی میں ٹانشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ سہانا ہمارے کمرے میں آگئی۔۔۔۔۔ اس کے ہاتھوں میں کلکتہ دس کا ایک پلندہ تھا۔ وہ آتے ہی کہنے لگی۔

”پرکاش! اب آپ کے فائل امتحان کا بھی وقت آگیا۔“

”امتحان میرا کلکتہ میں ہو گیا ڈھاکہ میں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جواب تلاش کرنے لگا تو وہ بولی:

”۔۔۔۔۔ یہ لو! ان گفتگوں پر تین شخصیتوں کے نام درج ہیں۔ کونسل سے میں اجازت لے آئی ہوں! اب آپ بتائیں کہ۔۔۔۔۔ ان میں سے کس شخصیت کو آپ اپنے لئے منتخب کرتے ہیں۔“ میں نے گفتگو اس کے ہاتھ سے لے لے۔۔۔۔۔ اس میں تین نام درج تھے اور ہر ایک کے کوائف بھی اس کے ساتھ ہی قلمبند کئے گئے تھے۔ پہلا نام بنیرجی کا تھا، دوسرا سہاش بابو اور تیسرا۔۔۔۔۔ شیمام بنیرجی۔۔۔۔۔ میں نے اسی نام پر انگلی رکھ دی۔

وہ حیران ہو کر مجھے ٹٹولنے لگی لیکن۔۔۔۔۔ اس کے بارے میں یہ دلیل کافی تھی کہ وہ اٹھلی جنس کا بیٹو ہے اور پولیس والوں سے ساز باز کر کے اس نے کئی ہاتھوں کو مسلسل جلائی اور مل نقصان پہنچائے ہیں۔

سہانا میرے انتخاب پر مسکرائی۔ ”فکر نہ کرو۔۔۔۔۔ اس مہم میں میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔“

پرے مجمع میں کوئی کارندہ کر گزریں گے، ذرا مشکل ہی نظر آتا تھا۔
شیام، بنیرجی کی واپسی قریباً گیارہ بجے رات کو ممکن تھی۔ ہمارے دونوں مقامی کامریڈز ضروری سازوسلن سمیت سرشیام ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ جب کہ میں اور سہانا دس بجے کے قریب ایک بھاری بھرکم رائفل فیلڈ موثر سائیکل پر وہاں پہنچے۔ سہانا نے اینگو انٹرن لڑکیوں کا بیس بدل رکھا تھا۔ اس کے بیک نمائوے میں دستی اور دھواں پھیلانے والے بم موجود تھے۔ موثر سائیکل ذرا نیچے تک کا کھل میں نے اسے ابھی طرح دکھایا تھا اور اس سلسلے میں اس کی بے اختیار دوا بھی وصول کر لی تھی۔

آہدی سے کچھ فاصلے پر درختوں کے ایک جھنڈ کے نزدیک ہمارا ایک ساتھی پہلے سے ہی خھر تھا۔ اس سے تازہ ترین رپورٹ حاصل کر کے ہم نے اسے آگے بھیج دیا۔ سہانا کی ہدایت پر میں نے موثر سائیکل کو وہیں چھاپا دیا تھا۔ خود ہم دونوں بھی وہیں چھپ کر بیٹھ رہے۔ ایک کھلونا نما خٹا سا ٹرانسیر ہمارے پاس موجود تھا جس کی ریج بمشکل پندرہ بیس میل تک تھی۔ ایسے ٹرانسیر کلکتہ کے دوسرے درجے کے بد معاشوں کے پاس بھی عام طور پر ہوتے تھے۔ شیام بنیرجی جس ہائٹ کلب میں رنگ رلیاں منارہا تھا اس کے باہر ہمارا ایک اور ساتھی اسی قسم کے ٹرانسیر کے ساتھ موجود تھا۔ جیسے ہی شیام بنیرجی وہاں سے لکھا، اس کی اطلاع ہمیں مل جاتی۔ جس کے بعد ہی اصل میں ہمارا کام شروع ہوتا تھا۔

سہانا اور میں چپ چاپ ایک درخت سے ٹیک لگائے آنے والے حالات کے شہر تھے۔
”کیا محسوس کر رہے ہو؟“ اس نے بڑا ذوق منی سا فرما کر کہہ کر سکوت توڑا۔
”نارمل۔“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”کامریڈ میں اٹھیں (الذہب) ہوں۔ یہ میری پہلی مہم بھی نہیں، تمہیں بھی علم ہو گا کہ میں نے اپنے باپ کو اپنے ہاتھ سے گولی ماری تھی۔ مجھے کبھی احساس نہیں ہوا کہ میرا یہ فعل اچھا تھا یا برا۔۔۔۔۔۔“

”تمہارے پاس احساس کرنے کے لئے وقت ہی کمال ہے؟“ میں نے اسے ٹوکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو، میں بے حس ہو چکی ہوں۔ ذہنی اور جسمانی دونوں طور سے، لیکن آج مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ میرے ہاتھوں درجنوں کامریڈ تربیت پا کر نکلے ہیں۔ خود مجھے چار موز مدار نے تربیت دی تھی، لیکن جب سے تمہارے ساتھ ملاقات ہوئی ہے مجھے کچھ بے گلی سی لگی رہتی ہے۔ ایک عجیب طرح کا احساس کبھی کبھی ذہن پر چھا جاتا ہے۔ میں محسوس

اس نے نظریں مجھ سے ملانے کی کوشش کی لیکن میں سوچنے لگا تھا ایک آدمہ موڈی کے مر جانے سے مساجدائیں کا کچھ نقصان تو نہیں ہو گا، البتہ۔۔۔۔۔۔ پورہ پاکستان کی بچیوں کی قیمت کا سودا کرنے والے کو مزادے کر بیٹھا میں اس درد کا دلو کر سکوں گا جو میرے لئے سوہن روح بنا ہوا ہے۔“ اب میں وقت اور دن کا انتظار کرنے لگا۔

○○○

اسی روز لہ میاں سے ٹرک بلٹی بھی بذریعہ ڈاک موصول ہو گئی۔ پرکاش نے ایک لمبا چوڑا خط بھی اس کے ساتھ ہی لکھا تھا جس میں اس نے مجھ سے التجا کی تھی کہ میں بزنس کو پرہیز کر دوں اور کم از کم پورے نوٹس کے لئے ہی فوراً ”واپس لوٹ آؤں۔ اتمام حجت کے لئے اس نے بل بھیج دیا تھا۔

میں نے ٹرکوں کے لڑے سے پتہ کیا تو پنجاب سے دو دن کے بعد مل پہنچنے کی خبر ملی۔ میں نے پرکاش کو لکھ دیا کہ مل کی تقسیم اور مل وصول کرتے ہی میں واپس آ جاؤں گا۔ شیام بنیرجی کو بم کے دھماکے سے ہلاک کرنے کا پروگرام طے ہوا۔

بکسل بازی اگر چاہتے تو اسے گولی کا نشانہ بھی بنا سکتے تھے لیکن ان کا مقصد قتل سے زیادہ دہشت پھیلانا ہوتا ہے اس لئے عموماً وہ ایسے ہی طریقے اختیار کیا کرتے تھے۔ اس کی رہائش کلکتہ کی ایک جدید لور ملازن طرز کی کالونی میں تھی جو سمندر کے نزدیک محل ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ جہاں رہائش پذیر لوگوں میں سے کوئی بھی کوڑ پتی سے کم نہیں تھا۔ بنیرجی کو بھی دوسرے امیر لوگوں کی طرح کنکس بازیوں کا دھڑکا لگا رہتا۔ اس لئے اس نے اپنی کونٹری پر خصوصی پیرے کا بندوبست کر رکھا تھا۔

اس کی حفاظت حکومت کے آدمی نہیں بلکہ مساجدائی غنڈے کرتے تھے۔ کونٹری پر چڑھیں گئے پورہ لگا رہتا تھا۔

بنیرجی کو قتل کرنے کی مہم کی مکمل سہانا کو سونپی گئی تھی۔ اس کے ساتھ میں لور دو مقامی ورکر تھے۔ ہمارے پاس شیام بنیرجی کے معمولات کا ریکارڈ موجود تھا لور یہ ہلت ہادی صوابدہ پر منحصر تھی کہ ہم اسے کسی ہائٹ کلب میں مارنا پسند کرتے ہیں یا اس کے دولت خانے پر۔

سہانا نے میرے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد اس کے گھر کا انتخاب کیا تھا کیونکہ سہانا سسٹن علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں فرار کے مواقع زیادہ تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے دونوں ساتھی نے مجھے لور ایسی کسی بھی مہم میں وہ پہلی مرتبہ حصہ لے رہے تھے۔ ان سے یہ امید کرنا کہ وہ بھرے

ہوا۔ ”کم آن کاہرئہ“ اس نے ٹرانسپیرف آف کرتے ہوئے مجھ سے بڑے سرد لہجے میں کہا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور موٹر سائیکل کے پہلو میں لٹکے تھیلے سے شین مگن نکل کر اس میں میگزین فٹ کرتا ہوا واپس آہیلا۔ ہم دونوں نے وہاں سے اٹھ کر سڑک کے کنارے آگے جھانپوں میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ بنسری کے تقارب میں ہمارا ساتھی بھی آ رہا تھا۔ اس نے ہی ہمیں بنسری کی گاڑی کی نشاندہی کئی تھی۔ یہ سڑک کچھ زیادہ آبلو نہیں تھی کیونکہ یہ کلہنی کو آنے اور جلنے کا راستہ تھا۔ عام شاہراہ نہیں تھی۔ ہماری موجودگی کے دوران بمشکل دو یا تین کاریں یہاں سے گزریں تھیں۔

دھڑکتے دل کے ساتھ سڑک پر نظریں جمائے شین گمن خانے میں جاتا کے ساتھ نیبری کا خنجر تھل جب سڑک پر بہت دور روٹھیاں جھگڑائیں۔ اس کے ساتھ ہی سب آوازانیسیر جاگ۔
 ”آ رہا ہے،“ کاریں دو ہیں۔“ مختصر سا پیغام ملو اور سلسلہ ختم۔

دوسری کار میں یقیناً اس کے لحاظ ہوں گے۔ سجاتا نے فوراً "دونوں مقامی ساتھیوں کو جو
میل سے کچھ فاصلے پر تھے اپنے نزدیک پہنچنے کا حکم دیا تاکہ مقابلے کی صورت میں مناسب برقرار
رہے۔"

زانیئر اپنے بیگ میں رکھ کر اس نے مقبوضی سے میرا ہاتھ دہرایا۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں اس لمحے سارے جہان کی عمریاں سمٹ آئی تھیں۔ مجھے وہ قاتل اور خوافر ڈائن کی بجائے کسی کانٹنٹ کی نضحی منی سی بچی دکھائی دے رہی تھی۔

کادیں اب لمحہ بہ لمحہ نزدیک آتی جا رہی تھیں۔ سجاتا میرا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے آگے کی طرف رینگ گئی۔ ہم دونوں میں اب قریباً ”آٹھ دس گز کا فاصلہ ہو چکا تھا۔

جب اگلے کار اس کے نزدیک پہنچ گئی۔ یکے بعد دیگرے دو ہینڈ گرینڈ کار کے آگے پہنچے اور اس کے پرچے اڑ گئے۔

دوست سے کرا کر رک گئی۔ جاتا تیزی سے واپس میری طرف چلی لیکن ٹھوکر کھا کر گر گئی۔
 دوسری کار میں سوار لوگ تربیت یافتہ معلوم ہوتا تھے۔ بیزرچی کی جلتی کار کی روشنی میں میں نے

تین سالوں کو چلائیں لگتے دیکھا جنہوں نے زمین پر گرتے ہی تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح بوزیشین سنبھل لی تھیں۔ انہوں نے شاید سہانا کو بھاگتے دیکھ لیا تھا۔ کے بعد دیگرے تین

گولیاں اس کی پشت میں لگیں اور وہ لڑکھڑاکر مجھ پر آ رہی۔

میں نے اپنے لیے پہلو بدلا اور شین گن کا فائر اس طرف کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے دونوں ساتھیوں نے قریب سے فائرنگ شروع کر دی۔ کارسواروں نے ہماری تعداد زیادہ دیکھ کر جن پچانے میں ہی غایت کبھی اور بھاگ اٹھے۔ دو بھاگتے ہوئے ماسجلی تو میری شین گن نے چلت لے لیے جب کہ تیسرے کو مارنے کی سعادت دوسرے کامریڈ نے حاصل کر لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سجاتا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر اٹھاتا چلا جو زمین پر لٹی کر رہی تھی لیکن سجاتا اٹھ نہ سکی۔ میں نے اسے کندھے پر لا دیا اور موٹر سائیکل کی طرف دوڑ لگا دی۔

موٹر سائیکل کے قریب پہنچے تک وہ نیم بیوش ہو چکی تھی۔ اس کے تمام کپڑے خون میں تر تھے۔ فائرنگ آٹومٹک رائفل سے کی گئی تھی جس کی گولیاں جسم میں گھسنے کے بعد بھتی ہیں اور اندرونی نظام کو کٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ میں نے اسے سارا دے کر اٹھان چلا لیکن سجاتا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ اب وہ اٹھنے کے قائل نہیں رہی تھی۔ میں نے سارا دے کر اسے درخت سے ٹیک لگا کر بٹھادیا۔ خود اس پر بٹھا تاکہ اس کے زخموں کا جائزہ لے سکوں۔

”پراکش! فہمو میری بات سنو، میرے پاس وقت کم ہے۔“ اس نے ٹیف سی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

”سجاتا حوصلہ کرو۔“ میں اس کے علاوہ اسے اور کیا کہتا۔

”پراکش! میں اب بچ نہیں سکتی، مجھے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ یہ میری آخری دم ہے۔ مجھے تم پر کوئی حق نہیں، میں بہت بری عورت ہوں۔ مجھے علم ہے پراکش تم مجھ سے نفرت کرتے ہو، میں ہوں ہی نفرت کے قائل لیکن مرتے وقت مجھے اقرار کرنا ہے کہ میں اپنی فطرت کے خلاف تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ یہاں سب نے مجھے کھلوا جان کر مجھ سے کھیلا ہے۔ تمہیں.....“ اس کی آواز لڑکھڑانے لگی، میری حالت خیر ہو رہی تھی۔

”سجاتا پر ہاتھ کے لئے ایسی بات نہ کہو۔۔۔۔۔ تم بہت گریٹ ہو۔ سجاتا تم نے عظیم انقلاب کے لئے.....“

”اپنے باپ کو مار ڈالو۔۔۔۔۔“ اس نے میری بات خود کھل کر دی۔

”نہیں پراکش! یہ سب کچھ اس ہے..... کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔۔۔۔۔ سب ذلیل لوگ ہیں دوسری حکومتوں سے مل کھاتے ہیں..... پراکش مجھے وچن دو تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔“ اس نے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر جتنی گاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں ہاں سجاتا! میں چلا جاؤں گا، میں تمہیں بھی.....“ میں نے تیزی سے کہنا چلا لیکن اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

”سارے جیون میں صرف ایک..... تمہیں..... آئے..... تھے“ وہ..... بھی.....“

اس نے ایک لمبے کے لئے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہنسی کے ساتھ اس کی اکھری سانسوں کا تپا پانا منتشر ہو گیا۔

میں ابھی تک پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ مرنے کے بعد اس کی تمام کڑنگی اور نخوت ختم ہو چکی تھی اور اس کے چہرے پر طانت اور معصومیت سمٹ آئی تھی اور وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے اپنے ذہن کو جھٹکا دیا اور حقیقت کی دنیا میں واپس لوٹ آیا جہاں کسی بھی لمبے پولیس کی آمد متوقع تھی۔ میں نے ریزہ ریزہ دل کے ساتھ اس کو زمین پر لٹا کر اس کی تلاشی لی اور تمام اشیاء اپنی جیبوں میں ٹھونس لیں۔ اسے آرام سے زمین پر لٹا دیا تاکہ اس کی پرسکون خیمہ میں خلل نہ آئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی میں بڑے دکھی دل سے موٹر سائیکل کو اپنی محفوظ راستوں پر اڑائے لئے جا رہا تھا جو فرار کے لئے ہم نے پہلے ہی سے منتخب کر رکھے تھے۔ محفوظ ٹھکانے پر کامریڈ میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔

صبح کے اخبارات میں شیم، بنیربی کی موت کی خبر جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی اور۔۔۔۔۔ پولیس نے اس کی موت کا ذمہ وار بھی کس باڑیوں ہی کو ٹھہرایا۔

۔۔۔۔۔ اس خبر کے ساتھ ہی ایک گتہم لڑکی کی لاش کی تصویر بھی چھاپی گئی تھی جس پر پولیس نے مجرموں کی ساتھی ہونے کا شک ظاہر کیا تھا اور ہم نے بھی اپنی بنگالی مینگ میں اس بد نصیب حسینہ کی موت پر اسے خراج تحسین پیش کیا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے بھلا دیا۔

میرے اس پہلے ہی کارنامے نے اس حلقے میں میرا وقار بڑھا دیا اور میں یہ سوچنے لگا تھا: ”دیکھیں میرے لئے اب کون سا معاملہ تجویز کیا جاتا ہے؟“

ooo

دو تین روز بعد پراکش کے یہاں سے بلنیاں بھی موصول ہو گئیں اور میں نے مل چھڑا کر گاہکوں میں تقسیم کر کے اپنی جیسیں پیروں سے بھر لیں۔

دراصل اب میری تربیت تو مکمل ہو چکی تھی اور میں پنجاب واپس جا رہا تھا۔ روانگی سے قبل میں جیس سے ملنے گیا تو وہ کہنے لگا: ”کامریڈ! تمہیں اگلا مشن بھی سونپ دیا گیا ہے۔“ ”وہ کیا؟“

میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا تو اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ تھرکنے لگے۔۔۔۔۔

”وہ کیوں؟“

○○○

پرکش جس رفتار سے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھ رہا تھا اس پر سب کی نظریں تھیں۔
 مقامی مارکیٹ کی حد تک اس نے اپنا مقام بنا لیا تھا اور اب وہ اس قتل ہو چکا تھا کہ ہم سدرشا
 کے ہا سے اس کے رشتے کی بہت بات کر سکیں، لیکن بیوی کے جیل میں ہوتے ہوئے یہ ذکر
 کچھ عجیب سا بھی دکھائی دیتا تھا دوسری طرف اگر فن کی دہلی کا انتقاد کیا جاتا تو بہت بڑھکتی تھی۔
 جس طوفانی محبت میں وہ دونوں جلاتے دوسری جگہ شادی کی صورت میں اس کا نتیجہ دونوں کی
 چلتی کے علاوہ اور کیا نکل سکتا تھا۔

میرا جواب سن کر وہ قہقہہ بھائی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی دایہسی

جائے کے ساتھ ہوئی، لیے سرنے مجھے تھا والا تھا۔ رات کو جلد ہی میں نیند کی دیوی کی آغوش میں سا گیا اور میرا لاشعور ساری رات مجھے مشرقی پاکستان اور کلکتہ کے کئی کچوں میں کھانا رہا۔۔۔ سبانا ابھی تک میرے حواس پر سوار تھی۔ ایک مہاجرین کے درندے کو موت کی نیند ملانے کے بعد اب مجھے اپنا آپ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا تھا۔ میرے انتقام کی آگ تو شاید کبھی سرد نہ پڑ سکے، لیکن ایک طمانیت سی ضرور محسوس ہونے لگی تھی۔

○○○

صبح بیدار ہو کر بٹالتہ کرتے ہی میں نے لدھیانہ کا رخ کیا۔ "دوستوں" کو اپنی آمد سے مطلع کر کے میں نے مقامی تحریک سے رابطے کی ٹھانی جمل میرے متعلق اطلاعات پہنچ چکی تھیں۔ سوای دیانند ابھی تک گردش و دراز کا شکار تھا۔ سوائے اس کے اندھے عقیدت مندوں کے اور کوئی بھی اس کے آشرم کے نزدیک پھٹکنے کو تیار نہیں تھا۔ تنہا باڑی است مارنے پر کیوں تلے تھے؟ اس کی کوئی خاص وجہ میری سمجھ میں نہ آ سکی سوائے اس کے کہ وہ اسے زیرِ عتاب دیکھ کر کوئی پرانا قرضہ چکانے کے چکر میں نظر آ رہے تھے۔ کیونکہ سوای جی ت یہ بعید نہیں تھا کہ انہوں نے تحریک کو نقصان پہنچایا ہو اور کنس باڑی اپنے مجرموں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ اس بات کا اندازہ میں نے قیام کلکتہ کے دوران ہی لگا لیا تھا اگر حالات ان کے خلاف ہو جائیں تو وہ تھوڑی دیر کے لئے دم سلوہ لیتے ہیں لیکن اپنے قول سے ہٹے ہرگز نہیں اور موقع کی ناک میں رہتے تھے۔ پھر جب ذرا سا بھی موقع ملتا وہ اپنا کلام کر گزرتے تھے۔ اُن کی اس علت کے پیش نظر ان کی دہشت سے بھارت کے دروہام کانپ رہے تھے۔ ایسے تمام لوگ جو ان کی بلیک سٹ میں آجاتے۔۔۔۔ ان کے لئے زندگی اجیرن ہو جاتی تو تھیکہ موت کا بے رحم پنجہ انہیں نہ دبوچ لے۔

خفیہ ٹھکانے پر میرا استقبال اُسی سکھ کامریڈ نے کیا جس نے مجھ سے پہل ملاقات کی تھی۔۔۔ منوہر سنگھ کو میرے متعلق خفیہ ہدایات پہنچ چکی تھیں اور یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ میں تحریک کے بیڑوں کی نظر میں محض ایک کارنامہ انجام دینے کے بعد ہی آچکا ہوں۔ اس کے استفسار پر میں نے بتایا کہ میں سوای جی کے درشن کر چکا ہوں۔

"اب مہاتما کے پرلوک سدھارنے کا بندوبست بھی آپ ہی کریں گے کامریڈ۔" اس نے سکرارتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے ناپرواہی سے جواب دیا۔

چائے کا دور مکمل ہوتے ہی اشوک بھی وہیں آگیا اور ہم تینوں سر جوڑ کر سوای جی کی

"پرلوک یا ترا" کا پروگرام طے کرنے لگے۔ ایک متفقہ فیصلے پر پہنچنے کے بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے سے گرجوٹی سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ ہمارا پروگرام اگلے تین روز کے بعد طے پایا۔

○○○

دو روز کے بعد بلوچی سے ملاقات کا دن آ رہا تھا جس کا مجھے بڑی بے چینی سے انتظار تھا کیونکہ اسی روز مجھے دو اہم باتوں کا فیصلہ کرنا تھا۔ کنس باڑیوں سے تعاون جاری رکھنا اور پرکاش کی شہولی کا فیصلہ کرنا۔

منوہر سنگھ اور اشوک سے ملاقات کر کے میں نے بجائے کسی سواری کے پیدل ہی پرکاش تک جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ لدھیانہ چھوڑے ایک ماہ قریب ہونے کو آیا تھا اور حالات اتنی ہیجڑی کے ساتھ بدل رہے تھے کہ اگلے ہل کا ملن نہیں ہوتا تھا کہ اب کیا ہو جائے؟ عوامی سوچ کے دھارے بھی حالات کے ساتھ ہی بدلتے ہیں اور بھارتی جتنا کے دھاروں سے آگہی حاصل کرنا میرے لئے اتنا ہی ضروری تھا جتنا کھانے کے ساتھ پانی پینا۔

میں مائارائی چوک کے قریب ایک ہوٹل میں جا گھس۔ یہ علم سا ہوٹل تھا جہاں عموماً سفید پوش قسم کے لوگ آکر بیٹھا کرتے تھے، لیکن اندر خلسے میں کیا ہوتا ہے اس کا علم مجھے اسی روز ہوا۔ ملائکہ اس سے پہلے میں کئی مرتبہ یہاں آچکا تھا۔۔۔ اس ہوٹل میں زیادہ تر مقامی دفاتر کے کلرک وغیرہ آکر بیٹھا کرتے تھے اور ایسے لوگوں کو سیاست میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی ہوتی ہے اور اپنی معلومات جتانے کو شوق بھی یہاں عموماً ایسی باتیں سننے کو مل جاتی تھیں جو واقعی خفیہ فائلوں میں ہی درج ہو سکتی ہیں۔

میں تو اپنے چکر میں یہاں آیا تھا جب کہ یہاں ایک دوسرا چکر چل رہا تھا۔۔۔ میں نے ایک ایسی جگہ خفیہ کی تھی جس کے چاروں اطراف میزوں پر باہو لوگ لوہی اورچی آوازوں میں مصروف بحث تھے۔ بظاہر میں چائے کی چکیں لیتا ہوا اخبار کے مطالعے میں غرق تھا جب کہ میرے کان ان کی طرف لگے تھے کہ اچانک ایک طوفان بدتمیزی اندر گھس آیا۔ درجنوں کی تعداد میں پولیس کے مسلح جوانوں نے چھوٹے سے ہوٹل پر دھوا بول دیا۔ وہ مرکزی دروازہ جس کے ذریعے اندر آیا اور باہر جلیا جا سکتا تھا، اس پر تھانیدار اور اس کے ماتحت سپاہی رائفلیں تاننے کھڑے ہو گئے۔

دہلی موجود قریباً سبھی لوگ کچے کچے ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھور رہے تھے اور ابھی تک کسی کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔۔۔ سب سے پہلے میں ہی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ میرا

رخ سید حادروازے کی طرف تھا۔

”کی گل اے؟“ ایک حوالدار نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں مہاراج“ چائے پی لی اب گھر جائیں گے۔“ میں نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔

جواب میں اس نے مجھے تین چار گالیوں سے نوازتے ہوئے آگے بڑھ کر دھکا دیا اور میں اپنے ساتھ والی میز سے ٹکراتا ایک لالہ جی پر آ رہا۔ میرا خون کھول اٹھا لیکن صورتحال دیکھتے ہی دماغ ٹھنڈا ہو گیا اور میں بیگلی لمبی بن کر وہیں دیک گیا۔

تھوڑی دیر بعد فوج کے کیمپن سے چار آدمیوں کو فیجر سمیت دھکے دیتے ہوئے پولیس والے باہر لائے۔ یہ لوگ جو اکھیل رہے تھے۔ شاید اس ہوٹل میں کوئی بڑا منظم قسم کا چھاپہ پڑا تھا کیونکہ تھوڑی دیر بعد ہی پولیس دہلی موجود قریباً“ میں چکیں گا کہوں کو بھی دھکے دیتے ہوئے باہر لائی اور مجھ سمیت سب کو ایک قیدیوں والی لاری میں ٹھونس کر عازم تھانہ ہو گئی۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے پیش آیا کہ میرا ذہن ہی ایک طرح سے لٹوف ہو کر رہ گیا۔ بھرے پرے بازار سے بھاگنا سوائے محلات کے کور کیا معنی رکھتا تھا۔ میں نے بدلتی خواست اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا۔

میرا خیال یہی تھا کہ پولیس وہاں صرف ملزموں کو بند کر کے باقی لوگوں کو رہا کر دے گی لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ نئے پولیس کپتان نے کارکردگی دکھانے کے شوق میں یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے اور نیک چلنی کی ضلالت، بیئے بغیر میں سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ خیریت یہ گزری کہ ابھی تک ہماری جلد تلاشی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ایک سپاہی کو آٹا اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔ دس دس کے دو نوٹ اس کی منی میں تھمائے جو اس کی اوقات سے بہر حال زیادہ تھے، لیکن اندر میں محلات اس سے کم میں کام بھی نہیں چل سکتا تھا۔

میری توقع کے مطابق اس نے مجھے موٹی آسامی سمجھا اور میری ”خدمت“ کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اسے پرکاش کی طرف دوڑایا اور مزید انعام کا ”لالچ“ بھی دے دیا۔ قریباً“ ایک گھنٹے بعد جب پولیس تمام گرفتار شدہ گھن کی جیسی خللی کر کے ان کو حوالات میں بند کر چکی تھی۔ پرکاش ایک وکیل کے ساتھ فرشتہ رحمت بن کر پہنچ گیا۔ اس نے تھکداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجسٹریٹ سے میری ضلالت قبل از گرفتاری بھی کروائی تھی، لیکن اس کی نوبت نہ آئی اور تھانے دار نے میری جلد تلاشی سے حاصل شدہ دو سو روپے اور مزید ایک سو روپے لے کر مجھے اس فصیت کے ساتھ رہا کر دیا کہ میں آئندہ جو انیس کھیلوں گا۔

پرکاش کو یقین تھا کہ میں ایسی چیخ حرکت نہیں کر سکتا، پھر بھی میں اس کے سامنے نہ جانے

کیوں شرمندگی سی محسوس کرنے لگا۔

”خیریت تو ہے؟“ اس نے باہر نکلتے ہی پھٹتے ہوئے دریافت کیا۔

”خیریت ہی گزری درنہ ملاقات شاید جیل میں ہوئی۔“ میں نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔

”شریمان یہ شوق آپس میں کھیل کر بھی پورا ہو سکتا ہے۔“ اس نے مجھے پھینکتے ہوئے کہا۔

”یار بس اب کیا کوں، تمہارے سامنے ذرا شرم آتی ہے۔“ ہم دونوں تھکے لگا کر بٹس دیئے۔

میں نے اسے تمام واقعات سے آگاہ کرنے کے بعد درخواست کی کہ اس راز کو راز ہی رکھے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اگلے دن کے اخبارات میں جو کھیلے ہوئے پکڑے جانے والوں میں میری تصویر شامل نہیں تھی درنہ بعد میں یہ میرے لئے استثنائی نقصان دہ ثابت ہوتی۔

○○○

اگلے روز جب ہم سب نے بیوی سے ملاقات کی۔ میں نے ان سے علیحدگی میں گفتگو کر کے انہیں تمام واقعات سے آگاہ کیا اور اپنے کارنامے کا ذکر بھی کر دیا۔ بوڑھے کامریڈ نے میری بات سن کر مجھے حسین بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ جینز سے آشنا تھے، میں نے جان بوجھ کر انہیں اگلے مشن سے آگاہ نہ کیا۔ پھر گھر والوں کے سامنے ہی میں نے انہیں پرکاش کے متعلق تمام واقعات سے آگاہ کر دیا اور ان سے درخواست کر دی کہ وہ ہمیں پرکاش کی شکلی کی اجازت دے دیں۔ سب گھر والے میرے من کی طرف دیکھنے لگے۔ انہیں یہ امید نہیں تھی کہ میں یہ بات کہوں گا، لیکن میرا واسطہ ایک حقیقت پسند بوڑھے سے تھا جو کبھی یہ نہ چاہتا کہ اس کی وجہ سے اس کے بیٹے کی خوشی چھین جائیں۔ وہ خوشیوں جو ان سے روٹھ چکی تھیں اور ایک لمبی مدت کے بعد انہوں نے انہیں منایا تھا۔ بیوی چند لمحے تک کچھ سوچتے رہے پھر انہوں نے پرکاش اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی اجازت دے دی۔ سب نے بدلتی خواست اس فیصلے کو قبول کیا تھا۔

”دیر جی! آپ کی بات بجا لیکن یہ نیکل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ وہ لوگ بھی رشتے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ تم سدرشا کے پتا کو نہیں جانتے اور کچھ نہیں تو وہ بیوی کے جیل میں ہونے کا ہی بدلہ بنا لے گا۔“ پرکاش نے دابھی پر مجھے کہا۔

”یار تم یہ بات مجھ پر چھوڑ دو اور شکلی کے لئے تیار ہو جاؤ۔“ بھگوان نے چاہا تو ہم اسے سنایں لیں گے۔ ایک دفعہ وہ مل گیا تو بیوی کی رہائی کے بعد کوئی صورت نکلا لیں گے۔ فی المل

تو سدرشا کی زندگی کا سوا حل ہے۔ پھر تم ہی سے نہیں اس سے بھی میرا کوئی رشتہ ہے۔" میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہا۔

پرکاش نے بڑے جذباتی انداز میں میرا ہاتھ دبایا۔ اس کی آنکھوں میں تھکے کے آنسو چل رہے تھے۔ اس گئے گزرے دور میں کون کسی کے لئے اتنا تردد کرتا ہے اور ایک میں تھا کہ ان کی معمولی خوشیوں کا بھی خیال رکھتا تھا۔ بھلا میرے جیسا دھرم ویر پرکاش کو کبھی مل سکتا تھا؟ سدرشا کے باپ سے ملاقات کے بعد واقعی بڑے بڑے حوصلہ مند ہتھیار پھینک دیتے اور اس پر اکتا بھیج کر واپس چلے جاتے، لیکن میں نے تو ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ نہ تو اسے اپنی بیٹی کی پرواہ تھی نہ ہی وہ ہم دُنب کو اہمیت دیتا تھا۔ آخر میں اس نے رواجی مکاری سے کام لیتے ہوئے یہ کارڈ بھی پھینک دیا۔

"میرے پاس دھج (جیز) کے لئے ایک پھونی کوڑی نہیں ہے۔ اب بتاؤ منظور ہے رشتہ؟" میں ماتا جی اور پونم کو پہلے ہی اس سرطے کے لئے تیار کر چکا تھا۔ اس لئے ہم سب نے جھٹ ہاں کر دی۔ اب لالہ جی پکڑائے کہ یہ کیا ہو گیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے آخری دلو بھی کھیل دیا جس میں انہیں ہارنے کی ہرگز توقع نہ تھی۔

"شادی آٹھ دس روز کے اندر ہونی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں برادری والوں کو کہنے سننے کا موقع نہ ملے۔ اگر میں نے دیر کر دی تو وہ لوگ مجھے کبھی ایسا نہیں کرنے دیں گے۔" انہیں امید تھی کہ باہو جی چونکہ جیل میں ہیں اس لئے ہم ان کی رہائی سے پہلے ہرگز شادی کے لئے تیار نہ ہوں گے، لیکن اسی موقع کے لئے میں نے ان سے اجازت لی تھی۔

ہلتی لوگ تو خاموش رہے لیکن میں نے فوراً "ہاں" کہہ دی۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟" انہوں نے ماتا جی کو تذبذب میں جلا دیکھ کر کہا۔

"مجھے اپنے بیٹے کی موجودگی میں اپنے سوا کی کسی محسوس نہیں ہو گی۔" انہوں نے مکمل حوصلہ سے کام لے کر بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ پونم کے علاوہ خود میں اور موسیٰ بھی ماتا جی کے اس جواب سے حیران رہ گئے۔

"ٹھیک ہے اگلے روز میں صورت نکھو اگر مجھے تاریخ سے آگاہ کر دیں۔" لالہ جی بولے۔

انہیں امید تھی کہ ذات برادری کے لوگ اس فیصلے کی شدت سے مخالفت کریں گے کہ ہم اپنا دھن بھانہ نکس گے۔ اس طرح وہ اپنی نیپٹری کے سامنے بھی سچے رہیں گے اور رشتہ بھی اپنی مرضی سے طے کر سکیں گے۔ وہ بڑے پر امید تھے کہ اس بات کا نتیجہ وہی نکلے گا جو انہوں نے اپنے ذہن میں طے کر رکھا تھا، لیکن ہم نے اسی روز شام کو "شمن" کر لیا اور ماتا جی نے

سدرشا کو اپنی بیٹی قبول کر کے لالہ جی سے کہہ دیا کہ ہم انہیں ایک دو روز میں ہی دولا کی تاریخ سے آگاہ کر دیں گے۔ سدرشا تو شدت جذبات سے مغلوب ہو کر "بھیا" کہہ کر وہیں مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

○○○

واپسی پر ہم سب رائے کوٹ آگئے۔ میں نے ساگ رام کو بھی تھوڑی دیر کے لئے بلایا تھا۔ رات کو میں نے ان لوگوں کو تھیلوں میں ہم ہاتوں سے آگاہ کیا اور ان سے کہہ دیا کہ وہ یا تو اپنے بیٹے کی زندگی اور گھر کی خوشیوں کے حق میں فیصلہ کر لیں یا پھر مکمل طور پر عزیزوں کے طعنوں سے ڈر کر بیٹے کی زندگی اور گھر کی خوشیوں کو ہار دیں۔ رات کافی دیر گئے تک ہم باتیں کرتے رہے، پھر وہ لمحہ بھی آگیا جب تمام گھروالوں نے ہنسی خوشی میری بات مان لی۔

صبح ہم نے ہڈت کو بلوا کر صورت نکھو لیا اور اگلے "ششی دار" کو شہ گھڑی جلتے ہوئے اس تاریخ پر شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ہندو رسم کے مطابق فوراً "گھر میں ڈھولک بجتے گلی اور مکھ بھر میں خبر پھیل گئی۔ پہلے پل تو لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی، جب گھر سے کسی نے بھی اس بات کی پرواہ نہ کی تو لوگوں کی زبان بھی بند ہو گئی۔

پرکاش اور سدرشا تو میرے ہاتوں دھو کر پینے پر تلے تھے۔ ان کے تو کبھی وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میں سدرشا کے اڑیل باپ کو قہو کر سکوں گا۔ "ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ہالیکے۔" میں نے پرکاش سے کہا اور ہم سب قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

لالہ جی کو میں نے خبر کر دی تھی اور اس بات کا بندوبست بھی کر لیا تھا کہ انہوں اب بھی کوئی اڑچن پیدا کی تو ہم اس شادی کو "سول مہج" میں تبدیل کر لیں گے۔ گھروالے تو سب کچھ بھول بھلا کر شادی بیاہ کے ہنگاموں میں کھو گئے۔ جب کہ میں سواہی دوانند کی طرف متوجہ ہو گیا۔

○○○

مقررہ وقت پر میں 'اشوک اور منو ہر گھ کھل تیاری کے ساتھ سواہی دوانند کے آشرم کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہماری اطلاعات کے مطابق سواہی نے آشرم سے باہر نکلتا قریباً بند کر رکھا تھا لیکن آج بد قسمتی اسے آشرم سے باہر لے آئی تھی۔ ایک "دھارک ساگم" میں شرکت کے بعد وہ رات کو

کافی دیر گئے آشرم کی طرف واپس آ رہا تھا۔ جب اس کی کار مطلوبہ مقام پر پہنچی تو میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک بھاڑی کی اوٹ میں چھپے چھپے ایک سائیکل جس پر ایک تنہا شخص اس انداز میں بندھی تھی کہ دور سے اس پر بیٹھا سوار نظر آئے، اس کی کار کے آگے لڑکا دی۔ ڈرائیور اس اچانک صورت حال سے اتنا گھبرایا کہ وہ گاڑی کو کنٹرول کرتے کرتے درخت سے جا ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی اشوک اور منوہر سمجھ دونوں نے ایک ہی وقت میں دودستی ہم اس پر پھینک دیئے۔ زوردار دھماکہ ہوا اور کار کے اپنے مسافروں سمیت پرچے اڑ گئے۔

دھماکہ اتنا زوردار تھا کہ اگرچہ اپنی کار روانی سرانجام دینے کے بعد میں کافی فاصلے پر پہنچ گیا تھا، مگر اس کے بلوجود منہ کے بل زمین پر آ رہا اور نہ جانے کتنی دیر یونی پڑا رہتا لیکن فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ ہماری توقعات کے بالکل برعکس پولیس کی حشٹی جیب کا سائرن فضا میں گونجنے لگا تھا۔

کنکس باڑی تربیت یافتہ گوریلوں کی طرح منصوبہ ترتیب دیتے تھے اور انہی کے سے انداز میں اس پر کھم کرتے تھے۔ میرے علم میں کم از کم ایسا کوئی واقعہ نہیں تھا کہ پولیس نے کبھی کسی کنکس باڑی کو موقع واردات سے گرفتار کیا ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنی واردات کے نتیجے میں جوش آنے والے تمام ممکنہ نتائج پر غور کر کے تمام خطرات کا سدباب بھی پہلے سے ہی سوچ لیا کرتے تھے۔۔۔۔۔ یہاں بھی تقریباً ایسی ہی صورت حال درپیش تھی۔ جس جگہ ہم نے سوائی دوانند کو مارنے کا منصوبہ بنایا تھا، یہ سڑک ایک ذیلی سڑک تھی اور بہت کم پولیس کی پٹرول پارنیاں اس طرف آتی تھیں۔ لیکن شاید دھماکے کی آواز نے جو چاروں طرف پھیل گئی تھی کسی پٹرول پارنی کو صورت حال کی یقینی کا احساس دلا دیا تھا اور وہ لوگ اب سائرن بجاتے اسی طرف آ رہے تھے۔

منصوبے کے مطابق ہم تینوں کو اب تین مختلف اطراف میں سڑک کرتا تھا۔ میں تو سلامتی سے گھر جا پہنچا جب کہ دوسرے ساتھیوں کی ابھی کوئی خبر نہیں ملی تھی اور مجھے ہر لمحے پولیس کی آمد کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کیس ان میں سے کوئی گرفتار ہو جائے اور وہ پولیس کو میرا پتہ دے دے۔

علی الصبح میں نے سب سے پہلے دونوں کی خیریت و ریافت کی اور جب ان کے محفوظ ہونے کی اطلاع ملی تو جن میں جن آئی۔۔۔۔۔ اب ایک لمبے عرصے تک کنکس باڑیوں کو دم سلاھے رکھنا تھا کہ ان کا یہی طریق کار ہے۔

اس اثناء میں میرے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کلکتہ سے واپسی پر میں نے فلائٹ لیفٹیننٹ راجنکار سے بھی ملاقات کی اور تازہ ترین صورت حال جاننے کے لئے دوسرے

ذرائع بھی بروئے کار لایا۔ پرکاش کی شادی کی دہ سے میرے ”دوستوں“ نے مجھے فی الحال لدھیانہ تک ہی محدود کر دیا تھا، کیونکہ اپنے ”دعویٰ ویر“ کی شادی میں مجھے جیو جی کی غیر موجودگی میں ان کا کردار ادا کرنا تھا۔

شہنی دار کو پرکاش کی شادی کی خوب دھوم دھام سے ہندوانہ رسم و رواج کے مطابق انجام پائی۔ فطری کمزوریاں چھپائے نہیں چھپیں۔ جب سدرشا اپنے گھر سے دواغ ہوتے وقت مجھ سے پٹ کر روئی تو بے اختیار میرے سینے میں ایک ہوک اٹھی۔ میری بہن جو پاکستان میں جموں پھیلانے میری سلامتی کے لئے دست بدعا تھی۔ ساگ کا سرخ جوڑا پہنے میرے سامنے سولہ بن کر آن کھڑی ہوئی اور مجھے ہوں لگا جیسے میں اسے ہی اوداغ کہہ رہا ہوں۔

اس روز میں بھارت میں پہلی مرتبہ بے اختیار رو دیا۔ آنسو تھے کہ اٹھے چلے آ رہے تھے۔ اپنا دل، اپنی مٹی، اپنے لوگ سبھی اکٹھے ہو کر مجھے رلانے آ رہے تھے، لیکن پھر یہ روشن چراغ آہستہ آہستہ بجتے چلے گئے۔۔۔۔۔ وہ تو دور تھے مجھ سے کتنے ہی دور۔

شادی کے اگلے ہی روز سدرشا اور پرکاش میرے ساتھ جیو جی سے اٹھ کر لوہیے گئے۔ ہم نے خصوصی درخواست پر ملاقات کی سولت حاصل کی تھی اور سرکار نے بھی حاتم کی قبر پر لات مارنے ہوئے اجازت دے دی تھی۔

بوڑھا کامیٹ جو خونی رشتوں سے زیادہ نظریاتی رشتوں کا قائل تھا، پہلے تو پھر یہ دونوں کو دیکھتا رہا، پھر بلک اٹھا لیکن سیانا تھا جلد ہی اپنے جذبات پر قابو پا گیا۔

”شاید قدرت کو یہی منظور ہے کہ اس گھر میں جو بھی خوشی آئے وہ تمہارے واسطے سے آئے۔“ جیو جی نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

میں ان کی اس بات کا کیا جواب دیتا۔



نوم کی ترشا آنکھیں مجھ سے بار بار یہی سوال کر رہی تھیں کہ میرے بھائی کی خوشی کب لاؤ گے پرکاش جیو۔۔۔۔۔ اور میں اس سوال کی شدت ہی سے کٹ جاتا۔ میرے پاس اس کا جواب تھا ہی کیا۔۔۔۔۔ میں اس سیاہ چشم دیو اسی کو کیسے کہتا کہ لوہن اور عود سلگا کر ساری زندگی اپنے سایہ سنی شہزادے کی یاد میں جدائی کے گیت گاتی رہتا۔۔۔۔۔ میں اسے کیونکر بتاتا کہ قدرت نے اپنی ستم خیزی آزمائے کے لئے ہمیں جن لیا ہے۔ تم نے محبت کی جو آکھس نکل اپنے گرد منڈھ لی ہے وہ تمہیں ساری زندگی اندر سے کھن لگاتی رہے گی۔ تمہارا تمہیبا تو اسی روز پھٹ گیا تھا جس روز تم میری آنکھوں کے راستے میرے دل میں اتری تھی۔ اب تو ہم دونوں

اس راکٹ کی باہر خلاء میں گردش کرتے رہیں گے جس کا رابطہ دنیا کے سائنس دانوں سے کٹ گیا ہو۔

ہاں ہمارا مقدر دریا کے دو کناروں سے مختلف کب تھا؟
صورت حال اتنی تیزی سے بدل رہی تھی اور وقت کا ہنجی یوں پر لگا کر اڑنے لگا تھا کہ میرے اندازے دھڑے دھڑے رہ گئے۔

بھارتی حکومت نے اعلان جنگ تو نہیں کیا تھا لیکن اس میں کسری کیا رہ گئی تھی۔ ان کے دستے مشرقی اور مغربی سرحدوں کا تقدس روزانہ پھلنے لگے تھے۔

نور اس پر یہ غصہ ہوا کہ اگرچہ بھارتی افواج کی وحشیانہ سرگرمیوں کا دنیا بھر کو ثبوت مل گیا تھا، لیکن اقوام عالم کے کالوں پر جوں تک نہ رینگے۔۔۔ انہوں نے چپ سلوہ رکھی تھی اور لوہر ہماری سفارتی کوششیں بھی ناکام ہو چکی تھیں۔ جس مقام پر انہوں نے خود کو تمام اخلاقی اور بین الاقوامی ذمے داریوں سے آزاد کر لیا اور اپنی من مانی کارروائیاں کرنے لگے تھے۔

دشمن کی ان چیرہ دستیوں کے بعد ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی۔۔۔ اسے فکیل ڈلی جیلے۔

مشرقی پاکستان میں طوفانوں کا رخ موڑنے کے لئے مغربی پاکستان میں پوری سنجیدگی سے محاذ کھولنے کی کوششیں ہونے لگیں اور۔۔۔ اس کے لئے مجھے بھی ایک اہم مشن سونپا گیا۔

مجھے پیٹم موصول ہو چکا تھا اور۔۔۔ اس بار میں نے اپنے ان جیالے کمانڈوز کے ساتھ کلام کرنا تھا۔ جنہوں نے ۱۹۶۵ء میں بھارتی سولہوں کو سختی کا بیج بچھایا تھا۔ میرے کان ان کی ہر آہٹ پر گئے رہتے اور نظریں بار بار بڑی بے چینی سے گھڑیوں کی سوئیوں کا جائزہ لینے لگتیں۔ کس لئے میرے جہاز میرے دروازے پر آدھک دیتے ہیں؟

○○○

کمانڈوز کے ساتھ کلام کرنے کا یہ پہلا موقع تھا جو میرے لئے کسی سہولت سے کم نہیں تھا۔ ان شیر دل جوانوں کے ساتھ میدانِ عمل میں کودنے کی لذت سے آشنا ہونے کے لئے میری طبیعت ایک عرصے سے بے تاب تھی۔ لیکن میرے فرائض چونکہ سچل سرورس گروپ سے مختلف تھے اس لئے اس سہولت سے ابھی تک محروم رہا۔ آج جب خوش قسمتی سے یہ موقع نصیب ہوا تو میری جذباتی حالت ناقابل بیان ہو رہی تھی۔

مقررہ وقت پر میں سرحدی علاقے کی دیرین مسجد کے ارد گرد اکی جھانڈوں میں آکر بیٹھ گیا۔ ابھی مجھے وہیں بیٹھے پانچ منٹ ہی گزرے تھے جب اچانک میرے دائیں طرف سے ایک مخصوص

جانور کی آواز ابھری اور خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر وہی آواز وقفے وقفے سے سنائی دی۔ یہ میرے دوستوں کی آمد کا سگنل تھا۔ میں نے بھی اپنے منہ سے دسکی ہی آواز نکالی اور وقفے وقفے سے دو مرتبہ یہ عمل دہرایا۔ جس کے جواب میں میرے نزدیک ہی چنل نارچ جل کر بجھ گئی۔ بالکل اسی طرح کی پھولی سی نارچ میں نے بھی جلا کر بجھا دی اور چند سیکنڈ کے بعد ہی ایک آہٹ میرے قریب سنائی دی۔

یہ ”راہبر“ تھا جو مجھ کو رہنمائی کرتا ہوا یہاں تک لایا تھا۔ اس نے میرے ساتھ کوڑو درواز کا چاولہ کیا اور مجھے مسجد کے قریب ٹھہرنے کا کہہ کر خود اندھیرے میں واپس رینگ گیا۔ چند منٹ کے بعد لیوا انتظار کے بعد اس کی واپسی پانچ جیالوں کے ساتھ ہوئی۔ اندھیرے میں باری باری وہ آگے بڑھ کر مجھ سے بتلیکیر ہو گئے۔ ان میں سے چار تو جو نیئر رینگ کے تھے، ان کا کمانڈر ایک پھلن کپٹن تھا۔ اتنے عرصے بعد اپنے بھلور فوجیوں کو اپنے وطن کی دروپیوں میں لبوس دیکھ کر مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے ”راہبر“ کو وچس سے رخصت کر دیا کیونکہ اس کا کلام اب ختم ہو چکا تھا اور میرا کلام شروع ہوا تھا۔

”راہبر“ نے کچھ عجیب سی نظروں سے ہماری سمت دیکھا۔ شاید وہ بھی اس جذباتی کیفیت کا شکار تھا۔ جس نے مجھے اسیر کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں ہم سے یہی التجا کر رہی تھیں کہ ”مجھے بھی اس سہولت سے سرفراز ہونے کا موقع دو۔“ لیکن نظم و ضبط بھی بہر حال کوئی شے ہے۔ زندگی میں بھی کچھ جذبات ہی تو نہیں ہوتے۔

”راہبر“ کے رخصت ہوتے ہی میں نے کپٹن کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور ایک سمت کو چل دیا۔

وہ لوگ اپنی زندگی کے مطابق بکھر کر میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اور میں ان کو لے کر یہاں سے ایک دوسرے ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا، کیونکہ میری پہلی کمین جگہ کاظم ”راہبر“ کو تھا اور اس کی ممکنہ گرفتاری کی صورت میں اپنے عقیدے کی سچائی کے بلوجود بشری کمزوریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس بات کا قوی امکان تھا کہ تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ اپنے حیادوں کو اس ٹھکانے سے اٹھ کر دوے اور ہم کچھ کرنے کی حسرت ہی دل میں لے کر مرجائیں۔

قریباً دو گھنٹے تک میں اپنے ہمراہوں کو مختلف کھیتوں، کھلیانوں، ندی نالوں سے گزارا تاب اس جگہ پہنچ چکا تھا۔ جسے میں نے ان کے ”آپریشن روم“ کے لئے چنا تھا۔

یہ بھی ایک گھنٹے سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر انہما کے پجاریوں کی خلیات کا نشانہ بنی ایک شہید مسجد تھی۔ جسے منجی کے خانخواہ بھیلویوں نے قیام پاکستان کے بعد شہید کر کے اپنی

مذہبی مصیبت کی ہیئت چڑھا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا مسجد کے انہی کھنڈرات میں بیٹھ کر جہاں سے میرے اسلاف کی ”حی علی الفلاح“ کی آوازیں چاروں طرف گونج کر بت پرستی کے غرور کو خاک میں ملایا کرتی تھیں، میرے جبالے قرون لوٹی کی تاریخ ایک مرتبہ پھر دہرائیں اور براہمنی سامراج کو خاشاک کا ڈھیر بنا کر رکھ دیں۔

ایسی مسجد کے صحن میں نبھانے کھلی کے پجاریوں نے کتنے مسلمانوں کا لوہا ہلنے کے بعد انہیں شہید کیا تھا، لیکن اب وہ ان کے نزدیک پھٹکنے سے بھی ڈرتے تھے۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات سامنی تھی کہ ”ہمیں متوتلوں کی رو میں قیام پذیر ہیں جو کسی بھی لمحے ان کی جان لے سکتی ہیں۔“ شاید اسی وجہ سے اکثر دیہاتی علاقوں میں ان شہید کردہ مسجد کے ارد گرد — ”تربا“ میل میل کے فاصلے تک آبادی کا ہم و نشین دکھائی نہیں دیتا نہ ہی ان کے زیادہ نزدیکی زمین کو زیر کاشت لایا جاتا ہے۔

ایسے متاخر دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا ایسی بزدل قوم کو جو مسلمان شہیدوں کی روحوں سے خوف کھاتی ہے آخر کوئی طاقت برسر حکومت رکھے ہوئے ہے؟ ان کے کردار کو گھن لگ چکا، ان کے پاس سوائے بے حیائی اور منافقت کے اور وہ ہی کیا گیا ہے۔ تب مجھے اپنے سوالوں کا ایک ہی جواب سوجھتا کہ اس کا سبب صرف میری قوم کی بے حسی، برسر اقتدار طبقے کی ”مصلحت کوئی“ اور لیڈروں کی ”پریم سبائی“ ذہنیت ہے۔ بد قسمتی سے ابھی تک میری مقدس سرزمین پر ایسے لوگ بزم خویش لیڈر بنے پھرتے تھے جنہوں نے کبھی صدق دل سے پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا۔۔۔! اور یہی لوگ آج ہمارے جلاوطن ہونے کے بھی دعوے دار ہیں۔

اپنے اسلاف کی عظمتوں کے ان کھنڈرات میں بیٹھ کر میں نے نبھانے کیسے کیسے سنے دیکھے۔ میرا دل گولہا رہتا تھا کہ جس روز میری قوم نے ہندو اور ہندو ذہنیت کے حامل پاکستانیوں کی اصلیت جان لی، وہ بھارت مانا کی موت کا دن ہو گا۔۔۔ ایک مرتبہ میرے کشمیر کے جبالے اگر عزم کر کے انہیں تو ممکن ہی نہیں کہ وہ مہاسبائیوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے بغیر پلٹ آئیں۔

کاش میری بھولی قوم ہندو ذہن کی چلتی پھرتیوں سے آگاہ ہو سکے! اے کاش.....!

اپنے مسلمانوں کی صمد نوازی کے لئے میں نے چائے سے بھرا تھرموس اپنے پاس رکھا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ان کی تواضع چائے سے کی۔ پھر کیپٹن کے اشارے پر اس کے چاروں ساتھی اس جگہ کے چاروں طرف بکھر کر پہرہ دینے لگے جب کہ کیپٹن صاحب ایک نقشہ بچھا کر میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ ایک چھوٹی سی راج کی روشنی میں انہوں نے اپنے ”ٹارگٹ“

کی نشاندہی کی۔۔۔ یہ ایک فوجی نوعیت کا پل تھا جسے وہ جگہ کرنے آئے تھے۔

○○○

کشمیر میں نظام رسد اور مواصلات کا انحصار ان چھوٹے چھوٹے پلوں پر ہے جو تیز رو پہاڑی ندی نالوں پر بنائے جاتے ہیں۔ ایسے پلوں کی حیثیت بھارتی آرمی کے نزدیک شہ رگ کی طرح ہوتی ہے۔ اگر ایک دو پل بھی جگہ ہو جائیں تو فوج کا بست بڑا حصہ مطلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ پلوں کی اسی اہم نوعیت کے پیش نظر یہاں ہر وقت فوج تعینات رہتی تھی اور ایسے اہم نوعیت کے پلوں کے دونوں اطراف میں مضبوط مورچہ بندیاں کی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ پاکستانی کمانڈوز کے ممکنہ حملے کے پیش نظر یہاں بڑے بڑے ہتھیار بکھر تھیں گئے تھے جس کا سلسلہ اندر ہی اندر کھلی دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان نکمری ہوئی پوزیشنوں پر مورچہ زن افواج کے لئے جگہ جگہ پھنول ڈمپ اور گولہ بارود کے ذخیرے بھی رکھے جاتے تھے اور ان ذخائر سے پوزیشنیں تک اسلحہ لانے کے لئے یہاں فوجی گاڑیوں کا تانہ بندھا رہتا اور ان کی نقل و حرکت جاری رہتی تھی۔ پاکستانی کمانڈوز اور کشمیری حسرت پسند چھپ کر اچانک حملہ کرتے اور زیادہ تر اسلحہ کے ڈپوزٹوں، پھنول کے مراکز اور فوجی کواٹس کو اپنی سرگرمیوں کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔

ایسے کسی پل کی تہی سے بھارتی افواج کی سپلائی لائن میں اچھا خاصا گھٹ پڑ جاتا تھا جس کو پُر کرنا ان کے لئے فوری طور پر ناممکن ہو جاتا کیونکہ اکثر و بیشتر ایک کے فوراً بعد انہیں دوسرے ناممکنی حملے کا سامنا کرنا پڑتا۔

یہ سرفروش بھی ایک ایسے ہی اہم نوعیت کے پل کو جگہ کرنے آئے تھے۔ سب سے اہم کام تھا اپنے ٹارگٹ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کا بھرپور جائزہ لینا تاکہ اُس کی تہی کے لئے موثر منصوبہ بندی کی جاسکے۔ میں تو اس پل سے دو تین مرتبہ گزر چکا تھا، لیکن کیپٹن صاحب کو اس کا نظارہ کرنا پھر بھی ضروری تھا جس کا بندوبست میں نے پہلے ہی کر رکھا تھا۔

ارد گرد کے مقامی رہنماؤں سے جو لوگ چھٹا کوٹ یا جھوں جاتے تھے۔ انہیں اس پل سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ سو اس کے چارہ نہیں تھا۔ علی الصبح کیپٹن صاحب نے اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دے کر وہیں چھپ کر انتظار کرنے کا حکم دیا اور خود میرے ساتھ رہنماؤں کے لباس میں چل دیئے۔ میں نے ان کی سرخ و سپید رنگت کے پیش نظر انہیں مقامی پنڈتوں کے سے انداز میں کپڑے پہنائے تھے۔ بطور احتیاط پھر بھی ہم نے اپنے لباس میں پستول چھپا رکھے تھے۔

کپڑے کا ایک تھیلا میرے ہاتھ میں تھا جس میں کچھ کھنڈرات تھے اور دو سرائی کے ہاتھ میں جس میں کھلنے کی اشیاء رکھی تھیں۔ کیونکہ براہمن زیادہ تر اپنے گھر کے کچے کھلنے پر ہی

انحصار کرتے ہیں۔

— اپنی پلاننگ کے مطابق تمام باتیں میں نے جلنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر ان کو ذہن نشین کروادیں۔ ہم دونوں اللہ کا نام لے کر چل دیئے۔

میں نے جان بوجھ کر وہ راستہ اپنایا تھا جو ارد گرد کے دھماکوں سے ہٹ کر جانا تھا۔ یہ پل سے تقریباً آٹھ نو میل دور تھا۔ سارا راستہ ہم نے پیدل ہی طے کیا اور سورج ظہور ہونے تک پل کے قریب پہنچ گئے جس کے دونوں کناروں پر مسلح سنتری آئے جلنے والوں کو ٹھوک بجا کر دیکھنے کے بعد ہی وہاں سے گزرنے کی اجازت دیا کرتے تھے۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے اس پل تک پہنچے تھے اور پیریدلوں کی طرف دیکھے بغیر ہی منہ اٹھائے چلے جا رہے تھے۔

”ہٹ۔ کون ہو تم کہہ جا رہے ہو؟“ اچانک ایک فوجی لٹکارتا ہوا ہماری طرف بڑھلا۔ جواب میں میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ جوڑ کر اسے اپنی شناخت بتائی اور نزدیک کے ایک گھوڑوں کا نام بھی لے لیا۔

”تو کون ہے؟“ اس نے کیپٹن صاحب سے بڑے درشت لہجے میں پوچھا۔ کیپٹن صاحب ہونٹوں کی طرح اس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ”گھوڑا ہے مہاراج جی!“ اس کی مصیبت تو بھگتتے جا رہے ہیں کیا کھلک آگیا ہے۔ رشتہ داروں نے بے چارے کی ساری زمین تھیلیاں۔ ہم عدالت ہی بھگتتے جا رہے ہیں مہاراج۔“ میں نے اس کی بات کا بدستور اسی لہجے میں جواب دیا۔

”یہ کیا ہے تھیلے میں؟“ اس نے میرے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کھنڈ ہیں عدالت کے ملٹی ہاپ۔“ میں نے تھیلے میں رکھے عدالتی کھنڈات نکال کر اس کی طرف پھسادیئے جو پہلے ہی میں نے آج کے لئے تیار کروائے ہوئے تھے۔

”ٹھیک ہے جٹو۔“ اس نے قریباً جھڑکتے ہوئے جواب دیا اور ہم لوگ آگے بڑھ گئے۔ کیپٹن صاحب کی تجسلسنہ نظریں بڑی صراحت سے اپنے ٹارگٹ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ دشمن بھی ان پر نظریں جمائے کھڑا تھا اور ان کی کوئی بھی مشتبہ حرکت ہم دونوں کی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ ہم دونوں نے پیدل چل کر پل عبور کیا اور پل کے دوسری طرف کھڑی بس میں سوار ہو کر شرور و نہ ہو گئے۔

○○○

دوپہر کے بعد ہم واپس آئے۔ دوبارہ پل پر سے گزر کر حالات کا جائزہ لیا۔ اب میرے خیال

سے کیپٹن صاحب نے اپنے ذہن میں کوئی پلان ترتیب دے لیا تھا۔ واپسی پر پہرے دار بدلے ہوئے تھے اور ہمیں ایک مرتبہ پھر چیکنگ کے انہی مراحل سے گزرنا پڑا۔ اپنے ساتھیوں کے پاس ہم شام کے وقت پہنچے تھے۔ کیپٹن صاحب نے نقشہ زمین پر پھیلا کر اس پر کچھ لیکچرس کھینچیں اور اپنے جہازوں کو پلان سے آگے کھینچ اپنے مشورے میں انہوں نے مجھے بھی شامل کر لیا اور جیسے ہی آخری راتوں کا چاند ڈوبا سرفروش کھڑے ہو گئے۔

کیپٹن صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے کہ اگر میں چاہوں تو انہیں مطلوبہ ٹارگٹ تک پہنچا کر واپس جاسکتا ہوں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی ممکنہ مصیبت کی صورت میں میں بھی ان کے ساتھ دشمن کا نشانہ بن جاؤں۔ ایسی مصلحت پر زندہ بچنے کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے ایسی مصلحتوں پر جلنے کے لئے انہی اللہ کے شیروں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اپنی زندگی کا مقصد صرف ایک بدلتا ہوا موت سمجھتے ہیں۔

اللہ کے یہی شیر اب پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ سب نے اپنے ہاتھ اٹھا کر مشن کی کامیابی کی دعا مانگی۔ کیپٹن صاحب نے انہیں آخری ہدایات دیں اور ہم سب اک حوصلے، اک عزم کے ساتھ براہمنی تکبر سے گھرانے چل دیئے۔

پل تک پہنچنے کے لئے میں نے بہت لمبا راستہ اختیار کیا تھا کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ دشمن سے دو ہاتھ کرنے کی تمنا ہی دل میں لے کر اللہ کے حضور پہنچ جائیں۔ سب سے آگے میں تھا، میرے پیچھے کیپٹن صاحب اور ان کے جہاز قدم بہ قدم اپنی تربیت کے مطابق چل رہے تھے۔ راستے میں جہاں کہیں معمولی سی آہٹ بھی سنائی دیتی، ہم فوراً دیک جاتے۔ میں نے معمولی خطرہ بھی مول نہیں لیا تھا اور جہاں کہیں خطرے کا ذرا سا بھی شبہ گزرتا، میں انہیں بٹھا کر خود آگے بڑھ جاتا۔

— یہ غازی میرے پاس اللہ کی امانت تھے اور امانت کا ہمارا اٹھانے کے لئے قدرت نے مجھے منتخب کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کل جب خدا کے حضور پیش ہوں تو وہاں اس امانت کی مکمل حفاظت کے سلسلے میں ذرا سی کوتاہی کے لئے مجھے جوابدہ ہونا پڑے۔ ان کو وہ ممکن جہازوں سے کچھ بعید نہیں تھا۔ دشمن کے غرور کو خاک میں ملا دینا ان کے ہائیں ہاتھ کا مکمل تھا۔ انہیں ہر قسم کے ہمسلسلہ حالات اور اچانک پیش آنے والی صورت حال سے غفلت کی خصوصی اہلیت حاصل تھی لیکن میرا دل چاہتا تھا کہ ان کی بر تقدس جبینوں پر ایک شکن بھی نہ آئے اور وہ اپنا کام کر گزریں۔

جس وقت ہم پل کے نزدیک پہنچے، رات کا ایک پھر بیت چکا تھا۔ کیپٹن صاحب نے پیدل

تھیں؟ کیپٹن صاحب نے دو تین مرتبہ بے چینی سے اپنے بازو پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا، پھر میں نے ان کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھرتے دیکھے، شاید اب تک ہمارے ساتھیوں کو اپنا کام مکمل کر لیتا چاہیے تھا، لیکن اب تک ہمارے چاروں اطراف وہی ہولناک سناٹا تھا یا پھر ندی کی شوریدہ سرسریں لور ہل پر گشت کرے پھرے داروں کے پاؤں کی دھمک!

اچانک مجھے اپنا سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا کیونکہ سرچ لائٹ روشن ہو چکی تھی اور اس کی تیز شعاعوں نے ہل کا احاطہ کر لیا تھا اس کے ساتھ ہی میں نے گردن موڑی، اب سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا ہل کے ایک کونے سے میں نے اپنے ایک ساتھی کو چھلانگ لگا کر جہازوں میں گرتے دیکھا شاید وہ سرچ لائٹ کی رینگ میں آنے سے بچ رہا تھا، لیکن اب وہ بھارتی بیوروں کو دکھائی دے چکا تھا پھر تین باتیں یکھت وقوع پذیر ہوئیں۔ بکر کے ایک کنارے پر گلی لائٹ مشین گمن نے اپنا جہاز اکھولا اور سرخ انگاروں کی ایک لکیر اس مجاہد کے تعاقب میں ہلی۔ کیپٹن صاحب کی شین گمن نے شعلے اگلے اور سرچ لائٹ بجھ گئی۔ انہوں نے سرچ لائٹ کو ہی نشانہ بنایا تھا اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا ہینڈ گرنیڈ اچھلا اور بکر میں جا کر پھرتا جیسے مجھ پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ میں نے شاید ایک ڈیڑھ منٹ ہی میں چار پانچ گرنیڈ یکے بعد دیگرے اس طرف اچھل دیئے۔ اسی اثناء میں ہل کے دوسرے کنارے پر مورچہ زن ہمارے ساتھیوں نے راکٹ لائپر سے حفاظتی چوکی پر آگ برسلنی شروع کر دی تھی۔ اگلے ہی لمحے کیپٹن صاحب کی مضبوط گرفت نے مجھے گرنے سے بچا لیا کیونکہ کھوں کے پردے چھاڑ دینے والے دھماکے کی زوردار آواز گونجی تھی اور ہل کے پرچے اڑ گئے۔ میرے حواس بے قابو ہوئے جاتے تھے۔ مجھے صرف ایک بات کا احساس رہ گیا تھا کہ کیپٹن صاحب نے میرا بازو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور مختلف ٹیلوں کی اوٹ لیتے ہوئے ہم اپنے مخصوص پوائنٹ کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔

جب حواس بحال ہوئے تو ہم دونوں ہل کے نزدیک ہی ایک محفوظ جگہ کھڑے تھے۔ کیپٹن صاحب کی نظریں اپنی گھڑی کی سوئیوں پر جمی تھیں۔ اور ہل کی جگہ فحش و خاشاک کا ایک ڈھیر ندی میں بہہ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر بنے بھارتی فوج کے مورچوں سے دیوانہ وار فائرنگ کی جارہی تھی لیکن کس پر۔۔۔؟ اس کا علم شاید ہماری طرح انہیں بھی نہیں تھا۔

ابھی ہمیں کھڑے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ دو سائے اپنی سمت ریختے دکھائی دیئے۔ قریب آنے پر یہ اپنے وہ ساتھی نکلے جو راکٹ لائپر کے ساتھ ہل کے دوسرے کنارے پر موجود تھے۔ یہی جگہ ”ٹلاپ“ کے لئے طے ہوئی تھی اور ہم نے یہاں ایک طے شدہ وقت تک ایک دوسرے

بچنے کے تین ٹولیاں ترتیب دیں۔ ایک ٹولی میں وہ خود لور میں شامل تھا۔ دوسری دو ٹولیوں میں دو دو جن شامل تھے۔ دونوں ٹولیوں کو ان کی مخصوص پوزیشن کا علم تھا۔ دو جوانوں نے توپل کے ایک کنارے پر پوزیشن سنبھال لی۔ ہلتی دو کے ذمے ڈائنامیٹ لگنا تھا اور یہی کام سب سے خطرناک تھا۔ دونوں ٹولیوں کو اپنے اپنے ٹارگٹ پر بھیج کر کیپٹن صاحب میرے ساتھ اپنے لئے پہلے سے مخصوص جگہ پر دیک کر بیٹھ گئے۔ ہم نے ہل کے ایک کنارے پر بنے ایک بکر کے پہلو میں تین بھونکی سی پہاڑی پر مورچے جمائے تھے۔ جمل سے وہ بکر بمشکل چند گز کے فاصلے پر تھا۔ اس بکر کے اوپر ایک سرچ لائٹ نصب تھی جسے ”دقا“ ”فوقا“ سمجھا کر وہ لوگ ہل کی صورت مل کا جائزہ لیتے تھے۔ جب کہ ہل کے دونوں اطراف پر بنی پھرے داروں کی پوسٹوں میں مسلح پھرے دار موجود تھے۔ اس کے علاوہ یہاں سے کچھ فاصلے پر فوج ڈیپلے تھی اور انہی ایئر کرافٹ کمر بھی نصب تھیں۔

اتنے زبردست حفاظتی انتظامات کی موجودگی میں ہل کو جگہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن میرے ہمراہیوں کی لغت میں ناممکن کا لفظ تو تھا ہی نہیں۔ ہم ہل سے قریب چالیس گز دور ایک دوسرے سے الگ ہوئے تھے۔ میرے کندھے پر پھٹکتے تھیلے میں دستی بم موجود تھے اور مجھے کیپٹن صاحب نے ہدایت کی تھی کہ جیسے ہی وہ شعلہ دیں، میں بکر کے اندر بم پھینکتے شروع کر دوں۔ میں کوئی تربیت یافتہ فوجی نہیں تھا، لیکن اپنے سرفروشوں کی سمیت میں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں بھی ان کی طرح ایک تربیت یافتہ لور پیشہ ور مکلف ہوں۔

ہم دونوں بکر کو اپنی زد میں لئے ایک چمڑی اوٹ میں اس پر نظریں جمائے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر لیٹے تھے۔ کیپٹن صاحب نے شین گمن کا رخ بکر کی طرف کر رکھا تھا۔ جب کہ میرے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا ہوا ہینڈ گرنیڈ کسی بھی لمحے پھینکنے کے لئے تیار تھا۔ مجھے کیپٹن صاحب کی حالت کا تو علم نہیں، میرے دل کی دھڑکنیں البتہ بے قابو ہوئی جاتی تھیں، لیکن میں خوفزدہ ہرگز نہیں تھا البتہ کچھ نہ کچھ فوراً کر گزرنے کے لئے بے تاب ضرور تھا۔

○○○

ہل کے نیچے تیز رفتار ندی کی شوریدہ سرسریں کی پتھروں سے ٹکرانے کی آواز تھی یا پھر کبھی کبھی ہل پر گشت کرتے کسی فوجی کے بوتوں کی کھڑکھڑاہٹ، اس کے علاوہ تو فہر پر چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ میں اپنے تصور کی آنکھ سے اپنے دونوں جہازوں کو ہل کے نیچے ڈائنامیٹ لگاتے دیکھ رہا تھا۔ پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ اس میں قدم بھانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ لیکن عزم و ہمت کی ان چٹانوں کے آگے یہ تیز رفتار لہریں سوائے سر بختنے کے لور کر ہی کیا سکتی

مقررہ وقت اب ہوا ہی چلتا تھا اور میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔۔۔ ابھی تک میرے دو جلتا ہوا نہیں پلٹے تھے۔ کیپٹن کے گرد بن کے دونوں ساتھی مستحضر کھڑے تھے۔ پھر میں نے کیپٹن کے چہرے پر جلال کی ایک لور جھلک دیکھی اور انہوں نے گھڑی کی بجائے اپنی نظریں ہم پر گاڑ دیں۔ شاید انتظار کا مقررہ وقت ختم ہو چلا تھا اور اس سے قبل کہ وہ ہمیں روانگی کا حکم دیں۔ ہم نے ایک سائے کو قریباً زمین پر گھسنے ہوئے اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ ہم فوراً پوزیشن میں آگئے، لیکن قریب آنے پر یہ ہمارا وہ ساتھی نکلا جن کے ذمے پل کو اڑانے کا مشن تھا۔ ہمارے قریب پہنچ کر وہ بمشکل اٹھ کر کھڑا ہوا، اُس کی وردی خون میں بھیگ رہی تھی۔ اس نے کیپٹن کو سلیوٹ کیا اور کہل۔

”سر! حوالدار صاحب شہید ہو گئے۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے حوالدار کی وردی کے نشانات لور لن کی شین گن گلے سے اتار کر کیپٹن صاحب کی طرف بڑھادی۔ میرا دل بھج کر رہ گیا اور آنکھیں چمک پڑیں۔ کیپٹن لور لن کے ساتھیوں نے بڑے تحمل سے اس خبر کو سنا، لن کے منہ سے ”اللہ وانا الیہ راجعون“ نکلا۔ سب نے باری باری شہید کی گن کو بوسہ دیا۔۔۔ لن کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی، لیکن وہ دوتے نہیں، شاید اس لئے کہ سپاہی رویا نہیں کرتے۔ لن کے آہنی سینوں میں ہوک ضرور اٹھی لیکن سب نے اندر ہی اس کا گلہ کھونٹ دیا۔ جب کہ میں فوجی نہیں تھا۔ اسی لئے میرے توجہ کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ کیپٹن نے بڑے احترام سے شہید کے نشانات اپنی جیب میں ڈالے اور جبکہ کر اپنے زخمی ساتھی کی طرف متوجہ ہو گئے جس میں اب اٹھنے کی سکت بھی ہلتی نہیں رہ گئی تھی۔

اس کے سینے پر گمراہ گھوڑا نظر آ رہا تھا۔ تینوں غازیوں نے اپنی لیلہ بنیاں اس کے سینے پر باندھ دیں۔ یہ ایسا کا عظیم مظاہرہ تھا اور نہ میدان کارزار میں ایک فوجی کے لئے اس کی ایمر جیسی ہڈی کی کیا اہمیت ہے۔۔۔۔؟ اس سے باہر لوگ، بھولے آنکھ ہیں۔

اس اثناء میں ہمارے ساتھیوں نے ہنگامی سترچ ترتیب دے لیا تھا۔ انہوں نے اپنے زخمی ساتھی کو اس پر لٹایا اور ہم اپنی سرحدوں کو چل دیئے۔ مجھے اس علاقے کے متعلق کافی واقفیت حاصل ہو چکی تھی لور ایک ماہر گائیڈ کی طرح میں لن کے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں تینوں مجاہد باری باری سترچ پر ڈیوٹی دیتے رہے۔ ہمارے ساتھی پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ جب اُس کی حالت گہرے گتے، کوئی جوان اپنی پانی کی بوتل سے دو کھونٹ اسے پلا دیا۔ اس

واپسی کا سفر کچھ کم خطرناک نہیں تھا۔

— کمانڈر اپنا مشن پورا کر کے واپس جا رہے تھے لور یہاں چپے چپے پر پھیلی ہوئی بھارتی افواج کو اس ہلت کا سنگت مل چکا تھا کہ اس علاقے میں پاکستانی کمانڈر موجود ہیں لور اب وہ شکاری کتوں کی طرح لن کی بو سونگھتے بھرتے تھے۔ میرا اختیار کد راستہ لہا لور پیچیدہ ضرور تھا لیکن میرا دل گولہاں دے رہا تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ اس اثناء میں دو تین مرتبہ میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے زخمی ساتھی کی عیادت کر چکا تھا۔ ایک مرتبہ تو میں نے اسے بڑبڑاہٹ میں کچھ قرآنی آیات تلاوت کرتے دیکھا لور دوسری مرتبہ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھنے پر

ی اکتفا کیا تھا۔

”قریباً دو گھنٹے تک مختلف نوعیت کے خطرناک مراحل سے گزر کر ہم اب ”وائٹ لائن“ کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ سرحدی لکیر پہنچ کر میں رک گیا۔ ساتھی بھی نزدیک آگئے۔ میں نے بستراری سے آگے بڑھ کر ایک بار پھر اپنے زخمی مجاہد کو دیکھنا چاہا۔

”پاکستان آگیا۔۔۔“ اس نے مجھے دیکھتے ہی ذرا سی گردن اٹھا کر پوچھا۔

میں نے صرف اپنا سر ہلا کر ”ہاں“ کہہ جواب میں اس کی گردن ڈھلک گئی۔

میں لور کیپٹن صاحب ایک ساتھ ہی بے چینی سے اس پر جھکے تھے۔ وہ بہت دھیمی آواز میں کلمہ شلوت کا درد کر رہا تھا۔ کیپٹن صاحب نے اسے آہستہ سے پکارا لیکن شہید تو جیسے اپنی سرزمین کا خضر تھا۔ جیسے ہی وہ اپنی دھرتی پر پہنچا، اس نے اپنی جان آفرین کو سوپ دی تھی۔ میں نے شدت غم سے بے قابو ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ منہ میں لے لیا تاکہ اپنی سسکیوں کو ضبط کر سکوں۔ کیپٹن صاحب نے جبکہ کر اپنے جیالے کی پیشانی کو بوسہ دیا لور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا، شاید وہ اپنی جذباتی کیفیت کا اظہار مجھ پر نہیں کرنا چاہتے تھے یا پھر فتنی ذہن میں یوں کہہ لیجئے کہ وہ اپنی کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس اثناء میں دونوں جوان سترچ تھلے پھر کے بت بنے گم سم کھڑے تھے۔

وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کیپٹن صاحب نے مجھے سینے سے لگا کر میری پیچھے پر

جھکی دی۔

”شکریہ دوست، خدا حافظ!“ کہہ کر وہ اپنی سرحدوں کو چل دیئے۔

وہ بچے کچھ ساتھی لور وطن کی آغوش میں آسودگی حاصل کرنے کے لئے آہستہ آہستہ

ٹوٹی کہاں کہند

لیکن اچانک میں سناٹے میں آگید کھیت میں مختلف اطراف سے مارچ کی رو دنیاں گھنے
 مگی تھیں۔ میں "ناکے" میں پھنس چکا تھا۔ باہر زمین پر گھٹنے نکائے میری طرف راغلیں
 جیتائے بھارتی یکوئی فورسز کے جوان میرے بھر تھے۔

نمودار ہونے کے بعد میرے نظر آنے کے امکانات بھی بڑھ سکتے تھے۔

دوسری سمت سے ہونے والے کسی عمل کا انتظار کروں یا اٹھ کر بھاگ جاؤں؟ ابھی میں اس شش و پنج میں جھکا تھا کہ قدرت کو مجھ پر رحم آگیا۔

سرحدی اضلاع میں جنگلی جانور مثلاً ”سور لور گیدڑ وغیرہ عموماً“ بکھرتے پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً رات کے وقت تو وہ ٹولیوں کی شکل میں کھیتوں پر حملہ کرتے اور ہری بھری لعلاتی فصلوں کو چٹ کر جاتے ہیں۔ میرے قریب ہی شاید کسی کوئی جنگلی جانور اپنے خصل میں مصروف تھا اور میری طرح ناگہانی آفت دیکھ کر وہیں دبک گیا تھا لیکن چونکہ جانوروں میں قوت برداشت یا قوت فیصلہ انسانوں سے کم ہوتی ہے، اس نے میری طرح انتظار کی زحمت اٹھانا گوارہ نہ کیا اور خود کسی عمل اقدام پر قیام کیا۔

میں بھی اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا، جب میرے نزدیک کھیتوں میں سرسراہٹ ہوئی اور پھر تو جیسے طوفان بدتمیزی وہیں گھس آیا۔ ایک جنگلی جانور فصلوں کو روندنا باہر کی سمت لپکا، دوسرے ہی لمحے فضا میں ”ہٹ“ ”ہٹ“ اور اس کے بعد ”ٹھائیں“ ”ٹھائیں“ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ میں یہ تماشہ دیکھنے کی تلب کمالا سکا تھا۔ اس غیبی امداد پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا کھیتوں کے اندر ہی اندر تیزی سے مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔ جب تک انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا، میں جنگلی گھاس کی بھول، سیلوں میں کھو چکا تھا۔

○○○

وہ مخصوص ستارہ جسے دیکھ کر میرے ہم پیشہ لوگ اپنی منزل کا تعین کرتے ہیں، آسمان پر نمودار ہو چکا تھا۔

— اسی کو رہنما جن کر میں نے بھی جنگلی گھاس میں اپنا سفر جاری رکھا۔ میرے جسم پر کئی جگہ نوکیل گھاس نے اپنے تھن خراشوں کی صورت میں ثبت کر دیئے تھے لیکن اس کی پردہ کسے تھی! ایک دلفر موزیوں کے چنگل سے بچ نکلنے کے بعد طمانیت کا احساس ہوا تھا، اس نے تمام جسمانی تکلیف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں پراحت تھا اور بجائے کھلی جگہ دیکھ کر باہر نکلنے کے میں نے بیٹھ ہی میں اپنا سفر جاری رکھا۔

فاز تک اور تعاقب کرنے والوں کا شور سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا، اب میں تھا اور رات کا پربول سناتا۔ جس کے تقدس کو کبھی کبھی کسی جنگلی جانور کے بھاگنے یا چلانے کی آواز بھڑک کر دیتی تھی۔ پیہرہ سحر کے نمودار ہونے کے بعد میں نے گھاس کے اس مذا لب سے چھٹکارہ پانے کی تدبیر کی۔ کیونکہ اب خراشوں سے خون بھی رسنے لگا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے کپڑے

دیکھ کر کسی کو یہ گمان گزرے کہ میں کوئی بھگوڑا چور ہوں جو کسی طرح رہائشوں سے جان بچا کر نکل آیا ہے یا پھر کوئی مفلوج قاتل جو پتلہ کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔

گھاس سے باہر نکل کر اپنے نیلے کا جائزہ لیا تو دوبارہ گھس جانے کو جی چلا۔ ایسے تاریک لباس میں دن کے وقت سفر کرنا معیشت کو خوار خواہ دعوت دینے کے مترادف تھا اور نئے کپڑوں کا حصول ایک الگ مسئلہ۔ ہلنل خواست وہیں ایک کھیت کے کنارے بیٹھ کر کسی غیبی امداد کا منتظر ہو گیا۔

چند منٹ کے بعد ہی میری مراد بر آئی۔ ایک نوجوان کندھے پر بیلوں کے گلے میں ڈالنے والا طوق (بجلی) رکھے اسی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں اوٹ میں ہو گیا۔ جیسے ہی وہ نزدیک آیا، میں اچانک نکل کر اس کے سامنے آگیا اور اس سے پہلے کہ اسے صورت حال کا احساس ہو، ایک زوردار جھانپڑ اس کی کینٹی پر جڑ دیا۔ آدمی کچھ زیادہ ہی جائدار دکھائی دیتا تھا۔ ایک ہی جھانپڑ سے اسے عقل آگئی۔ وہ حیرانگی اور غصے میں تھماتا ہوا میری جانب پلٹا لیکن بجلی اس کے ہاتھوں میں لہرا کر رہ گئی۔ میری دونوں ہتھیلیاں اس کی کپٹیوں سے ٹکرائیں اور وہ کچھ کرنے کی حسرت دل ہی میں لئے لہراتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اسے بجلی سمیت کھینچ کر کھیتوں میں گھسٹ لیا اور چند سیکنڈ کے بعد صرف ایک زیر جلد اس کے بدن پر ہلتی رہ گیا تھا۔

یہ سب کچھ کرتے ہوئے مجھے ایک لمحے کے لئے انفس تو ضرور ہوا لیکن یہ وقتی انفس اس پچھتوے سے بہتر تھا جس کا سامنا بے ضرر کپڑے کی طرح پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد مجھے کرنا پڑتا تھا۔ شوقی کے لئے میں نے اپنے کپڑے اس کے قریب رکھ دیئے جن کے ساتھ سو روپے کا ایک نوٹ بھی بطور اٹھارہ تفکر موجود تھا۔

پھر تو میں محلوں تا ہی نہیں حقیقتاً سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور بھاتا ہی چلا گیا۔ راستے میں کئی لوگ مجھ سے ٹکرائے، عموماً بھی دکھائی دی لیکن میں نے یہاں کسی بس میں سفر کرنے کا خطرہ مول لینے کی بجائے پیدل چلنے کو اہمیت دی۔ دوسرے ایک سمت میں چلا رہا۔ بالآخر تھک کر چور ہو گیا۔ اب مجھ میں واقعی زیادہ دیر تک چلنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ بھوک اور پیاس سے بے حل ہوا جاتا تھا۔

خدا خدا کر کے قریبی سڑک تک پہنچا۔ سڑک کے کنارے ایک معمولی سے ہوٹل سے کھانا زہرہا کیا اور مختلف بھوس میں دھکے کھانے کے بعد رات کو کٹنی دیر گئے لدھیانہ پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ خیریت گزری کہ ابھی ریڈی میڈ کپڑوں کی کچھ دکانیں کھلی تھیں درنہ شاید اس لیے میں کارخانے پہنچ کر خواہ مخواہ سب کو شک میں ڈالنے والی بات ہوتی۔

دوسرے دن میں منام پہنچ گیا جہاں سے ایک بس مجھے سرحدی علاقے کلاوڑ لے آئی۔ کلاوڑ سرحد کے بالکل قریب واقع ہے۔ یہاں سے ایک نزدیکی گاؤں تک جانا تھا جہاں ایک مقامی دوست میرا انتظار تھا۔ جس بس کے ذریعے میں یہاں پہنچا تھا، اس میں قریباً تمام دینی لوگ سوار تھے جن کا تعلق مقامی رہائشیوں سے تھا اور یہ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ سرحد کے دونوں اطراف فوجیں مورچہ بند تھیں اور آئے روز کسی نہ کسی سرحدی جھڑپ کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ ممکنہ جنگ کے خطرے کے پیش نظر رہائشی آبادیاں خالی ہو رہی تھیں کیونکہ لوگوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ کو نہیں بھلایا تھا اور لڑائی لگنے سے پہلے ہی وہ رہائشیوں کو خلی کر کے شہروں میں محفوظ پناہ گاہوں کا رخ کر رہے تھے۔

دہلاؤں میں صرف وہی لوگ رہ گئے تھے جن کا یہاں قیام کرنا ناگزیر تھا کیونکہ کھیتی باڑی پر ہی ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ بچوں، بوڑھوں اور خواتین کا انہوں نے شہروں میں بھیج دیا اور صرف چیدہ چیدہ نوجوان ہی جن میں سے زیادہ کا تعلق ”ہوم گارڈز“ سے تھا یہاں رہ گئے۔

”ہوم گارڈز“ ایک نیم فوجی قسم کی تنظیم تھی جسے بھارتی حکومت نے پنجاب کے سرحدی اضلاع کی حفاظت کے لئے منظم کیا تھا۔ یہ فوج کے تربیت یافتہ رضاکار تھے۔ جن کو ضروری اسلحہ فراہم کر کے اپنے اپنے گھوں کی گھرنائی پر سوار کر دیا گیا تھا۔ اچھی دانست میں بھارتی حکومت نے کسی پہلو سے غیر ملکی مداخلت کی گنجائش یہاں نہیں چھوڑی تھی۔

سرحدی علاقوں میں سب سے پہلے بی۔ ایس۔ ایف (بارڈر سیکورٹی فورسز) تھیں۔ اس کے بعد ”ہوم گارڈز“ اور سب سے بڑھ کر پولیس جس کی نظری سرحدی تھانہ جگت میں دو گنا کر دی گئی تھی۔ چپے چپے پر فوج مورچہ بند تھی اور ہزاروں کی تعداد میں سولیں اور آرمی کے اہلی جنسوں کے سدھائے ہوئے ملازمین اس کے علاوہ تھے۔ ان تمام انتظامات کے علاوہ ایک بہت بڑا خطرہ یہاں کے مقامی مجبر تھے۔ ہر گھوں سرچ کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے مخصوص کردہ آفسر کو روزانہ گھوں کے ارد گرد ہونے والے واقعات اور وہاں آمد و رفت رکھنے والے اجنبیوں سے انھیں بچھپائے۔

دہشتیوں کے بھیس میں قربا " تمام سرحدی دہشتوں میں سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی قیام پذیر تھے۔ جو لن دہشتوں میں آنے والے ہر اجنبی پر کڑی نظر اور ہل پل کی خبر رکھتے تھے۔ کسی بھی ایسے شخص پر جو ماضی میں بھی کبھی سنگت میں ملوث رہا تھا، خفیہ پولیس عذاب کی طرح مسلط تھی۔ آئے روز انہیں وطن دشمن سرگرمیوں کے الزام میں پکڑ کر "موت خانوں" میں لے جاتے اور ان پر ایسے ایسے مظالم توڑے جاتے کہ خدا کی پٹہ! بڑے بڑے مسکروں کو حکومت نے

پراکش رائے کوٹ گیا ہوا تھا۔ کارخانہ تو بند تھا لیکن کچھ لڑکے ابھی تک کلم میں مصروف تھے۔ میں نے ان سے معمول کے مطابق نمسکار کئی سنی اور چپ چاپ لوپر جا کر لیٹ رہا۔ خراشوں کی دج سے ہلکے ہلکے بخاری کیفیت طاری تھی۔ کچھ سکون ہوا تو دل بے اختیار پلپسرا کی طرف پلٹا اور وہ میرے ذہن کے کھلے کواڑوں سے سرسراتی میرے من مندر میں کوہ کلف کی پریوں کی طرح اتر گئی۔۔۔۔

”یہ میں ہوں پر کاش پاؤ۔۔۔۔۔! ہیں میں! جو غنیمت ہوں۔ جو زندگی کے ساز پر گلیا جانے والا ابدی گیت ہوں۔ میں محبت کی دو مولا لیزا ہوں جس کی ایک سکرابٹ پر ایک عالم ٹار ہو جائے۔ تم مجھ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا پاؤ گے۔ اس لئے کہ میں تمہارے لئے لکھن ہوں، کہلی پنہ ڈھونڈو گے اور۔۔۔۔۔! پاگل لڑکے میری محبت ایک عالم پر محیط ہے۔ میں نے تمہارے شعور کے گرد اگر دیاوار چھین تن دی ہے۔ میری یادیں تمہاری شریانوں میں کوئیں لے لے کر بیدار ہوتی رہیں گی۔ میں زندہ پیر کی طرح تمہارے اندر سے کبھی نہیں مر پاؤں گی۔۔۔۔!!“

میری آنکھیں بے اختیار ہلک گئیں۔ اپنی بڑلی پر غصہ بھی آیا لیکن ضبط کا یار نہ رہا مجھے
تڑپا دیکھ کر اس کی یادوں نے تھک تھک کر لوریاں دے کر مجھے خند کی دیوی کی آغوش میں لا
پھینکا۔

صبح کا دل دیر گئے میری آنکھ کھلی۔ خراشوں کی دج سے ہلکے ہلکے بخار کی کیفیت طاری تھی لیکن نہانے سے طبیعت بشارت ہو گئی۔ ملازموں کو مختلف ہدایات دے کر میں ”دوستوں“ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ایک ضروری پیغام میرا انتظار تھا۔
 ”فورا“ ہنگامی میٹنگ کے لئے واپس آؤ۔“

محفلہ عظیمین نوعیت کا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے راتوں رات سرحد پار کر کے اپنے ملک میں انہم نوعیت کی ہدایات حاصل کرنا اور اس کے بعد واپس آنا تھا۔ اس پیغام کے ساتھ ہی ایک ”مقامی دوست“ کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ جس کی مدد سے میں نے سرحد پار کرنی تھی۔ اتنی فرصت نہیں تھی کہ میں رائے کوٹ ہی جا سکوں۔ پھر میں نے یہ سوچا کہ بمشکل ایک رات ہی تو مجھے اپنے ملک میں بسر کرنا تھا، اس کے بعد واپس بھارت آنا تھا اور میرے اچانک غائب ہونے اور واپس آنے کے دو لوگ علوی ہو چکے تھے، اس لئے میں نے اس معاملے کو جوں کا توں رہنے دیا اور کارخانے کے ملازمین سے کہہ دیا کہ پرنکاش اگر آئے تو اسے بتادیں کہ میں کل پرسوں تک واپس آ جاؤں گا۔ ایک ”سبا آرڈر“ وصول کرنے دلی جا رہا ہوں۔

کیتوں میں انہوں نے بارودی سرنگیں دبا کولن کے حسن کو گمراہ قتل جیسے کر کے میں
سرون سگم کے گھر تک پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی باپمیں کھل گئیں۔

میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ وہ مجھ سے کوئی چال چلے والا ہے کیونکہ میرے نزدیک تو وہ قتلِ احمق دوست تھا لیکن میرے ان بارے غلط ثابت ہوئے مردانِ عجم بھی بھارتی اہلی جنس کے ہاتھوں بک چکا تھا اور اب ”ہنرِ ایبٹ“ کا رول لوار کر رہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ مجھے اس کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔

”سروں سہل ہمارے لئے ایسے حالات کوئی نئی بات نہیں، اپنے پیچھے میں تو یہی سب کچھ ہوتا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں ذرا باہر جا کر محلات کا جائزہ لے آؤں اور ہیں۔۔۔۔۔“ اس نے کچھ سوچنے کی ایک منگ کرتے ہوئے کہہ: ”آج شاید جرنیل عثم کے ساتھی بار بار رہے ہیں، کچھ مل آیا ہو ہے۔ اگر

آپ منسلب سمجھیں تو میں ان کے ساتھ آپ کو بھی بھیج دوں کیونکہ میں آج کل پولیس کی نظروں میں ہوں اور وہ لوگ میری عمر لانی کرتے رہتے ہیں، کہیں میرے غائب ہونے پر انہیں

شک ہو گیا تو قیامت آ جائے گی۔ کہہ کر اس نے جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھ کر اس کی بات نے مجھے کچھ الجھنے کا شکار کر دیا تھا، لیکن اس کی نیت رنجھے اب بھی شک نہ

ہوا۔ میں نے یہی جتنا کہ وہ یہ سب کچھ حفاظتی اقدامات کے تحت کر رہا ہے۔ پھر مجھے تو اپنے کام سے مطلب تھا اسے اور کسی سے انجام پاتا۔

— یہ علاقہ دراصل میرے ”غنچہ مقام“ کے نزدیک زمین قلعہ دوسری کسی بھی جگہ سے

جاسکتا تھا پھر میں تک پہنچنے کے لئے مجھے جن مراحل سے گزرنا پڑا تھا اس کے بعد اب میں

ان حالات میں جب دوستیں بھی محکوک ہو گئی تھیں۔ میں نے اس طرف کا رخ کیا تھا۔ بس سے اترنے والے قریباً "قوم مسافر مڑ مڑ کر میری طرف استفسار نہ نظروں سے دکھ رہے

تھے میں لون ہی کے رنگ میں رنگ تھا اور کلنی غور کے بعد بھی کوئی یہ اندازہ نہ لگا پایا کہ میں پہلی اجنبی ہوں لیکن اب معاملہ دوسرا آن پڑا تھا۔

”کس جوتے کا؟“

----- بس سے ابھی چند قدم ہی چل پایا تھا کہ میرے قریب سے گزرتے ایک سگ (جس نے اپنی شخصیت چھپانے کی ہلکام کوشش کی تھی) نے مجھ سے دریافت کیا۔

”سرانولی“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”کس کے پاس؟“

”سرون سیمل اپنا رشتہ دار ہے۔“ میں نے سکھوں والے مخصوص لہجے میں کہا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

”بلے سے!“

”بٹالے میں کون سی جگہ؟“

“ما تمی دروازه!”

”اچھا اچھا میسک سینما کے پاس؟“ اس نے داؤ مارا۔

”مہاراج جی پورے مٹالے میں میونک ٹیم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ آپ امرتسر کی پلٹ تو نہیں کر رہے۔“ میں نے اس کے پیلے ہی محلے کا ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ وہ جینیب سما گیا اور

کھانا، مٹی، مٹی، مٹی

”یار برادر منّا“ واصل میرے رشتے دار بھی وہی رہتے تھے۔ مجھے جبکہ کام یاد نہیں آتا۔ اے، نے۔ ہاں، فصول، سامانہ کا تھا کہ کھانا کاکو، بھی رہا، اسی منبر، تھا جسے

روزانہ مٹائے یا گوردا سپور نہ جانا پڑے۔ ہر محل میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک جانا تو ملی۔

محمود تھا کہ کسی سے پوچھنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔ میں اندازے کے مطابق

تھا لیکن اس دور میں میں بھی دو مزید افراد مجھ سے پوچھ کر چکے تھے۔

کروں اور اپنے کسی عمل سے بزدلی کا مظاہرہ نہ کروں۔ کیپٹن کے بعد اس کے ماتحتوں نے بھی وہی عمل دہرایا لیکن میں نے سر جھکا لیا اور ہن کی طرف دیکھنے سے انکار کر دیا۔
”تلا کھولو“ بھارتی کیپٹن نے اپنے ساتھیوں کو غصے سے کھولنے ہوئے حکم دیا۔

ایک سپاہی نے جیب سے چھٹی نکل کر تلا کھول دیا اور وہ سب اندر گھس آئے۔ سب سے پہلے کیپٹن نے میری پسلیوں میں ٹھوکریں مارنا شروع کیں۔ اس کے بعد دوسروں نے بھی اس کی تقلید شروع کر دی۔ پھر اس نے پیچھے ہٹ کر دو سپاہیوں کو اشارہ کیا جنہوں نے راتکوں کے برٹ میرے پیٹہ اور سینے میں مارے۔ اس دوران میں میں نے اپنی پیچوں اور کراہوں کو روکنے کے لئے اپنا نکلا ہونٹ اتنی شدت سے دانتوں میں دبلیا کہ میرے ہونٹ سے خون رسنے لگا تھا۔ ساتھ ہی کسی موڑی کی راتکوں کا برٹ ایسی جگہ لگا جس سے میرا ذہن تاریک ہو گیا اور مجھے کچھ دیر کے لئے غلاموں سے نجات مل گئی۔

دوبارہ مجھے دن چڑھے ہوش آیا۔ اس مرتبہ بٹنے کی ضرورت میں نے محسوس ہی نہیں کی اور چپکا لینا رہا۔ میرے بدن کا رواں روں فریادی ہو رہا تھا لیکن جذبہ ایمانی نے مجھے اتنی تقویت بخم پہنچا دی کہ مجھ میں اتنی برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔
— میری کوٹھڑی کے سامنے ایک سنتری ٹھل رہا تھا جو مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر شاید کسی کو رپورٹ کرنے چلا گیا کیونکہ کوٹھڑی دیر کے بعد ہی میں نے ایک سکھ کرٹل کو اس طرف آتے دیکھا جس کے ساتھ دو مسلح محافظ بھی موجود تھے۔ میری کوٹھڑی کے سامنے آکر وہ رک گیا۔
”ہیلو“ ہوا؟ (کیسے ہو؟) اس نے انگریزی میں چپکتے ہوئے کہا۔

اس طرح وہ اصل میں میری شخصیت کا اندازہ لگاتا چاہتا تھا۔ میں نے ایسا ظاہر کیا جیسے اس کا فقرہ سنا ہی نہیں۔ چند سیکنڈ تک میری طرف غور سے دیکھنے کے بعد اس نے یہی بات پنجابی میں دہرائی۔ جواب میں میں کسی نہ کسی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”پرویز؟“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”کہل کے رہنے والے ہو؟“

”سیالکوٹ“

”اولیاء تو تو اپنا گرائیم ہے۔ اسے میرے پاس لے کر آؤ۔“ اپنے ماتحتوں کو حکم دے کر وہ

چلا گیا۔

کوٹھڑی دیر بعد ہی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور تین سپاہی اندر گھس آئے۔ ”اٹھو“ ان میں

سے ایک حوالدار نے حکم دیا۔

”مجھ سے اٹھا نہیں جاتا۔“ میں نے اسی طرح لپٹے لپٹے جواب دیا۔

دو تین گھنٹیاں دینے کے بعد اس نے میرے گھٹنے پر اس زور سے راتکوں کا برٹ مارا کہ بے اختیار میری ”ہائے“ نکل گئی۔ یوں لگا جیسے گھٹنا ٹوٹ گیا ہو۔ میں شدت درد سے دوہرا ہو گیا۔ ہلتی دلوں نے مجھے ہانڈوں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے، جہاں ایک طرف کمروں کی قطار کے باہر وہی سکھ کرٹل کھڑا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ تیزی سے آگے بڑھا اور غصے کی اینٹنگ کرتے ہوئے اس نے مجھے لائے دلوں کو بے تحاشا گھٹیاں دینی شروع کر دیں۔

سپاہی سم کر ایک طرف ہٹ گئے، میں بدستور گھٹنا پکڑے زمین پر بیٹھا رہا۔
”اٹھو جوں۔“ اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا اور سارے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

میں اس کی چھل سمجھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اس پر ہنس بھی رہا تھا کہ اپنی دانست میں اس نے بڑی چھلاکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں اس کو ہاتھ پکڑا کر کھڑا ہوا اور قریباً ”نگہراتا ہوا اس کے ساتھ ایک کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے میں پہنچ کر کرٹل نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود سامنے رکے میز پر بیٹھ گیا۔

”انہوں نے تو حمیس بھوجن بھی نہیں کھایا ہو گا۔“ اس نے یہاں موجود سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”ہجہ میں آئے ہوئے ہیں، سردار جی جو سلوک جی چاہے کریں۔“ میں نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔

”یار یہ لالے سلے ہوتے ہی ایسے ہیں۔“ اس نے ہندوؤں کو گھٹیاں دیتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میز کے کنارے گئے، ہٹل جن پر انگلی رکھ دی۔ فوراً ایک اردلی اندر آیا۔
”اسے بھوکا پیا سامانا ہے کیا؟“ اس نے سپاہی کو غضب ناک آنکھوں سے دیکھا اور اس کے جواب دینے سے عمل ہی اسے میں سے بٹھ لانے کا حکم دیا۔

”دیکھو میاں! میں جٹ ہوں اور مجھے بھی ہندو سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی تمہیں۔ اب بدھستی سے ہمیں ان لوگوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے تو کیا کریں؟ میں بھی ضلع سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں۔ بڑا وہ ہو گیا تو کیا ہوا؟ آخر ہم ہیں تو ایک ہی اصدیوں سے اکٹھے رہتے آئے ہیں اور پھر تم بھی ہماری طرح دلیر لوگ ہو اور ہمدردوں کی قدر کرتے ہیں۔“ یہ اور اسی قسم کی دوسری

چکنی چڑی ہاتھیں وہ مجھ سے کرتا رہا۔ اس دوران میں ایک سپاہی میں سے چائے اور پوٹیاں لے آیا۔

میرے ساتھ ہی اس نے بھی ایک کپ میں چائے انڈیل لی اور مجھے مجبور کر کے پوٹیاں بھی کھلاتا رہا۔

بشتہ کرنے کے بعد میں کسی حد تک پرسکون ہو گیا تھا۔ اس دوران میں اس یوقوف سکھ کرنل کو بھی جیسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کا جلدو چل گیا ہے۔

”کیا تم بتایا تھا انا؟“ اس نے اچانک سولل وانگ اپنی دانست میں بڑا نفسیاتی حربہ آزمایا تھا اس نے۔

”جی پرویز!“ میں نے اسی پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

”بی۔ اے تو ہو گے؟“ اچانک اس نے پینتر ابد لا۔

”وہ کیا ہوتا ہے سردار جی؟“ میں نے انجیل بننے ہوئے پر چمک۔

”دیکھو میاں تم پرویز ہو یا جلود۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مجھے علم ہوا تھا کہ جاسوس پکڑا ہوا ہے اور مسلمانوں سے اپنی خصوصی محبت کی وجہ سے تمہیں دیکھنے آگیا ہوں۔ میرا کی مشورہ ہے کہ اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ اس طرح میں تمہارے لئے رحم کی گنجائش نکال سکوں گا یا پھر زیادہ سے زیادہ پانچ چھ مہینے جیل کٹنے کے بعد ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔ اگر تم یہ سمجھو کہ یہاں جھوٹ سے کام چل جائے گا تو یہ دہم اپنے دل سے نکال لینے تم خاصے صحت مند اور خوبصورت لوجھن ہو، لیکن ایک ہازد یا ٹانگ سے لپٹا ہونے کے بعد تمہاری کیا حالت ہوگی؟ اس کا اندازہ شاید تم ابھی نہیں لگا سکتے۔ میاں! جن ہے تو جن ہے۔ اگر میرا بس چلتا تو تمہیں یہاں سے بھاگتا لیکن میں بھی نوکری کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ ہاں البتہ تمہاری اتنی مدد ضرور کر سکتا ہوں کہ اگر تم سچ بتا دو تو میں اس امر سے جو تمہاری تحقیق کرے گا کہہ کر معاملہ ختم کروا سکتا ہوں۔ یہاں ایسے ایسے لذت ناک طریقے سے سزاؤں دی جاتی ہیں کہ سن کر رو گئے کھڑے ہو جائیں اور پھر بھی کوئی زبان نہ کھولے تو جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟

میں نے صرف سولہ نظریں اس کے چہرے کی طرف اٹھا دیں۔

”ہارڈ ایریا میں لے جا کر یہ لوگ کتے کی موت مار ڈالتے ہیں اور لاش کو جنگلی جانور کھا

جاتے ہیں۔“ اس نے آگے کی سمت جھکتے ہوئے بڑے ڈراؤنے لہجے میں کہا۔

اس کے بعد اس نے خاموش ہو کر مجھ پر نظریں جمادیں، شاید وہ اپنے کئے ہوئے خفروں کا

رد عمل میرے چہرے پر تلاش کر رہا تھا۔

”سردار جی جو قسم دل چاہے لے لیں۔ میں بد معاشوں کی لولاد ہوں اور تحقیق سے نہیں ڈرتا۔ نہ یہ میرے لئے کوئی نئی چیز ہے جو کچھ آپ لوگ سمجھ رہے ہیں، میں وہ ہرگز ہرگز نہیں۔۔۔۔۔“ میں نے بڑی چٹکی لہجے میں اس سے کہا۔

”تو پھر تم کیا ہو؟“ اس نے بڑے مستغرق انداز میں پوچھا۔

”ہاں صرف اتنی ہے سردار جی کہ میں کل رات کی ”اٹ“ لگنے بلور نمونہ صرف پانچ کلو اٹھون لے کر اس طرف آیا ہوں، سروں سمجھ بے ایمان ہو گیا اور میرے خیال میں اس نے اپنے نمبر بیٹے کے لئے آپ لوگوں کو میرے متعلق غلط اطلاعات دے کر مجھے گرفتار کروا دیا ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے تو اس کے گھر کی تلاشی لے لیں۔“ میں نے وہی لہجہ برقرار رکھا۔

میرے جواب پر سکھ کرنل مسکرانے لگا۔

”جانے دو میاں پھر مجھے گالیاں دو گے کہ سکھ ہو کر بھی مسلمان سے بد روی نہ کی۔ ہاں تو مجھنے کی کوشش کرو۔ اگر اس طرح جھوٹ بولنے سے کام چل سکتا تو میں تمہیں آگے جانے ہی نہ دیتا لیکن سختی بہت زیادہ ہے اور تمہارے ساتھی بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔“ اس نے آخری فقرہ کہہ کر ہوا میں تیر چلایا اور مطمئن ہو کر میری طرف دیکھا۔

”میرے ساتھی کبھی سرحد عبور نہیں کرتے سردار جی۔ میں بھی پہلی مرتبہ آیا اور پھنس گیا، ہم لوگ سرحد پر ہی مل کالین دین کر لیتے ہیں۔“ میرے جواب پر اس نے کھیانے ہو کر میرے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

پھر اچانک وہ میری طرف پلٹا۔

”میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں کیونکہ خولہ خواہ دلچسپی لے کر میں اپنے متعلق ان لوگوں کو شک میں جلا کر نہیں چاہتا۔“ وہ اب بھی پراسید نظر آتا تھا۔

”نی اٹل تو واپس اس کوٹھڑی میں جا رہے ہو۔ کھنڈ پٹیل وہاں موجود ہے۔ اگر میری بات مانو تو اس پر سب کچھ لکھ دو ورنہ تو یہاں تحقیق کا آغاز ٹانگ یا بازو توڑنے کے بعد کیا جاتا ہے۔“ اتنا کہہ کر اس نے کھٹی بجلی۔ دوبارہ وہی سنتری اندر آیا۔ کرنل نے اسے مجھے لے جانے کا اشارہ کیا اور مجھے اپنے ہمراہ لئے وہ اسی کوٹھڑی میں آگیا۔ کمرے کے باہر پندرہ بیس مسلح فوجی

کھڑے تھے لیکن ان کے کھڑے ہونے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ عام معمول کے مطابق کھڑے ہوں۔ خصوصاً میرے لئے نہیں۔۔۔۔۔ میں خاموشی سے سر جھکائے سپاہی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مجھے کوٹھڑی میں دھکیل کر وہاں موجود پھرے دار نے باہر سے تھلا لگا دیا۔ کرنل کے کھنڈ کے

کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ طلق ٹٹک ہوتا جا رہا تھا اور حالت یہ تھی کہ کھڑو بدن میں لمبو نہیں۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ ٹھہر گئے اور مجھے کسی نے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

”نمبر قمری تمہیں آخری موقعہ دیا جا رہا ہے۔“ تب میں نے سوچا اگر وہ حقیقت میں جو اس سے پہلے ہو چکا ہے تو مجھ سے پہلے شہادت پانے والوں کو بھی آخری موقعہ ملا ہو گا اور فائرنگ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے عزم پر ڈٹے رہے۔ ”پھر میں کیوں نہ ان کا راستہ ہی اختیار کروں اور اللہ کے حضور سرخروئی کے ساتھ پیش ہوں۔“ اس خیال نے میرا حوصلہ بڑھایا اور میں نے انہیں بجائے جواب دینے کے دل ہی دل میں کلمہ شہادت کا ورد شروع کر دیا۔

”تیار جوان“ وہی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ رائفلوں کے لوڈ کرنے کا شور ہوا، اچانک کسی نے چلا کر کہا۔

”سناپ“ کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

”اے ابھی آئی۔ جی کے رو بہو پیش کرنا ہے“ اوپر سے حکم آیا ہے۔ ”آنے والے نے کہا۔“ بڑے خوش قسمت ہو کچھ دن اور زندہ رہنے کو مل گئے۔ ”وہی آواز سنائی دی۔

مجھے رائفلوں کے بٹ مارے ہوئے وہ لوگ ٹھہرتے ہوئے ایک جیب تک لے آئے اور جب میری آنکھوں کی پٹی کھلی تو میں ایک پولیس شیشی میں موجود قتلہ

○○○

میں ساری رات پولیس والے مجھ پر تشدد کرتے رہے۔ وہ پولیس کے روایتی حربے قہرؤ ڈگری اپنا رہے تھے لیکن میری طرف سے انہیں وہی کھلی سننے کو مل رہی تھی جو میں پہلے بیان کر چکا تھا۔ قریباً چار گھنٹے تک مغز ماری کرنے کے بعد بالآخر انہوں نے مجھے لوہ مواکر کے حوالات میں پھینک دیا۔ میرا پولیس ریٹائرمنٹ انہوں نے حاصل کر لیا تھا۔

صبح پولیس کے چار سپاہی مجھے لے کر عازم امرتسر ہوئے جہاں پنجاب کے بدنام ترین امرتسر انٹروگیشن سنٹر میں میری تفتیش ہونا قرار پائی۔

پولیس نے مکمل مریانی سے میری آنکھوں پر پٹی نہ باندھی۔ میری چہرہ بھی ابھی تک انشاق سے میرے پاس موجود تھی۔ کسی کی نظر اس طرف نہیں گئی تھی ورنہ انہوں نے تو مجھے میری جوتیوں تک سے محروم کر کے ایک ٹوٹی پھوٹی چپل پہنا دی تھی۔ میرے ساتھ دو رائفل بردار سپاہی تھے لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی بندوقیں لوڈ نہیں رہیں۔

سرحد میں سے قریباً ایک ڈیڑھ میل دور تھی۔ میں نے جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا اور فرار کا منصوبہ بنا لیا۔ انہوں نے ہتھکڑی میرے ایک ہاتھ میں پسنادی۔ قتلے سے کچھ فاصلے پر کھیتوں

کا سلسلہ تھا جس کے بعد دھاتی آبدی لور بھر سرحد۔

ہم لوگ قتلے کے نزدیک اس میدان کی طرف جا رہے تھے جہاں سے ہمیں امرتسر جانے کے لئے لاری حاصل کرنا تھی۔ یہاں صرف گنتی کے چند لوگ نظر آ رہے تھے۔ ایک سپاہی نے میری ہتھکڑی کا کنڈالا پروای سے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا جیسے ہی موقعہ ملا میں نے پورے زور سے بھٹکا مارا اور ہتھکڑی اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ چند سیکنڈ کے لئے تو وہ سب کچھ کہے رہ گئے، میں دیولند دار کھیتوں کی طرف بھاگ نکلا، ”بھاگو“ پکڑو“ کا شور مچاتے ہوئے پولیس والے میرے تعاقب میں تھے۔

بدقسمتی سے کھیتوں کے نزدیک کچھ ننگ سکھ کھڑے تھے، وہ چونکے ہو گئے اور اپنے روایتی برہمنے ٹکل، میری طرف لپکے۔ وہ میرے اتنے قریب آچکے تھے کہ جھٹکی دے کر ننگے کا موقعہ نہ مل سکا میں نے اپنی دانت میں بڑی لوٹھی چھانک لگائی لیکن ایک ننگ کے برہمنے کی لٹی میرے ٹخنے میں پوسٹ ہو گئی اور میں منہ کے بل نیچے آ رہا۔

وہاں موجود قریباً تمام لوگ پولیس سمیت مجھ پر نوٹ پڑے۔ اتنا مارا کہ دوبارہ مجھے ہوش قتلے میں آکر ہی آیا۔ دو دن تک وہ لوگ زخمی ہونے کے بلوجود اپنا فصد مجھ پر نکالتے رہے۔ تیسرے روز میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر الٹی ہتھکڑی انہوں نے مجھے لگائی اور ایک جیب میں بنھا کر امرتسر کو چل دیئے۔

○○○

انٹروگیشن سنٹر کے باہر جیب ٹھہر گئی۔ میری آنکھوں پر بدستور پٹی بندھی رہی۔ مجھے گھسیٹتے ہوئے وہ لوگ ایک کمرے میں لے گئے۔ یہ کمرہ اصل میں باہر بنا ہوا تھا جہاں طریموں کا اندراج کیا جاتا تھا۔ میرا چارج ان لوگوں نے وہاں موجود گارڈ کو دے دیا اور چند منٹ کے بعد ہی میں نئے قصائیوں کی معیت میں مذبح خانے کی طرف جا رہا تھا۔

مسلل آنکھوں پر پٹی بندھی رہنے کی وجہ سے میری کنپٹیاں دیکھنے لگی تھیں لیکن کسی بھی مرحلے پر میں نے ان سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ وہ اس کی گرفت ڈھیل کر دیں۔ چلنے سے میری ٹانگ کا درد بھی جاگ اٹھا تھا لیکن یہ ایسی باتوں پر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔

میری آنکھوں پر پٹی ایک بڑے ہل کرے میں لے جا کر کھولی گئی۔ پہلے ہل تو یوں لگا جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں لیکن جلد ہی جھٹکی بھل ہو گئی۔ میرے سامنے ایک ایس پی، دو اسپیکٹر لور تین چار سپاہی کھڑے تھے۔ وہ سب مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

”کی علی اے تیرا؟“ سکھ ایس پی نے پوچھا۔

”ابھی نہیں مرتا“ کہہ کر اس نے زوردار ٹھوکر مجھے رسید کی اور چلا گیا۔ وہ قیامت کی رات تھی۔ مسلسل مار کھاتے میرا ایک ایک ٹوٹنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے جسم کی تمام ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے کر دی ہیں۔ رات کو لوہ لوڑھنے کے لئے کبیل دے دیا گیا جسے میں نے فوراً ہی اتار کر ایک طرف پھینک دیا: اس میں سے عجیب و غریب کیزے برآمد ہو کر میرے جسم میں سویں سی جھبھنے لگے تھے۔

وہ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی کیونکہ رات کو عام طور سے تفتیش کی جاتی تھی اور سامنے بنی پارک کے اوپر خاص طور سے ”تفتیشی سیل“ بنائے گئے تھے۔ ساری رات مار کھا کر فریاد کرنے والوں کی آہیں اور کراہیں میرے ذہن پر ہتھوڑے برساتی رہیں اور طلوع فجر کے قریب ابھی آنکھ گلی ہی تھی کہ کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے پر ٹکٹے والی ضربت نے مجھے جگا دیا۔

○○○

تمام طرہوں کو ان کی کوٹھڑیوں کے سامنے جمع کیا جا رہا تھا۔ معلوم ہوا ہشت ملنے والا ہے۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ ہشت کیا ہو گا؟ کہ ہشت دینے والے بھی نظر آ گئے جنہیں دیکھتے ہی تمام طرہن سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح زمین پر اندھے لیٹ گئے۔ مجھے بھی ان کی دیکھا دیکھی وہی پوزیشن اختیار کرنا پڑی۔

اس کے ساتھ ہی ”ہائے ہائے“ کی آوازیں بلند ہونے لگیں کیونکہ تمام طرہوں کو جو یہاں زیر تفتیش تھے صبح ہوتے ہی پانچ پانچ ”لڑ“ مارے جاتے تھے۔ یہ لڑ کوئی معمولی قسم کے نہیں ہوتے تھے بلکہ یوں لگتے کہ جڑے کی دو تھوں کے اندر لوہے کی ایک پتھر رکھی ہوتی تھی جسے لڑ کا ہم دیا جاتا تھا۔

”ہشت“ سے فارغ ہو کر ہمیں رفع حاجت کے لئے لے جایا گیا۔ جس کا طریقہ اتنا بے ہودہ تھا کہ ظلم لکھنے سے قاصر ہے۔ واپسی پر ہمیں ایک جوہڑ کے کنارے پہنچا دیا گیا جس کے کنارے پر ایک بڑا سادرخت تھا جس پر بیٹھے پرندوں کی گندگی درخت کے پتے اور مٹی وغیرہ سب کچھ اس میں گرا ہوا تھا اور جوہڑ نما تلاب کا پانی گدلا ہو رہا تھا۔ یہاں جانوروں کی طرح لوہے منہ جھک کر صرف کلی کرنے اور ہاتھ دھونے کی اجازت تھی۔ تلاب کے پانی پر جھگے ہوئے جب میں نے وہاں نظر آنے والی شکلیں دیکھیں تو وحشت سی ہونے لگی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں انسانوں میں نہیں بلکہ کسی چیز یا گھر کی مخلوق کے ساتھ موجود ہوں۔ مسلسل لذتیں برداشت کرتے کرتے وہ لوگ پاگوں جیسی حرکتیں کرنے لگتے تھے۔

خوف کے مارے ان کے رنگ پیلے ہو رہے تھے۔ ہر کسی کے چہرے پر ہوائیں اڑ رہی تھیں۔ جسم کے بل بے تحاشہ جڑے ہوئے، پیلے پکیلے جسم پر خون آلود اور پھٹے ہوئے جھٹروں کے ساتھ وہ لوگ جانوروں کی بھی کوئی بدترین نسل دکھائی دیتے تھے۔ اگر کسی عام طرہ کو صرف ایک مرتبہ ”ہشت“ اور ”لٹن“ مل جائے تو اس کی مہل نہیں کہ وہ کوئی ہت میل سے چھپا کر لے جائے۔

امر ترانٹرو گیشن سنٹر سارے بھارت میں اپنی سفاکی اور درندگی کے لئے مشہور ہے۔ کسی زیر تفتیش طرہ کا مرعہ یا یہاں معمول کی کارروائی کبھی جاتی ہے۔ اخبارات میں اس سنٹر سے متعلق ایسی ایسی اندوہناک تفصیلات شائع ہوتیں کہ انسانیت خون کے آنسو روتی تھی۔ تمام اضلاع کے پتے ہوئے بدنام اور سفاک قسم کے تفتیشی افسران یہاں لائے جاتے اور وہ انسان نما درندے لذت دینے کے ایسے ایسے طریقے ابھلا کرتے کہ جن کے ذکر ہی سے روٹنے کھڑے ہو جاتیں۔ جن سپاہیوں کی ڈیوٹی گرفتار شدہ گھن کو ”لٹن“ دینے کی ہوتی انہیں ”سٹیشل ڈائنٹ“ دی جاتی تھی اور خصوصی حکم کے ذریعے کھانے کے ساتھ شراب بھی پلائی جاتی تھی، مہلا ان کے دل میں مار کھانے والوں کی آہ زاری رحم کا شائبہ پیدا کر دے۔

مجھے معلوم تھا تو یہاں کے متعلق پہلے ہی سے حاصل تھیں لیکن اس مخصوص جگہ کو دیکھنے کا اتفاق پہلی مرتبہ ہوا تھا اور اسے شنید سے کچھ زیادہ ہی بدتر پایا۔

○○○

ہمیں واپس کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا اور ایک مرتبہ پھر پہلے کی طرح کھانا دیا گیا۔ ابھی میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ گارڈ آن پہنچی۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر وہ لوگ مجھے ایک ”مقویت خانے“ میں لے آئے جہاں پتھر کی ایک کرسی پڑی تھی۔ جس پر دونوں ہاتھوں کو جکڑنے کے لئے قلعے موجود تھے۔

اس طرح ایک لمبی پتھر کی میز پر ایذا رسانی کے مختلف آلات رکھے تھے۔ ایک کونے میں نیپ ریکارڈ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کرسی پر ایک سکھ اسپیکر بیٹھا تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں لاشی بردار سپاہی کھڑے تھے جن کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ پہلی نظر میں یہ کمرہ اس طرح کا نظر آیا جیسا میں نے اکثر فلموں میں گناہوں کے تفتیشی مراکز میں دیکھا تھا۔ میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور مجھے اندر داخل کر گارڈ والوں نے دروازہ بند کر دیا۔ میں دھکا لگنے سے گرا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں موجود تمام درندے اس اثنا میں مجھے گھورتے رہے۔

”کیا ہم ہے تمہارا“ سکھ اسپیکر نے بڑی درشتی سے پوچھا۔

”پرور!“ میں نے اکثر لمبے میں جواب دیا کیونکہ مجھے اپنے ذہن میں تیار شدہ پلان کے مطابق کام کرنا تھا۔

”تجے افسروں سے ہلت کرنے کی تیز نہیں۔“ کتے ہوئے ایک سپاہی نے میری ہنڈلیوں پر لاشی ماری۔ اس کے ساتھ ہی چاروں درندے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ جب انہوں نے جی بھر کے اپنے ارہن نکل لئے تو وہ سکھ انپکڑ جو اس اثنا میں اس سارے تماشے سے بظاہر لافعل بیٹھا رہا تھا اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور زوردار گھونرہ میرے پیٹ میں مارا۔ میں سامنے دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ میں زمین پر گردوں اس نے دوبارہ مجھے بالوں سے پکڑا اور جوڑد کے ماہروں کی طرح اس قدر زوردار لات میرے پیٹ میں رسید کی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا پیٹ پھٹ جائے گا۔ اذیت کی ایک لہر میری آنکھوں میں دوڑ گئی، میں نے چیخا چلا لیکن چیخ نہ سکا۔ اسی سکھ انپکڑ نے مجھے دھکا دے کر پتھر کی اس کرسی پر گرا دیا اور بجلی کی طرح دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ کرسی کے پایوں سے منسلک قینچوں میں کس دیئے۔ یہی عمل انہوں نے میری ٹانگوں کے ساتھ دہرایا۔ میرے منہ سے بخشل کراہیں نکل رہی تھیں۔ درد کی نیس اٹھیں تو کلیجہ کٹنے لگا۔

سپاہی پرے ہٹ گئے اور سکھ انپکڑ نے کرسی میرے سامنے رکھ لی۔

”کھل کے رہنے والے ہو؟“ اس نے اپنا خونخوار جڑا کھولا۔

”سیالکوٹ کا۔“ میں نے کراچے ہوئے کہا۔

”کیا کرنے آیا تھا؟“

”اٹ لگنے آیا تھا سرون نے۔۔۔۔۔۔“

میرا جواب نامکمل ہی تھا کہ وہ وحشیوں کی طرح اٹھ کر میرے گلوں پر حملے مارنے لگا۔ میرا سارا منہ خون سے بھر گیا اور تے ہونے لگی۔ حملے مارتے مارتے جب وہ ہانپنے لگا تو میرے سامنے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”سچ بچا کیا کرنے آیا تھا؟“ اس نے دوبارہ وہی سولہ دہرایا اور اس مرتبہ اس کے جواب میں ’میں نے جو کچھ کیا وہ ان لوگوں کے لئے تو بالکل غیر متوقع تھا ہی‘ میرے لئے بھی حیران کن تھا۔۔۔۔۔۔ میرے اندر پکے والا نفرت اور غصے کا لاوا جسے میں نے کسی نہ کسی طرح دہلے رکھا تھا پھٹ پڑا اور میں نے پورا زور لگا کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔

میری اس حرکت نے ان پر جنون طاری کر دیا۔ سکھ انپکڑ تو پھٹی پھٹی خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا جب کہ دوسرے سپاہی پاگل کتوں کی طرح مجھ پر ہل پڑے۔ وہ میرے سینے

اور منہ پر کئے مارنے لگے۔ میں بھی دیوانہ دار بن کر تھوکنے لگا۔ چند ہی سیکنڈ کے بعد ہی میری گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

○○○

اس مرتبہ ہوش میں آیا تو میں کسی دوسرے کمرے میں لونڈی منہ لینا ہوا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑی کے ساتھ پشت پر بندھے تھے۔ ایک پہرے دار باہر موجود تھا۔ مجھے ہوش میں آنے دیکھ کر وہ چلا گیا ’ٹالہا‘ کسی کو رپورٹ کرنے گیا تھا۔ توڑی دیر بعد ایک کمرہء محل کا ڈاکٹر گارڈ کے ساتھ کمرے میں آدھکا۔ اس نے مجھے ٹھونک بجا کر معائنہ کیا اور ایک انجکشن میرے بازو میں لگا کر دفع ہو گیا۔

کمرے کی سلاخوں سے باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میرے ہونٹ جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور کپڑوں پر چنبچا خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ پونوں پر اتنی سوجن آچکی تھی کہ مجھے آنکھیں کھولے رکھنے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی کچھ اور لوگ اندر گھر آئے۔ انہوں نے میرے ہاتھ کھول دیئے اور ان میں سے ایک نے مجھے پانی کا گلاس بھی پینے کو دیا۔ میرے پیٹ میں درد کی تیز لہر اسٹھ رہی تھی۔ پانی پینے کو دل تو چاہتا تھا لیکن بخشل گھونٹ گھونٹ کر کے میں نے آدھا گلاس اندر اٹھایا۔ ابھی تک انہوں نے مجھے مارنا شروع نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں میری حالت پر رحم آ رہا تھا بلکہ ان کی دانست میں میرے مرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور اگر میں مرجاتا تو وہ تختہ مشق کے بناتے؟

اس مرتبہ ایک پلیٹ میں انہوں نے مجھے سبزی اور پھلکے کھانے کو لا دیئے۔ کھانا ان کے میس کا بنا ہوا لگتا تھا لیکن میں انتہائی کوشش کے باوجود آدھے پھلکے سے زیادہ چھلکانہ کھا پایا۔ وہ سب مجھ پر نظریں جمائے کھڑے اس ہلت کا جائزہ لے رہے تھے کہ کہیں میں ایکٹنگ تو نہیں کر رہا؟

پہلی کچی روٹی وہ داپس اٹھا کر لے گئے اور قریباً دو گھنٹے تک کسی نے مجھے کچھ نہ کہا۔ اس دوران میں اپنے جسم سے اٹھنے والی اذیت ناک درد کی لہروں سے بچتا چھڑانے کے لئے تصور ہی تصور میں کھل سے کھل پہنچ گیا۔۔۔۔۔۔ میرے سامنے مختلف چہرے سوال بن کر آتے اور کوئی جواب نہ پا کر داپس لوٹ جلتے۔ ’مل‘ ’بپ‘ ’بن‘ ’اٹھا دھن‘ ’دہل‘ کے لوگ، اپنے سکول کالج کا زمانہ اور پونم!!

میں جلتے کھل سے کھل پہنچ گیا اور جب دروازہ کھلنے کی آواز مجھے حقیقت کی دنیا میں داپس لائی تو اپنے گلوں پر نمی کا احساس ہوا۔ بے اختیار میرے ہاتھ گلوں کا جائزہ لینے لگے جہاں

○○○

— میرا مقیم ساتھی جس نے اگلے ہی روز سروں سمٹھ سے میرا حساب چکا دیا تھا۔ سروں کی موت نے جیسے میرے سینے پر رکھی چتر کی سل ہٹا دی تھی۔ میرا حوصلہ دوچند ہو گیا۔ جب میں کمرہ عدالت سے باہر نکلا تو ایک جھوم میرا نظارہ کرنے کے لئے وہیں موجود تھا۔

انہوں نے فوراً میرے ہاتھ پاؤں اسی طرح باندھ دیئے۔ میز پر لوہے کی پتلی پنسل نما

ے میرا حوصلہ بڑھایا۔

قرباً پندرہ بیس دن تک تو مجھے یہ علم ہی نہ ہوا کہ میں کہا ہوں؟ ہر وقت ذہن پر سوچیں سوار تھیں۔ میرے بیرونی زخم تو بھرے گئے تھے۔ ہاتھ پر پٹی ہونے لگی تھی لیکن اندر کا کھٹو کھٹا

○○○

ہوتا جا رہا تھا۔ جب کبھی پونم کی یاد آتی، میں کٹ کر رہ جاتا۔!

پھر آہستہ آہستہ میں نے تقدیر سے سمجھوتہ کر لیا۔ پونم کی جدائی ایسا حادثہ تو نہیں تھا لیکن لاشعوری طور پر شاید میں شروع ہی سے خود کو اس وقت کے لئے تیار کرتا آیا تھا۔ اسی لئے یہ المیہ میں نے کسی حد تک برداشت کر لیا۔

پندرہ بیس روز بعد جب میں پولیس گارڈ کے ساتھ تاریخ پر جا رہا تھا تو میری حیثیت کسی خاص خزم کی نہیں تھی۔ میں پاکستانی ضرور تھا لیکن مجھ سے بھی گارڈ والوں نے وہی رویہ اپنایا جو انہوں نے ہائی حوالاتیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ ان لوگوں کو اپنا کردیدہ بدلنے کے لئے میں نے اپنی جی داری کے ایسے ایسے اہلے گھڑائے تھے کہ وہ مش مش کرائے۔

ہمیں اعلیٰ پیمبری میں بخار دیا گیا۔ جہاں حوالاتیوں کے گرد ہن کے لئے والوں کا ہنگامہ لگ گیا تھا۔ اسی جہوم میں مجھے پرکاش کا کھویا کھویا چہرہ نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے وہ سن ہو کر رہ گیا۔ میں نے بھی گردن جھکا لی۔ اس کے علاوہ میں کری کیا سکتا تھا۔

پرکاش آہستہ آہستہ میرے قریب آ گیا۔ اس کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ جس ذہنی لذت سے وہ اس وقت دوچار تھا، اس کے آثار اس کے چہرے سے ہو رہے تھے۔ میرے قریب آ کر اس نے بشکل ”ہمیا“ کہہ اس کا گھارندہ گید۔

”خدا کے لئے ضبط کرو پرکاش ورنہ.....“ میں بمشکل اس سے یہی کہہ پایا۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ہن سے آنسو ٹپک پڑنے کو بہتر تھے۔ خود میری حالت بھی بیان سے باہر تھی لیکن میں جانتا تھا اگر ہمارے کسی عمل سے آپس کی آشنائی ثابت ہو گئی تو دنیا کی کوئی طاقت کم از کم پرکاش اور اس کے گھرانے کو ایذا یاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے نہیں بچا سکے گی۔

گارڈ کے تمام ملازمین حوالاتیوں کے وارثوں سے مل پلنی اینٹنے میں الجھے ہوئے تھے اور حوالاتی اپنے وارثوں میں! ہماری طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ میں نے چند نظروں میں پرکاش کو تیار کیا کہ میں واقعی پاکستانی سمسگر ہوں۔ ہمارا انٹرنیشنل گروہ ہے اور میں بھارت میں ان کی آڑ میں کام کر رہا تھا لیکن میرے کسی عمل سے کبھی ان پر آج نہیں آئے گی۔ آخر میں، میں نے اس

کیونکہ بھارتی پولیس ان دنوں کسی پاکھی شخص کو بھی گرفتار کر لیتی تو اسے بھی پاکستانی جاسوس ہی مشہور کیا جاتا جب کہ میرے متعلق تو اخبارات نے نہ جانے کیا کیا اہلے تراشے تھے۔

نظارا کرنے والے اسی جہوم میں ہمارے کارخانے کا ایک ملازم بھی شامل تھا۔ شاید اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظرس مجھ سے ملیں، مجھ پر گویا بجلی سی گر گئی۔ میں نے اپنی تمام تر قوت ارادی کے ساتھ خود کو ٹارٹل رکھا اور اسے یہ شک نہ ہونے دیا کہ میں ”پرکاش“ ہوں۔

ہوا تو یوں ہی لیکن اس نے اگلے روز جب وہ کلم پر گیا تو۔۔۔۔۔ پرکاش سے میرا تذکرہ کر دیا۔

میں چونکہ اتنا لمبا کبھی غائب نہیں ہوا تھا۔ پرکاش نے جب پاکستانی جاسوس کا نام سنا ہو گا تو یقیناً بے چارے کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو گی لیکن اس نے لڑکے کو ذرا شک نہ ہونے دیا اور یہی ظاہر کیا کہ میں کہیں باہر گیا ہوں اور خود انکو ازری کرنے گور داسپور آ گیا جہاں کڑی سے کڑی ملا تا پلا خر وہ مجھ تک پہنچ گیا۔

گور داسپور جیل تک مجھے تھانے والے ہی پھوڑ آئے تھے۔ انہوں نے ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی Pak Spy کا نمونہ لگایا۔ ایک دفعہ تو میرا خون کھول اٹھا وہ کبھت ابھی تک مجھے جاسوس بدلنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس نعرے کے ساتھ ہی وہاں موجود قریباً سبھی لوگوں نے گردن گھما گھما کر ایک نظر مجھ پر ڈالی اور ایک ڈپٹی جیلر نے اپنی زیر نگرانی میری تلاش لے کر مجھے اندر ”سیاست خانے“ میں دھکیل دیا۔ یہ جیل کا وہ اعلیٰ تھا جہاں عموماً غیر ملکی قیدیوں کو رکھا جاتا ہے اور کچھ پاکستانی یہاں پہلے سے موجود تھے۔

جیل کا ماحول یکسر مختلف تھا۔ یہاں کم از کم مجھے اس نفرت کا سامنا نہ کرنا پڑا جو تھانے اور تعقیبی مراکز میں میرے لئے پائی جاتی تھی۔ میں نے یہاں بھی اپنا تعارف بطور سمسگر کروایا اور ”سمسگر“ کو یہ لوگ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جب کہ جاسوس ان کے لئے گلی کی حیثیت رکھتا ہے۔

جیل کے ”چکر“ میں لے جا کر جو ایک طرح سے ہر جیل کا آپریشن ہیڈ کوارٹر ہوتا ہے، میرے پاؤں میں لوہے کی بیڑی پٹائی دی گئی۔ یہ پہلا تھا جو ہر نئے آنے والے پاکستانی کو پیش کیا جاتا اور اس وقت تک یہ پاؤں سے نہ اترتی جب تک اسے رہائی نصیب نہ ہوتی یا پھر وہ مرنے جاتا۔

مجھے جیل میں بند سکھ لڑموں نے پہننے کے لئے کپڑے دیے اور چائے سے میری تواضع کر

سے التجا کی کہ وہ گھر میں کسی کو میری اصلیت نہ بتائے۔ یہ مجھ پر اس کا بہت بڑا احسان ہو گا۔ وہ دیوانوں کی طرح فکر فکر میرے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میری بات سن کر چپ چاپ اٹھ شاید آنسو بہانے گیا تھا، بے چارے نے وہیں موجود کنٹینن سے میرے لئے چائے اور سمو سے بھجوائے۔ یہ وہیں معمول کی کارروائی تھی۔ اس لئے کسی کے اس طرف دھیان کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

چائے ختم ہوتے ہی مجھے تاریخ کے لئے آواز پڑی۔ جب میں کمرہ عدالت میں داخل ہو رہا تھا تو پرکاش نے بڑی پھرتی سے میری مٹھی میں سوسو کے دو نوٹ تھما دیئے۔ اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ میں نے انہیں چھپانے میں کیا۔ عدالتی کارروائی سے فارغ ہو کر جب پولیس گارڈ مجھے واپس لئے جا رہی تھی تو پرکاش مجھے ایک کونے میں کھڑا نظر آیا، وہ بچوں کی طرح ہلک رہا تھا۔

آنے جانے والے حراگی سے اس پاگل لڑکے کو دیکھ رہے تھے: ”شاید اس کے کسی عزیز کو بی سزا کا حکم ملا ہے۔“ انہوں نے یہی سوچا ہو گا۔۔۔ خود میری کیا حالت تھی؟ شاید دنیا کی کسی لقت میں اسے بیان کرنے کے لئے الفاظ نہ ڈھونڈ سکوں۔

جیل پہنچ کر جب میں شام کو نماز پڑھنے لگا تو دعا مانگتے ہوئے بے اختیار رو دیا۔۔۔ دل کا سارا آئینوں کے راستے میں نے لٹھ تھلی کے حضور بھا کر بھی التجا کی کہ وہ اس راز کو راز ہی رکھے اور میرے کسی عمل سے ان پر کوئی حرف نہ آنے دے۔

جیل میں ان چیموں کی مدد سے میں نے نئے کپڑے اور یہاں استعمال کی مختلف چیزیں حاصل کیں۔ ”قرباً“ ایک ہفتے کے بعد ایک روز جب ہم لوگ جیل کے اسپتال میں دوائیوں کے بہانے جا رہے تھے تو میں نے ایک حوالاتی کو اپنے لئے کوشش پایا۔ یہ لہہ حیانے کا ایک بد معاش تھا جس نے میرا نام جاننے کے بعد گڑ دینے کے بہانے کلغہ کا ایک ٹکڑا بھی مجھے تھما دیا۔ یہ خط پرکاش کی طرف سے تھا۔ وہ تمام خطرے مول لے کر بھی اپنے ”رشتے“ کی صداقت آزمائے پر قہر مگیا۔

”بھیا!“

میں تمہاری بات پوری نہیں کر پایا مجھے شاکر دے۔ اگر میں پونم کو نہ بتاتا تو وہ مر جاتی۔ وہ اب بھی مر جائے گی۔ مجھ سے گمراہوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ بلی تو سب کچھ برداشت ہو جائے گا لیکن پونم۔۔۔۔۔ نہیں بھیا! میں انسان ہوں تمہاری طرح سنگٹ نہیں۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے لیکن اس وجہ کے ساتھ کہ وہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہیں

مارے گی۔ وہ بہت بھلور لڑکی ہے بھیا! ہماری طرح بزدل نہیں۔ اس نے بڑے حوصلے سے ساری بات سنی اور ایک آنسو تک نہیں بہلایا۔ اسے سکتے بھی نہیں ہوا۔ اب اس نے مجھ سے صرف ایک التجا کی ہے کہ میں ایک مرتبہ اسے آپ کی محل دکھا دوں۔ یہ پاگل لڑکی ہے ایک دم پاگل!

بھیا میں اپنی تمام توانائیاں تمہاری رہائی کے لئے وقف کر دوں گا جو کچھ ممکن ہو کر گزروں گا اور ہاں! اس تاریخ پر تمہاری ایک جھلک دیکھنے پونم بھی میرے ساتھ آئے گی۔ یہ ہے تو ظلم لیکن ہمیں دلایا ہے تو کچھ حق ہمیں بھی دو۔ بھیا! ہم اگلے جنم میں تم سے ضرور ملیں گے، تب تم پونم کا سامنا کیسے کر پاؤ گے؟ میں جانتا ہوں تم قاتل بھی بن سکتے ہو، لیکن تم میں موجود انسانیت کبھی نہیں مر سکتی۔

اب بھی تمہارا پرکاش

پرکاش کا خط پڑھ کر میں رو دیا نہیں۔ میں پاگل بھی نہیں ہوا، میں مسکرا دیا۔ اب تک شاید میں روحانی مددویشی کے عالم میں زیست و فرار کے دور اسے پرکھتا تھا۔ پرکاش کے دکھ کو محسوس کر کے میری روح اس سے موجود میرے آسمانی تعلق کی بنا پر گدگد اٹھی۔ پرکاش کے دکھ نے اسے بالیدگی عطا کی تھی۔ میں تو اب تک لاشوری طور پر اپنی کھوئی ہوئی محبت اور ہمت کو یکجا کرنے ہی میں مصروف تھا۔ وقت کتنے ہی دکھ کسی کی جھولی میں ڈال دے۔ زندگی کی شاہراہ پر چلتے چلتے اگر پرکاش ایسے لوگ موڑ پر مل جائیں تو یہ زندگی کبھی گراں نہیں گزرتی۔

○○○

میں نے وہ خط فوراً ”خلع کر دیا اور اپنے سیل میں اس طرح آکر اپنے بستر پر گرا جیسے کوئی ہزاروں سیل کا لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہانپ ہانپ کر بے بس ہو چکا ہو لیکن یہ کیفیت واقعی تھی، پھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

۔۔۔۔۔ پونم کی محبت نے مجھے جینے کی نئی انگ دی تھی۔ میرے ڈانوں ڈول ذہن کو عمل کی راہ پر گھمزن کیا تھا۔

میں خود کو اس لمحے کے لئے تیار کرنے لگا جب مجھے محبت کی اس دھن کا سامنا کرنا تھا۔۔۔۔۔ اس روز جب مجھے عدالت میں پیش ہونے کے لئے جیل نبردار لینے آیا تو جیسے زمین نے

میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میرے قدم من من کے بوجھل ہو رہے تھے۔ ہار ہار ایک ہی سوچ مجھے پریشان کئے دے رہی تھی۔ میں پونم سے سنا کیسے کر پاؤں؟ اور آخر وہ لمحہ بھی آئی گئی۔

— پرکاش نے جن بوجھ کر ایسا موقع منتخب کیا تھا ہم تاریخ بھگت کرواہیں جا رہے تھے۔ میں بس کے کونے دلی سیٹ پر سر ہار نکلتے بیٹھا تھا۔ جب لوگوں کے جھم میں میری نظر اس وفا کی دیوی پر پڑی۔ سفید ساڑھی میں لبوس وہ پرکاش کا سارا لئے کھڑی تھی۔ مجھ پر نظریں پڑتے ہی اس کی آنکھوں نے پتلیوں نے حرکت کرنا بند کر دی۔ وہ پچی پچی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

”یہی تھا ہرٹ کر جانے کا لمحہ۔۔۔ تب میری توانائیاں، تربیت، چلائی، ہشیاری سب ہی تو مجھے اس کے حضور اکیلا چھوڑ گئیں۔ سارے سبق مجھے یاد تھے لیکن فرار کی راہ لیب نہیں تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دیئے۔ مہلا اس الہسرا کی تصویر دھندلی پڑ جائے۔ میں اسے ذہن کے کسی ایسے گوشے میں محفوظ کر لیتا چاہتا تھا جس سے لاکھ کھپچے کے بعد بھی اسے مٹانے پاؤں۔ ان لمحوں کو میں اپنی شریانوں میں محفوظ کر لیتا چاہتا تھا تاکہ خون کی گردشیں اس سر لپا ایثار و وفا کو میرے اندر ہمیشہ زندہ رکھیں۔

ڈرائیور نے ایکسیلنڈ پر پاؤں رکھا تو محبت کی پارٹی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ مجھے الوداع کہہ رہی تھی۔۔۔ اگلے جنم تک کے لئے! اسے اب بھی وشواس تھا کہ ہم اگلے جنم میں ضرور ملیں گے۔ میری آنکھیں یوں چمکیں جیسے سلون کی برکھا اچانک برسا کرتی ہے۔ آنسوؤں کے یہ تیز دھارے جلنے لگتی آہن پوش چٹانوں کا سینہ چیر کر باہر آئے تھے۔ یہ میری بزدلی نہیں تھی، مجھ میں برداشت کا بڑا حوصلہ تھا۔ بے حوصلہ ہو تا تو وہیں مرجاتا۔۔۔ میں ان آنسوؤں کے لئے خود سے کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔ یہ تو نذرانہ عقیدت تھا جو میری آنکھیں اس شہید وفا کے حضور پیش کر رہی تھیں۔ یہ آنسو تو محبت کی معراج تھے۔ سلت سمندر ان کے آگے بچھ ہیں!!

جب تک بس نے اگا موڑ نہ کٹ لیا، میں گردن موڑے اسے دیکھتا رہا۔ میں بھی رونا چاہتا تھا۔۔۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر دھاڑیں مار مار کر اپنی محبت کا مرقعہ لٹکانا چاہتا تھا لیکن میں کس کے گلے لگتا۔۔۔! کون مجھے غفلت تسلیم دیتے۔ میں کتنا اکیلا تھا، کتنا تنہا تھا میں!

”اپنا دیکھو یاد آگیا ہو گا میاں جی!“ میرا ساتھی جو میرے ساتھ ہی چٹکری سے لیس تھا، میری طرف ہمدردی سے دیکھنے لگا۔ ”برے کام کئے تو یہ دن دیکھنا پڑا۔ اب رونے کیوں ہو، حوصلہ کرو“ کوئی بات نہیں ہمارے بھی اس طرف گرفتار ہیں۔ سب کو آخر اپنے گھروں کو لوٹنا ہے۔“ ہماری

گارد کے ایک گیلیئم جسم کے سپاہی نے مجھے کہا۔

میں خاموشی سے سر جھکائے وہاں موجود دوسرے حوالاتوں کے رعبا کس سخت رہا۔ کوئی مجھ پر ترس کھا رہا تھا، کسی کو مجھ پر غصہ آ رہا تھا، کوئی مجھے تسلیاں دے رہا تھا اور کوئی جنگ کو چلائیں!

جیل واپس پہنچنے تک میں پونم کی بکھری یادیں میستارہا۔ فرار کے امکانات کو میں نے ہمیشہ مد نظر رکھا تھا لیکن یہاں موجود اپنے ہم وطنوں سے اس کی توقع فضول تھی۔ لذتیں برداشت کرتے کرتے یہ لوگ بے بسی کا شکار ہو چکے تھے اور انہوں نے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے جب کہ ان کے خیالات جانے کے لئے میں نے ایک دو مرتبہ ہوا وسط گنگو چھینڑی تو مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر میرے ذہن نے ایک دوسری لائن پر کلام کرنا شروع کیا۔ یہاں ایک قتل کا لازم دلیپ سنگھ بھی ہمارے ساتھ ہی بند تھا اور میرے ساتھ اس کی خاصی دوستی بھی تھی۔ وہ پنجاب کے ایک سرحدی دہشت کار رہنے والا تھا اور سنگت کرنے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔

میں نے یہاں اپنا تعلق سنگروں کے جس گروپ سے ظاہر کیا تھا وہ اتنا بااثر گروپ تھا کہ شاید ہی سرحدی دہشت کار کوئی شخص اس سے ملوث تھا۔ دلیپ سنگھ کی بڑی خواہش تھی کہ اس کا رابطہ بھی اس گروپ سے قائم ہو جائے۔ میں نے اس کی اس نیک خواہش پر کلام کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

دلیپ سنگھ کو چند روز قبل ہی ۲۰ سال قید کی سزا ہوئی تھی اور چند دنوں ہی میں اس کا چھلان دوسری جیل میں جانے والا تھا۔ میں نے دو دن میں ہی اس کا ایمان خراب کر دیا۔ ہمارا منصوبہ کچھ اس طرح طے پایا کہ میں کل ہی عدالت میں سرحد پار کرنے کا اقبال جرم کر کے سزا پاؤں گا اور سزا پاتے ہی پاکستان کو ایک خاص جیل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ دلیپ سنگھ بھی اپنا چھلان اسی جیل میں ڈلوائے گا۔ ہم دونوں کو اکٹھے ہی گارد لے کر جائے گی۔ راستے میں اس کے ساتھیوں کی مدد سے ہم فرار ہو جائیں گے۔ اکٹھے پاکستان پہنچیں گے جہاں سے اس کو ہم کسی دوسرے ملک بھجوا دیں گے اور تین چار سال بعد جب وہ کروڑ پتی بن جائے گا تو بھارت پر لعنت بھیج کر اپنے باقی گھروالوں کو بھی اسی ملک میں بلا کر آہل ہو جائے گا۔

یہ منصوبہ میں نے کچھ اس چلائی سے اس کے ذہن میں ڈالا اور اس کے سامنے مستقبل کا ایسا سنا نقشہ کھینچا کہ دلیپ سنگھ پاگل ہو گیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ جوائ!“ اس نے بلاخر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”دیکھنا کیسے موقع پر پونم نہ دکھا جائے“ میں نے اسے غیرت دلائی۔

”میں سکھ کا بچہ ہوں میاں، کسی لالے کی اولاد نہیں۔“ دلپ سکھ مونچھوں کو تلو دیتا ہوا بولا۔

اگلے روز میری تاریخ تھی، میں نے اقبل جرم کر لیا اور عدالت نے مجھے ڈیڑھ سال قید کی سزا سنائی۔ دلپ سکھ نے اپنی ملاقات پر اپنے ساتھیوں کو احتکام میں لے کر مد پر آٹھ کر لیا اور قربا“ تین چار روز کے بعد ہمارا چلان باجھ جیل کے لئے ڈھل دیا گیا۔ اس اثنا میں دلپ سکھ نے جیل کے ڈاکٹر سے ساز باز کر کے اس کی مٹھی گرم کی اور انسانی ہمدردی کا واسطہ دے کر اسے اس ہلت پر آٹھ کر لیا کہ وہ میرے لئے یہ سفارش کر دے کہ میں ”جھلی بیماری“ کی وجہ سے (جس کا حکار میں سزا کے فوراً بعد ہو گیا تھا) لوہے کی سلاخوں والی بیڑی کے ساتھ سفر نہیں کر سکوں گا۔ مجھے شکل والی بیڑی پستادی جلئے۔ ہم نے اس ہلت کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ میرے بیڑی بدل جائے گی۔ ڈاکٹر کو صرف یہی علم تھا کہ دلپ سکھ نے یہ کام میری ہمدردی حاصل کرنے کے لئے کیا ہے کیونکہ جلد یا بدیر ہم دونوں رہا ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہم مل کر سنگٹ کیا کریں گے۔

لقد تعالیٰ سبب لاسہب ہے جب اس نے کسی کی بگڑی بٹنی ہو تو غیب سے اس کے لئے ایسا سلن پیدا کر دیتا ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس روز صرف ہم دو قیدیوں کا چلان جا رہا تھا اور ہمیں لے جانے والے تھے ایک بوڑھا حوالدار اور دو سپاہی۔ جیل سے باہر نکلے ہی وہ ہمارے ”یار“ بن گئے۔ ایک تو وہیں سے غائب ہو گیا کیونکہ اس نے اس کام کے لئے پہلے ہی سے اپنائی۔ اے۔ ڈی۔ اے اپنے ساتھیوں کو دے دیا تھا۔ اب ایک حوالدار اور ایک سپاہی ہمارے ساتھ رہ گئے۔

○○○

میں نے جیل میں داڑھی اور مونچھیں اس قدر بڑھالی تھیں کہ بگڑی باندھنے پر کوئی بھی مجھے شبہت نہ کر پاتا، چونکہ سفر کے آغاز ہی میں بچاس روپے من کو چائے پانی کے لئے دلپ سکھ نے دے دیئے تھے اس لئے وہ ہم پر نئے جا رہے تھے اور خاصے مہین نظر آتے تھے۔ میں نے دانستہ پرکاش کو اس جہولے سے بے خبر رکھا تھا۔ البتہ اس کی طرف سے ”لق“ ”فوق“ لٹے والے پیسے جو لب قربا“ چار سو روپے ہو چکے تھے میرے پاس محفوظ تھے۔ ہم دونوں نے دھار پوٹل کی بنی بڑی بڑی چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور میں نے بھی دلپ سکھ کی طرح سر پر بگڑی باندھ رکھی تھی، جب تک خود میں کسی سے تعارف نہ کروا تا مجھے بھی بھارتی قیدی ہی سمجھا جاتا۔

سکھوں کی روایتی کمزوری شراب کی بوتل کی شکل میں پولیس والوں کے پاس دلپ سکھ کے رشتہ داروں نے پستادی تھی جو ہمیں جیل کے باہر لٹے آئے تھے۔ گورداسپور سے ہم ایک ٹرین کے ذریعے امرتسر پہنچے، جیل سے رات کو ہم ایک پنجر میں سوار ہو گئے۔ جس کے قوس میں سواریاں نہ ہونے کے برابر تھیں، کھڑکی کے نزدیک ہی ہم نے دو برتھوں پر قبضہ کر لیا۔ شیش سے دلپ سکھ نے پھولی خریدی تھی اور ٹرین چلتے ہی دونوں پولیس والے اور دلپ بوتل پر نوٹ پڑے۔ دلپ سکھ نے خود بمشکل ایک یا دو پیسے دیئے تھے۔ مجھے انہوں نے رستہ دھوت دی لیکن میرے صرف ایک بار ”ہا“ کہنے کو ہی کلنی سمجھ کر پیچھے ہو رہے۔

لدھیانہ کے قریب ٹرین پہنچی تو حوالدار سونے کے لئے لوہہ برتھ پر چلا گیا۔ ہم دونوں ایک ہی جھکڑی میں بندھے ہوئے تھے۔ دوسرے سپاہی کو بھی بار بار لوگ آتے گئی تھی۔ کچھ شراب کانشہ اور کچھ شدید سردی، خند سے لڑنے کی کوشش میں اس کی آنکھیں کبھی بند ہوتی اور کبھی کھلتی تھیں۔ جیسے ہی ہم لدھیانے سے چلے، میں نے دلپ سکھ کو بتا دیا کہ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رضامندی ظاہر کر دی۔

سپاہی نے ہماری جھکڑی کا کڑا اپنی بیٹی سے نکل کر ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ معمولات جی ذرا پیشاب کریں گے!“ دلپ سکھ نے لوگھتے ہوئے سپاہی سے کہہ دیا۔ اس نے لال لال آنکھوں سے ہماری سمت دیکھا اور شراب کے نشے میں لا کڑائی ذہن سے اجازت دے دی۔ ہماری برتھ کی پشت ڈبے میں بنی لیٹرن سے ملی ہوئی تھی۔ خود کو دھادیں بیٹھا رہا۔ ہم دونوں جھکڑی سنبھلنے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ یہاں گاڑی کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ اٹھنے سے پہلے میں جھکڑی سے اپنا ہاتھ نکالتا نہیں بھولا تھا لیٹرن کی طرف جلتے ہوئے ہم نے مڑ کر ایک مرتبہ پھر لوگھتے ہوئے سپاہی اور خند میں خراٹے لیچے ہوئے حوالدار پر نظر ڈالی اور انہیں من کے محل پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ لیٹرن کے نزدیک میں نے ہاتھ جھکڑی سے باہر نکل لیا۔ دلپ سکھ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہاں کے گروٹی!“ اس نے مجھے بے اختیار دلدوی۔

ہم نے دروازہ کھولا اور پاندھن پر پاؤں رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے لدھیانہ میں چلا گئے۔ لیٹرن کی رفتار کم تھی اور خیریت گزری، مجھے تو کوئی چوٹ نہ لگی، میں نے پہلے چھلانگ لگائی تھی۔ اس کے بعد دلپ سکھ کو دل جب تک ٹرین گزر نہیں گئی میں زمین سے چپکا لیتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں بجلی کی سی بھرتی سے اٹھ بھاگنے میرے جسم میں اتنی طاقت کہیں

کے لئے صرف سواریاں اماندے ٹھہرتی ہیں۔۔۔۔۔
 دیسے تو پنجاب، راجستان اور کشمیر کے تمام شیشوں، ہوٹل، لاری، ٹوے، بس، سینڈز، آشرم
 اور سرائیں انڈین سیکورٹی سے بھری رشتی تھیں لیکن خاص طور سے جموں سے گورداسپور، ڈیرہ

○○○

ہلاناٹک اور سرحد کے ساتھ ساتھ امرتسر کے علاقے پرین کی خاص نظر تھی۔
 بسوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں تیزی سے چلا ہوا بازار کے آخری سرے پر پہنچ گیا
 جہاں سے بیس مڑ کر بڑی سڑک پر پہنچتی ہیں اور اب وہیں ایک طرف درخت کی لوٹ میں کھڑا
 تھا تاکہ پنجاب کی طرف جانے والی کسی بھی لاری میں سوار ہو سکوں۔

ایک بس مدھم مدھم روشنی کے ساتھ نمودار ہوئی اور میں خدا کو یاد کر کے اس میں سوار ہو گیا۔
 اندر بیٹھ کر سب سے پہلے میں نے اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ خدا کا شکر کہ تمام کپڑے صحیح سلامت
 تھے ورنہ یہاں پھر کوئی چٹا آن کھڑی ہوتی۔ یہ بس امرتسر کو جا رہی تھی۔ امرتسر وارڈر سے میں
 صرف نقشے کی حد تک واقف تھا۔ خود پار کرنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ
 نہیں تھا کہ چپ چاپ امرتسر کا ٹکٹ خرید لوں۔ اگرچہ راستے میں اور شہر بھی آتے تھے جہاں
 چیننگ کا خطرہ تھا لیکن میں نے اب خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ رات کا سفر تھا
 میں سارے راستے لوٹنے کی ایکٹنگ کرنا لیا۔ لاری بھی پنجاب روڈ ویز کی ایکسپریس چٹپ کوئی چیز
 تھی۔ کیا جہاں جو کسی شہر میں پہنچ منٹ سے زیادہ ٹھہرتی ہو۔ سارے راستے غائبانہ وہ تین یا چار
 جگہ رکی ہوگی، جہاں لاری رکتی میں لوٹتا لوٹتا آگلی سیٹ پر بازو جما کر اس پر اپنا سر رکھ کر سو
 جانے کی ایکٹنگ شروع کر دیتا۔ اس اثناء میں اپنے ساتھ والی سواری کی چھٹی کروانے کے لئے
 میں اس سے پہنچ چڑھ کر ابھی چکا تھا۔ وہ بھی بڑی ڈھیٹ ہڈی کا مطوم ہوتا تھا، وہیں جما بیٹھا
 رہا۔

رات گئے ہم لوگ امرتسر پہنچ گئے۔

میں جلد از جلد شہر کی حدود سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔

۔۔۔۔۔ وہ رات میں نے امرتسر کے ایک لواتی کھیت میں چھپے چھپے کٹ دی۔ اس سے پہلے میں دو
 راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ سردی سے بچنے کے لئے بار بار جسم کو حرکت دینی پڑتی تھی۔ نیند بار بار مجھ پر
 حملہ کرتی رہی لیکن مجھے علم تھا ”اگر آج سو یا تو شاید پھر کبھی جاگ نہ سکوں گا۔“

اب مجھے فوراً فیصلہ کرنا تھا کہ ہارڈر کس جگہ سے پار کیا جائے؟ امرتسر، ڈیرہ ہلاناٹک، کلاوڑ
 یہ تین نام میرے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ بالآخر ذہن نے فیصلہ ڈیرہ ہلاناٹک کے حق میں دیا۔

سے موڈ کر آئی تھی۔ ریلوے لائن کے قریب دو پتھر میں نے اٹھائے اور ایک دوسرے کے اوپر
 بھڑی کے کڑے بار بار رکھ کر ضربیں لگائیں۔ ”رٹ“ ٹوٹی اور میں آزلو ہو گیا۔ اس عمل میں
 بمشکل ایک منٹ صرف ہوا تھا۔ میری نظریں ابھی تک دور جاتی گاڑی کی روشنیوں پر جمی ہوئی
 تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی دیکھ اچھے اچھے ابھی تک اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تھا۔

جب بھاگ کر اس کے نزدیک گیا تو میرا دل ڈوب گیا۔ میرے حسن سے اندازے کی لٹلی
 ہو گئی تھی اور وہ بجلے دور کرنے کے پتھروں کے اوپر ڈھیر ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا
 اور وہ بے ہوش پڑا تھا۔ ”دیکھ دیکھ“ دیکھ دیکھ۔

میں نے اسے قریب ”جھنجھوڑ ڈھلا لیکن وہ بدستور خاموش رہا۔ میری نظریں ابھی تک گاڑی کی
 تینوں پر جمی تھیں۔ جب کہ اس کی دھڑکنیں سنیں، وہ زندہ تھا لیکن چوٹ خاصی زیادہ لگی تھی
 اور ابھی میں اسی شش و پنج میں جلا تھا کہ کیا کروں، کیا نہ کروں کہ مجھے گاڑی کی روشنیوں ٹھہرتی
 نظر آئیں۔

شاید ہمارے فرار کی اطلاع ہو گئی تھی اور پونیس والوں نے زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لی
 تھی۔ اب سوائے بھاگنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے الوداعی نظر اپنے حسن پر ڈالی، اسے
 بڑے دکھ دل سے خدا حافظ کہا اور پوانے دار ایک ست میں بھاگنے لگا۔

۔۔۔۔۔ بھاگتے بھاگتے اپنے لگتا تو رک کر سانس لے لیا۔ مسلسل مشقت سے نجلے کون سے
 زخم ہرے ہو گئے تھے کہ دودھ پھر دکھتا ہوا پھوڑا بن گیا۔ ٹانگ کی تکلیف دوبارہ موڈ کر آئی لیکن
 لہجوں کی پرواہ کسے تھی۔۔۔۔۔ آزلو کے خوبصورت تصور کے سامنے یہ سختیاں، یہ دکھ سب
 بچ تھیں۔

مجھ پر بھاگنے کا جنون سوار تھا۔۔۔۔۔

صبح تک میں بھاگتا اور چلتا رہا۔ اس دور میں گرفتاری کا خوف برابر مجھ پر مسلط رہا۔ مجھے علم
 تھا کہ پولیس بوکھلائے ہوئے کتوں کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہوگی لیکن میں نے بھی اب دل میں
 تیر کر لیا تھا کہ کبھی زندہ بن دیشیوں کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔

صبح کے قریب جس جگہ میں پہنچا، یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہاں میں پہلے بھی آچکا
 ہوں۔۔۔۔۔ میں نے راتوں رات میں میل سے زیادہ سفر طے کر لیا تھا اور قریب ”شام“ ڈھلے میں
 دنیا بھر پہنچ چکا تھا۔

○○○

دنیا بھر کا لاری اڈہ معمولی سا ہے۔ پنجاب سے کشمیر کو آنے جانے والی بیس میں چند منٹ

میری آنکھوں کے سامنے بوڑھا لور سرد آسمان اپنے دامن میں ہزاروں ستاروں کے ساتھ
 ٹھہرنا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سامنے شکر گڑھ پر بھی یہی آسمان نچھنے نے جگنوؤں کے
 ساتھ سایہ فگن ہے اور وہاں سے کچھ دور اک شہر بے مثل میں میرے ماں باپ، بہن بھائی
 آرام سے رضائیں اور لطف کوڑھے امین کی فیندہ سو رہے ہیں۔۔۔ اس بات سے قلب بے

”ٹھیک ہے جلدی جلدی نکل جاوے گی۔“ اس نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا اور میں اس کو ست سہری اٹکل کہہ کر اپنی منزل کی طرف چل دیا جہاں ابھی اور مہینتیں میری منتظر تھیں۔

خبر کہ ان سے کچھ فاصلے پر میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہوں۔

--- میں نے چاروں طرف نگاہیں ڈالی تھیں۔ میرے پاؤں مجھے تھے اور میں پنڈلیوں تک جھنجھ سے بھرا ہوا تھا لیکن مجھے سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شدید سردی کے باوجود میرے ہاتھ پر پینے کے قطرے ابھر آئے تھے اور مجھے اپنے وجود میں خون کی جگہ انگارے دوڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ رات اپنے سینے میں ہزاروں وحشیہ سینے رینگ رینگ کر سورج دیو کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اپنے اوسلن محل کرنے کے لئے دل ہی دل میں ایک مرتبہ بھر میں نے آیت الکرسی پڑھی اور بڑی احتیاط سے چلا ہوا کھیتوں سے باہر نکل آیا۔ اب ایک خلی قلعہ زمین جو غالباً پندرہ بیس گز لمبا تھا مجھے رینگ کر ملے کرنا تھا۔ اس کے بعد سرکنڈوں کا وہ سلسلہ تھا جس سے گزر کر مجھے آگے کیپٹ کی طرف بڑھنا تھا۔ تمام ایریا آری نے کھل کیوں لالچ کر رکھا تھا۔ کسی بھی وقت کسی بھی لمحے میرا پاؤں یا جسم کا کوئی اور حصہ کسی بھی بارودی سرنگ کو چھو سکتا تھا۔ پھر ایک دھماکہ اور جسم کے پرچے اڑ جاتے۔

--- میں رینگتے ہوا سرکنڈوں کی طرف جا رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ قیامت ڈھا دینے والا تھا اور اب میں اس مقام پر آیا تھا جہاں سے واپس لوٹنا بھی موت تھا اور اس سے آگے بڑھنا بھی موت۔ میرے چاروں طرف موت اپنی تمام تر وحشیوں کے ساتھ رقص کر رہی تھی لیکن میں زندگی کے لئے اس سے چوکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اس امید کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے انشاء اللہ اپنے مقدس وطن کی زمین پر پہنچ جاؤں گا یا پھر مرجاؤں گا۔ کیونکہ زندہ ان بھیڑیوں کے ہاتھ آنا سبک سبک کر مرنے والی بات ہوتی۔

دل کی تیز تیز دھڑکنوں کے ساتھ اب میں مورچوں کے عین نیچے پہنچ چکا تھا۔ نیم دائرے میں بنے ہوئے یہ مورچے مجھ سے دس بارہ فٹ کی اونچائی پر واقع تھے جن کے نیچے سرکنڈوں کی ایک قطاری پھیلتی چلی گئی تھی۔ میں اب مورچوں سے گزر کر نیلے میں داخل ہو گیا جہاں مجھے امید تھی کہ اب خطرہ نہیں کیا ہے۔

اچانک میرے پیچھے دھماکہ ہوا اور سارا ماحول ہلکا ہو گیا۔--- قریب ہی چپے ہوئے کسی فوجی نے جو وہاں پوزیشن لئے بیٹھا تھا مجھے دیکھ لیا تھا اور اس نے روشنی راڈ فائر کر دیا تھا۔

”ہٹ!“ کسی کی زوردار آواز گونجی اور میں نے بڑی بھرتی سے سامنے بڑی بڑی لمبی جنگلی گھاس (نیلے) میں چھلانگ لگا دی۔ پھر میں کر کے بل جھک کر تیزی سے بھاگنے لگا۔ گولیوں کی سرخ لکیریں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ میرے کانوں کے دونوں اطراف شائیں شائیں کی

آوازیں گونج رہی تھیں لیکن میں جنونیوں کی طرح اسی پوزیشن میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔ میری پنڈلیوں سے خون رستا شروع ہو گیا اور دل کا یہ عالم تھا کہ جیسے سینہ پھاڑ کر باہر آن کرے گا۔ سردی گرمی کا احساس مرچکا تھا۔ بس ذہن میں ایک ہی آواز مسلسل گونج رہی تھی۔ ”دوڑو“ ”دوڑو“۔۔۔ تیز اور تیز۔“

--- ان تمام باتوں کے باوجود میرا ذہن مکمل طور پر بیدار تھا۔ مجھے علم تھا اگر مجھ سے ذرا بھی سست کا غلط اندازہ ہو گیا تو وہ مجھے گھیر کر مار ڈالیں گے۔ اب میں بریوں پر پہنچ چکا تھا جو ہارڈ کی حد ہوتی ہے۔۔۔ چھلانگ لگائی اور پاکستانی دھرتی میں سما گیا۔ میرے پیچھے فلائنگ ابھی تک جاری تھی۔

اچانک ”ہٹ!“ کی آواز گونجی اور میں رک گیا جیسے یہ سب کچھ کھلی لاکوٹی عمل ہو۔ ”وینڈز اپ!“ دوبارہ لٹکار گونجی۔ میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ میرے سامنے میرے رنجرز کھڑے تھے۔

میری سرحدوں کے نگہبان۔۔۔!

انہوں نے یوں تو میرے اطوار سے ہی مجھے جان لیا تھا۔ ہر مل وہ میرے اپنے تھے لیکن ضابطے کی کارروائی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

”کون ہے؟“ ایک جوان نے کرفت لمبے میں پوچھا۔

جواب میں میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور یہی میری پہچان تھی۔ ان کے راتھل ہوا ہاتھ نیچے دیک گئے۔

ہم لوگ پوسٹ پر چلے آئے۔ فن سب کی نظروں میں ایک ہی سوال کی پرچائیں بلکورے لے رہی تھیں۔ میری جسمانی حالت نے انھیں اس بات کا یقین تو دلایا تھا کہ میں نے اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کی۔ وہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں رہے تھے۔ اپنی جگہ ہر کوئی سمجھا بھی تھا— کور بجو تا بھی۔ جس طرح میرے ذہن میں سوالات کا لدا اکھول رہا تھا اسی طرح فن کی نظر میں میری طرف اسی لبید میں افٹی تھی کہ شاید میں انھیں بتا سکوں۔

”جب ہم سب نے اپنے تئیں کوئی کوتاہی نہیں کی تو آخر ہم لٹ کیسے گئے ہمیں درہمان سے توڑ کر کس نے مفلوج کر دیا۔؟ کس کی نظر ہماری بھٹیوں کو کھا گئی۔۔۔؟“ لیکن میں انہیں کیا بتاؤں میرے پاس کہنے کو قہا ہی کیلہ میں تو خود لوں سے سنا چاہتا تھا، جانا چاہتا تھا کہ ہماری ریا منوں کا شرم کیا ہی تھا؟ کیا اسی روز بد کو دیکھنے کے لئے ہم نے اپنے آپ کو تباہ کا تھا؟

ہم سب کلر کلر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خاموشی سے، بے بسی سے۔۔۔ بحر میں کی طرح جیسے ہمیں نے گہات لگا کر اپنا شکار کھلیا ہو۔

ایک جوان جلدی سے میرے لئے چائے بنا کر لے آیا۔ کسی نے سگریٹ کی ڈبیا میری طرف بوجھا دی۔ نجانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے سگریٹ سلا لیا۔ اپنے وطن کے کڑے کیلے دھوئیں کا بھی اپنا ایک سرور ہوتا ہے۔ میں سگریٹ نوش نہیں تھا لیکن اس روز میں نے ایک عجیب سا کیف محسوس کیا۔

دھوئیں کے مرغولے بن بن کر ٹوٹے ٹوٹے اور ٹوٹ ٹوٹ کر بنے۔ میری نظروں کے سامنے پھیلتی دھوئیں کی لکیریں مجھے اپنے سب سے گھر کے آگن میں جا پہنچیں جہاں میری ماں تھی، ہاپ تھا، بہن بھائی تھے اور بہت سے محبت کرنے والے۔۔۔ وہ سب آنکھوں میں امید کی جوت جگمگے ہوئی پر لرزتی دعائیں لئے جانے کب سے میری "آمد مند نہ واہی" کے منتظر تھے لیکن میں ان کا سامنا کر بھی پاؤں گا؟ کیا بیویں گامی اسیں؟ میرے پاس ملنے کو تھا ہی کیا۔ بس یونہی کہانی لیکن اس کے سننے کا وقت کس کے پاس ہو گا اور ملنے کا بار اکرم میں ہو گا۔

پھر مہر بلا لور پونم آہنی چٹن بن کر میرے سامنے تن گنڈ ”دعا باز۔۔۔ تم میں امت ہے تو میری یادوں سے فرار پا کر دکھو۔ مجھے زندگی کے ترک میں جھونکا ہے تو کیا ضمیر کے جنم سے بچ لکھو گے۔۔۔ نہیں ہرگز نہیں۔“ اس کی پرچائیں نبلنے مجھ سے کیا کچھ کتنی رہیں لور میں سر موڑے اس کی یادوں کے حضور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتا رہا۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوا اگر میرے کھوں سے پھسلے آنسو قیص کے دامن پر نہ آگرتے۔

”حوصلہ کر شیرا“ کسٹ تو کٹ گیا۔ یہ تو شیرا اپنا ملک ہے۔ بچ خوشیں منڈ تو نے نیا جنم پایا ہے، نیا جنم! ایک بوڑھے حوالدار نے جس کی چڑھی موٹھیں اس کے جون ارادوں کی غماز تھیں میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے حوصلہ دیا۔

”چاہا یہ خوشی کے آنسو ہیں۔“ میں اسے چاہتے ہوئے بھی نہ کہہ سکا کہ یہ بچہ تھو تو مجھے عمر بھر دلانے لگ۔

○○○

گھر والوں کو میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ دروازے پر میرا بوڑھا پپ چہرے پر جھروں کا جلی سہائے میرا شکر قہل پپ سے گلے مل کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک لمبے کو سارے دکھ اس کی آغوش میں کھو گئے ہوں۔ گھر کی دہلیز سے گلی برگد کی کھنڈی چھلانی میری مل ایک کونے میں بٹلے کی دوسری عورتوں کے درمیان فخر سے سر بلند کئے بیٹھی تھی۔

میں سے لپٹ کر میں نوزائیدہ بچوں کی طرح ہلک اٹھل میری ساری توتلائیں کھو گئیں۔ منڈ کے بندھن کچے دھاگوں کی طرح فٹ گئے۔

”بیٹا! رونا کس بہت کد تو نے ہمارا من بڑھایا ہے۔ تو نے میری دھاروں کی شرم رکھی ہے بیٹا! تو میرا لور بن کر لوٹا ہے۔“ میں مل کے فراخ سینے سے لپٹا رونا رہا۔ وہ میری چیخ پر دست شفقت رکھے مجھے تشنیل دیتی رہی۔

دہلی ہاری ہاری سب نے مجھے گلے لگایا۔ کوئی رو رہا قہل کسی نے میری مل کی طرح آنسوؤں کا گلہ گھونٹ دیا قہل کسی کی سسکیں میری طرح اندر ہی اندر دم توڑ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا شاید میرے دکھ کو سمجھ رہے تھے۔ میرے اپنے تھے!:

پھر سب کو میرے جسم کی فکر دامن گیر ہوئی۔ دسکی نضوں اور ولایتی دوائیوں کے انبار لگ گئے۔ ایک سے ایک بڑھ کر ڈاکٹر، ایک سے ایک بڑھ کر حکیم میرا علاج کرنے لگے۔ میرے اندر کا کرب باہر کے روگ سے کس زیادہ تھا لیکن وہ لینز جو میرے اندر دہنی درد کا ایکسرے دکھائے کسی کی آنکھوں میں کھل؟ ایک مل تھی جس کے دودھ نے میرے روگ کو کسی حد تک جانتا۔

”بیٹا تو جب میل نہیں تھا تو ہم تیری یادوں کے سارے جیتے تھے۔ جب کبھی تیری یاد تڑپاتی تو تین ہزاروں ملاؤں کے لال یاد آ جاتے جو تیری طرح وہیں اسیر تھے اور دل سے دعا نکلتی: مولانا! سب کی ملاؤں کے کیچے کھنڈے کر دے۔ اب تو آیا ہے تو اپنا جسم لے کر۔ بیٹا! اپنی روح کو واپس بلا لے ورنہ وہ سارے لوگ جو ہم نے اندر ہی اندر مار لئے تھے کسی روز زندہ پیر کی طرح بیدار ہو جائیں گے تب پھر شاید۔۔۔“ میں نے مل کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا لور زندہ لوگوں کی طرح جینے کا عہد کر کے اس کے سامنے سے اٹھ آیا۔

اپنے لوگ اپنی دھرتی اپنی فضا میں جب اپنے اندر رہیں تو جلنے کیوں کسی نے چپکے سے میرے کھوں میں کما تم تو بھارت سے ناکام واپس آئے ہو لیکن جو بھارتی ایجنٹ یہاں کام کر رہے تھے وہ ضرور سرخرو ہو گئے ہیں۔ دیکھ لو! ہم نے خود کو ہندو کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ ہماری سوجوں پر ان کا نضاز ہر (جوئی وی اور وی سی آر کی شکل میں وہ آہستہ آہستہ پھیلا رہے ہیں) غالب آتا جا رہا ہے۔ ہم نے سوچنا شروع کر دیا ہے کہ ہم ’بھلی‘، ’چھٹن‘، ’بلوچی‘ لور سندھی ہیں۔ ہمیں لیڈر بنانے لگے ہیں کہ کس نے کس کا حق کھلیا؟ لیکن ہم نے کسی لیڈر سے یہ نہیں پوچھا کہ کس نے کس کا حق منک لیا کیا؟

تب دل سے ایک ہی دعا نکلتی:

”اٹھی! اس خطے کو اپنی امن میں رکھ دے کہیں تاریخ خود کو نہ دہرا دے کہ ہم نے اس سے ابھی تک کوئی سبق نہیں سیکھا۔“

○○○

رائے کوٹ، پونم، پرکاش، ماتا، موسیٰ، سدرشتا، پاجوئی، سالگ رام اور دوسرے کچھ بچے رہ گیا ہے۔ اب میں ہوں، انکی جلتی بجھتی یادیں اس دنیا میں جو ناممکن ہو وہ ممکن ہو جاتا ہے لور جو بالکل ممکن ہو وہ کبھی نہیں ہو پاتا یہ ازل سے ہوتا آیا ہے اور اب تک ہوتا رہے گا البتہ یہ ہے کہ دنیا اتنی خوبصورت نہیں جتنا اسے ہونا چاہیے قہل سوچنے سے چاہنے سے لور بسا لوقات کوشش کرنے سے بھی وہ کچھ نہیں مل پاتا جس کی ہم ترنا کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قدرت کی گھڑیاں قرون پر محیط ہیں اور ہم فوری ڈیوری کے متقی۔ دعائیں بے اثر تو کبھی نہیں ہوتیں البتہ مہر کی سر کے بغیر کوئی کیس اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش نہیں ہوتا لور اتنے لمبے انتظار کی تب ہم میں نہیں۔ ہم تو ہر ایکشن کا فوری ری ایکشن چاہتے ہیں جب کہ قانون قدرت یہ نہیں، میل تو لینے کے لئے بھی صابر بننا پڑتا ہے۔ پونم کو کھو کر میں مرا تو نہیں لیکن۔۔۔

من کا برہا یونی تو شانت نہیں ہو جاتا پونم کی محبت آہیں بیل کی طرح میری زندگی کے

درخت سے چٹی ہوئی ہے۔ میں خود کوچ کر اس کا خرچ لوار کر رہا ہوں۔ یہ اندر کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل بڑا لذت ناک ہوتا ہے۔ اس درد لادہ کا توڑ کوئی نہیں جانتا۔ زندگی کا ہر ابھار درخت اندر ہی اندر کھوکھلا بھی ہوتا رہتا ہے اور اس کی شاخوں کی ہریالی بھی قائم رہتی ہے۔ اس روگ کا علاج جب کوئی مدارش نہیں کر پاتا تو میں کیسے کر پاؤں گہ محبت کا وہ زہر جو میں نے پونم کی شریالوں میں گھولا تھا، اس کی تخی و ترقی کا ذائقہ میں بھی اسی طور سے چکھ رہا ہوں۔

ایک مرتبہ پونم نے اپنے ساتھ میرا ہاتھ بھی زبردستی جو تکی کو دکھایا تھا جس نے کہا تھا ”جیسے آئندہ مل گیا، کتنی بھی مل جائے گی۔“

لیکن ——— کتنی دلائے والا نجات دہندہ کبھی نہ آیا۔ پونم کی محبت تو دلیلوں میں گونجنے والی سندریلوں کی بازگشت بن کر کھراتی اور پھر وہیں لوٹ آتی ہے۔ عشق کی وہ جہنم جو کسی پتی پر بوجھ نہیں بنتی، میرے سینے پر پتھر کی بھاری سل کی طرح آن پڑی ہے۔ میں کئی مرتبہ اس کیفیت سے فرار کا ارادہ کرتا ہوں لیکن محبت کی یہ پختل میری گردن میں اس طرح کسی ہوئی ہے کہ اپنی گردن موڑنے کے لئے بھی مجھے کتب تقدیر کے اشارے پر لبیک کہنا پڑتی ہے۔

خود کو جاننے کے لئے انسان کو بڑی لمبی تپسیا کرنی پڑتی ہے۔ بڑے چلے کھٹے ہوتے ہیں لیکن پونم کی محبت نے مجھے بہت جلد عرفانِ ذلت کا شعور دے دیا۔ اس کا یہ احسان بڑا درد ناک ہے۔ جب میں خود سے غافل رہا، کوئی دکھ میرے قریب نہ پھٹکا اور جب اپنا گین پالیا تو اندر سے کھٹنے لگے کرب کی گھڑیاں پھٹنے کے لئے انسان جھوٹے ڈھکوسلے بھی تراش لیتا ہے۔ میں جانتا ہوں پونم اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق اگلے جنم تک میرا انتظار کرے گی۔ شاید اسی جھوٹی امید پر وہ اپنا یہ جنم جتا دے۔

لیکن میں ——— میں تو بالکل حسی دامن ہوں۔ مجھے جھوٹی امید ہاندھنے کے لئے کوئی منطوق بھی تو نہیں ملتی۔ کوئی جھوٹا سارا، کوئی سنہری ڈھکوسلا! زندگی کے صحرائے اعظم کی جھلمتی ریت پر میں آبلہ پا بھاگتا چلا جا رہا ہوں کیونکہ اس صحرا کو مجھے بہر حال پانا ہے لیکن یہ زخمی زخمی پاؤں، یہ لوہو امیدیں مجھے کب تک بھگائیں گی! کہیں تک میرے تن ہلاؤں کا ساتھ دیں گی۔ کیا ”نجات“ کا لہجہ کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن نہیں!!

تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ زندگی کے دکھ اتنے گھمبیر نہیں ہوتے کہ وہ بھلائے ہی نہ جا سکیں بلکہ اس کی خوشیوں ایسی پر اسرار ہوتی ہیں کہ وہ ڈھونڈنے سے ہاتھ نہ آئیں پھر جینا کوئی ایسا مختصر سا عمل بھی نہیں کہ آدمی اپنی ذلت کے ظلم کا امیر ہو کر رہ جائے۔ صرف محبت ہی تو سب کچھ نہیں، زندگی کے تقاضے کچھ اور بھی ہیں اور ان کڑوی کسلی چائیں کو اس لئے بھی

لگتا پڑتا ہے کہ زہر بھی کبھی کبھی کار تریاتی کرتا ہے۔ عملی زندگی کا بچ کتھوں کے سچ سے ذرا مختلف ہوتا ہے اور میں نے اس حقیقت کو بھی جان لیا ہے کہ زندگی عذاب نہیں فرض ہے۔ میں اپنے طور سے کوشش کرتا ہوں کہ احسن طریق پر اس فرض سے عمدہ برا ہوتا رہوں۔

کبھی کبھی جب پچھلی راتوں کا چاند دریاؤں کے سینے میں اترتا ہے تو دکھ کے دھپک راگ خود بخود اندر سے پھونکنے ہیں لیکن میں جتنا نہیں یوں کہ پونم کی محبت کی مہمہ ہلاکتی بن کر میرے من آگن میں اترتی ہے اور میں اس کرب میں بھی لذت کا ایک پہلو تلاش کر لیتا ہوں۔ محبت کا یہ احسان ہی کیا کم ہے کہ اس نے مجھے مر مر کے جینے کا شعور بخشا۔